READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

ناول

واقفِ حال

READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

نعمان اسحاق

معاشرے میں ہمارے اپنے اردگرد گھومتی ناقابلِ فراموش کہانی

واقفِ حال

نعمان اسحاق

علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔فون: 37247414

بار اشاعت ——— اول
مطبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— زبیر کمپوزنگ، لاہور
قیمت ——— 300 روپے
قیمت بیرون ملک ——— 6 پونڈ
10 ڈالر

ملنے کے پتے

خزینہ علم وادب الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور	**اشرف بک ایجنسی** اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی	**رشید نیوز ایجنسی** فریئر مارکیٹ، فریئر روڈ۔ کراچی
شمع بک ایجنسی نزد مسجد مقدس، اردو بازار کراچی	**دعا بک کارنر** امین پور بازار، فیصل آباد	**علم وعرفان پبلشرز** الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
ویلکم بک پورٹ مین اردو بازار، کراچی	**دعا پبلشرز** الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور	**کلاسک بکس** اندرون بوہڑ گیٹ، ملتان
شمع بک ایجنسی نزد مسجد مقدس، اردو بازار کراچی	**Azhar Enterprises** 315, Dickenson Road, Longsight Manchester, M13 ONR (U.K)	**مکتبہ عمران ڈائجسٹ** مین اردو بازار، کراچی
مشتاق بک کارنر الکریم مارکیٹ اردو بازار۔ لاہور	**علی بک سٹال** نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور	**فرید پبلشرز** مین اردو بازار، کراچی

انتساب:

اپنے دوستوں کے نام!

جو بچھڑ گئے، جو ہیں اور جو مستقبل میں بنیں گے۔

نعمان اسحاق

پیش لفظ

ایک لکھاری کے لیے اس کی تحریریں کس قدر اہمیت کی حامل ہوتی ہیں، لفظوں میں اس کا بیان ممکن نہیں۔ مجھے بھی اپنی تحریریں بہت عزیز ہیں۔ آج سے چند سال پہلے جب میں نے لکھنے کی نیت سے قلم تھاما تھا تو مجھے خود پر اعتماد نہ تھا کہ لکھ پاؤں گا کہ نہیں لیکن آج مجھے خود پر اعتماد ہے اور بے حد ہے۔

جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تب میری یہ سوچ تھی کہ اصلاحی تحریریں لکھ کر معاشرہ ہی بدل دوں گا۔ لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے ذہن نے بالیدگی کا سفر طے کیا مجھے اندازہ ہوا کہ معاشرہ بدلنا اتنا آسان بھی نہیں۔

بہرحال میں نے یہ تحریر خلوصِ نیت سے لکھی ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ تحریر آپ کے ذوقِ مطالعہ سیراب کرنے میں اپنا کردار ضرور ادا کرے گی۔

خیر اندیش

نعمان اسحاق

آسے اپنے فردا کی فکر تھی وہ جو میرا واقفِ حال تھا

اس کی بہن مشین سے کپڑے نکالنے گئی تھی اور جتنی دیر سے وہ غسل خانے کے اندر تھی اتنی دیر میں تو بندہ سارے کپڑے ہاتھ پر دھو لے۔ اس نے کتنی ہی آوازیں بہن کو دے ڈالیں لیکن جواب ندارد۔

اس کے چہرے پر شکنیں ابھرنے لگی تھیں۔ آخری بار اس نے حلق کے بل چیخ کر اسے پکارا تھا لیکن کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا۔ اس کی ماں کے چہرے پر بھی خوفناک قسم کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

''کمینی! کیا مرگئی ہے اندر، سن کیوں نہیں رہی چل اِدھر آ.... کیا کپڑوں سے چپک گئی ہے۔'' ماں نے اونچی آواز سے چیختے انداز میں کہا تھا۔

اندر سے نہ تو کسی قسم کی آہٹ کی آواز آئی تھی اور نہ ہی اس کی بہن کی آواز ابھری تھی۔ باہر ماں کے ساتھ بیٹھی لڑکی نے کوفت سے چھری کو توریوں سے بھری اس ٹوکری میں رکھا تھا جس میں وہ توریاں کاٹ رہی تھی۔

''دیکھتی ہوں جا کر، پتا نہیں کیا ہوا ہے، جواب ہی نہیں دے رہی۔'' اس کے انداز میں کوفت ہی کوفت تھی۔

''نکمی اولاد ہی میری قسمت میں لکھی ہوئی تھی۔'' ماں منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی۔

غسل خانے تک جاتے ہوئے اس کی کوفت میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ اندر جا کر وہ پاکیزہ پر چلانے ہی والی تھی کہ اس نے دیکھا پاکیزہ نیچے غسل خانے کے فرش پر گری پڑی ہے۔ اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔

''پاکیزہ!'' اس کے منہ سے نکلا اور وہ بہت تیزی سے گری ہوئی پاکیزہ پر جھکی تھی۔ پاکیزہ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

''گیلے کپڑوں سے تو مجھے سخت نفرت ہے، اور کپڑے دھوتے ہوئے اپنے کپڑے گیلے

نہ ہوں، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے مجھے تمام کاموں میں ناپسندیدہ کام کپڑے دھونا ہی لگتا ہے۔‘‘ اس کے کانوں میں پاکیزہ کے کئی بار کے کہے ہوئے الفاظ گونجے تھے۔

پیلی کاٹن کا سوٹ، جو پاکیزہ نے زیب تن کیا ہوا تھا۔ کافی حد تک گیلا تھا۔

’’پاکیزہ...... پاکیزہ......‘‘ اس نے پاکیزہ کو جھنجھوڑا تھا لیکن پاکیزہ کے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی۔

پہلے اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ پھر اس کے منہ سے گھٹی گھٹی آواز میں ایک بار پھر بہن کا نام نکلا تھا۔

’’پاکیزہ‘‘ ساتھ میں اس نے بہن کو ایک بار پھر جھنجھوڑا تھا۔

’’پاکیزہ!‘‘ اب کے بار وہ حلق کے بل چیخی تھی، ویسے ہی حلق کے بل جیسے برآمدے میں بیٹھ کر توریاں کاٹتے ہوئے چیخی تھی لیکن احساسات دونوں بار مختلف تھے۔

اس کی چیخ سن کر ماں کو انہونی کا احساس ہوا تھا۔ وہ بھی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے غسل خانے تک آئی تھی۔ غسل خانے میں جا کر ماں نے دیکھا کہ پاکیزہ گری پڑی ہے اور اس نے پاکیزہ کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا ہے۔

’’کیا ہوا؟‘‘ ماں بڑی تیزی سے قریب آئی تھی اور نیچے بڑی تیزی سے بیٹھ گئی۔ نیچے بیٹھتے ہوئے اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ اس طرح تیزی سے بیٹھتے ہوئے اس کے گھٹنوں میں پھر سے درد اٹھ جائے گا جو پندرہ دن دوائی کھانے اور مکمل آرام کے بعد آہستہ آہستہ ختم ہونا شروع ہوا تھا۔

’’امی دیکھیں نا، پاکیزہ کو کیا ہوا ہے، بول ہی نہیں رہی۔‘‘ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ ساتھ میں پاکیزہ کو جھنجھوڑا بھی تھا۔

ماں نے پاکیزہ کو ہلایا تھا دوسرے لمحے وہ پاؤں کے بل کی بجائے چوکڑی مار کر بیٹھنے لگی تھی کہ کرنٹ لگنے سے وہ بڑے زور سے اچھلی تھی۔ فوراً اس نے نیچے دیکھا تو مشین کی آدھی تار ننگی پڑی تھی۔ جس کا ایک سرا پلگ میں لگا ہوا تھا۔

تار کا وہ سرا جس کے اوپر انسولیٹر کی کوٹنگ تھی، وہاں سے پکڑ کر ماں نے تار کو کھینچا تھا۔ تار پلگ سے نکل گئی تھی اور وہ روتے ہوئے بیٹی کو جھنجھوڑنے لگی تھی۔

پاکیزہ کرنٹ لگنے سے مرگئی تھی۔ اتنی بات تو ان کی سمجھ میں آجانی چاہیے تھی لیکن وہ اس وقت انجان تھے یا انجان بن کر حقیقت سے نظریں چرا رہے تھے۔ اس بات کا ادراک مشکل تھا۔

فیصل کو اس ہوٹل پر کام کرتے ہوئے ابھی پانچواں ہفتہ ہی تھا کہ ہوٹل کے سامنے والے اسٹور کے مالک سے فیصل کا سامنا ہو گیا۔ یہ سامنا اسٹور کے مالک کی مرضی سے دانستہ طور پر ہوا تھا۔ اس نے فیصل سے اس کی تنخواہ پوچھی تھی۔

فیصل بچہ تھا گیارہ سال کا ہوئے اسے چند دن ہی ہوئے تھے۔ اتنی سمجھ بوجھ نہ تھی۔ اس نے بلا جھجک ساری تفصیل بتا دی۔ فیصل ہفتہ وار تنخواہ لیتا تھا اور ڈیوٹی کا دورانیہ چھ گھنٹے ہوتا۔ سٹور کے مالک نے فیصل کو پیش کش کی کہ وہ روزانہ چھ گھنٹے اس کے پاس کام کرے۔ ہاں البتہ وہ تنخواہ اس ہوٹل والے سے کچھ زیادہ دے گا۔

پیسہ تو ویسے بھی فیصل کی ضرورت تھا۔ وہ خوش ہو گیا۔ کام کی نوعیت جانے بغیر اس نے ہامی بھر لی۔ اس نے سٹور کے مالک سے کہہ دیا کہ وہ اگلے ہفتہ سے اس کے پاس کام کرے گا اور پھر اس نے ساری تفصیل جا کر پُرجوش انداز کے ساتھ ہوٹل کے مالک کو بتا دی۔ ہوٹل کے مالک کے ماتھے پر بل آگئے۔

ہوٹل کا مالک اچھی شکل اور بھدے جسم کا مالک تھا۔ اس کا پیٹ باقی جسم سے کم از کم ایک فٹ آگے بڑھا ہوا تھا۔ ہوٹل پر کام کرتے ہوئے وہ شلوار کے ساتھ آدھے بازوؤں والی شرٹ پہنتا تھا۔ یہ ہوٹل شہر کے مزدور علاقے میں تھا۔ جہاں آس پاس کئی چھوٹی صنعتیں تھیں۔ مزدوروں اور ملازموں کو اس ہوٹل کے ریٹس سوٹ کرتے تھے اس لیے یہاں پر کافی رش ہوتا تھا۔

صبح دس بجے سے شام چار بجے تک یہ ہوٹل کھلا رہتا۔ ہوٹل کے مالک کا کاروبار اچھا خاصا چلتا تھا۔ فیصل کے کام سے وہ ایک ہفتے میں کافی متاثر ہوا تھا۔ اپنے وجود سے زیادہ بھاری آواز تھی فیصل کی اور جب وہ اپنی بھاری آواز میں کہتا ’دال لاؤ جی‘ تو نہ صرف کانوں کو ایک اچھا تاثر ملتا بلکہ کچھ گاہک تو مسکرا دیتے اور یہ بات ہوٹل کے مالک کے لیے فائدہ مند تھی۔

فیصل کی بات سن کر ہوٹل کے مالک کا دل تو کیا کہ ایک بڑے زور کا چانٹا فیصل کو لگائے۔ لیکن ضبط کرتے ہوئے اس نے فیصل کو ہلکے سے سر پر تھپڑ لگایا۔

’’رے تیرے کو ادھر کیا مسئلہ ہے؟‘‘ مالک کے تیور کچھ ایسے تھے کہ فیصل کا دل ڈر سے دھڑکنے لگا اور وہ مالک کو کوئی جواب بھی نہ دے سکا۔

’’بول دے اب۔‘‘ مالک نے تیز آواز میں کہا تھا۔ فیصل نے مالک کو کوئی جواب نہ دیا۔ بس چپ چاپ دیکھے گیا۔

''ابھی تو خیر دکانداری کا ٹائم ہے، پھر تیرے سے بات کرتا ہوں۔ جا اب اندر روٹیاں لے کر جا۔'' مالک نے کہا تو فیصل چپ چاپ روٹیاں لے کر ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ جہاں لوگ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔

''روٹی کی ضرورت کس کو ہے بھئی؟'' فیصل نے آواز لگائی تھی۔ بے دلی کے ساتھ اپنی مخصوص بھاری آواز میں۔ جس گاہک کو روٹی کی ضرورت تھی اس نے فیصل کو ہاتھ کے اشارے سے اپنی میز کی طرف بلایا تھا۔

فیصل اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ فیصل کا باپ کہیں دور گیا ہوا ہے، ہوش سنبھالنے کے ساتھ ہی اس نے اپنی ماں سے اپنے باپ کے بارے میں یہی سنا تھا۔ ''وہ کہیں دور گیا ہوا ہے۔'' یہ بات وہ اپنی ماں سے کئی بار سن چکا تھا۔

''کس لیے؟'' ہر بار اس کا سوال یہی ہوتا۔ ''کمانے کے لیے'' کبھی ماں کا بیان یہ ہوتا تو کبھی کہتی ''بس ویسے ہی'' بہت اداس لہجے میں۔ فیصل کی یہ الجھن دور ہی نہیں ہوتی تھی۔

پڑھنے لکھنے کا بھی اسے شوق تھا۔ پر وسائل کم تھے۔ پانچویں کے پرچے دیئے ہوئے اسے سات ہفتے ہو چکے تھے۔ وہ آگے پڑھنا چاہتا تھا اور ساتھ ساتھ کمانا بھی چاہتا تھا لیکن کیسے؟؟ اس کا حل ابھی تک اسے نہیں ملا تھا۔

اس کی ماں آس پڑوس کے لوگوں کے کپڑوں کی سلائی کڑھائی کرتی تھی اور اسی سے زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ پہلے نانا نانی بھی اس کے ساتھ رہتے تھے لیکن وقفے وقفے سے دونوں مر گئے۔ فیصل کے ذہن میں صرف نانی کا دھندلا سا عکس تھا۔ نانا تو اس کے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مر گئے تھے۔

فیصل اور اس کی ماں سلائی کڑھائی کے پیسوں سے گھر چلاتے تھے۔ لیکن اب فیصل کمانا چاہتا تھا۔ ماں کا بوجھ بٹانا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے ماں سے بمشکل اجازت لے کر گھر کے قریب ہی ایک ہوٹل میں ملازمت شروع کی تھی۔

سردیوں کے مختصر دن تھے۔ چار بجے وہ اس ہوٹل سے سیدھا گھر جاتا تھا اس کی ماں وہم کی ماری تھی۔ تھوڑا سا ٹائم زیادہ ہو جاتا اور فیصل لیٹ ہو جاتا تو وہ پریشان ہو جاتی۔ ہاں البتہ کبھی وہ وقت سے پہلے گھر پہنچ جاتا تو وہ کوئی خاص ردِعمل نہ دکھاتی۔

ہوٹل کے مالک کے ساتھ ایک آدمی بات کر رہا تھا۔ اس کا پیٹ بھی آگے کو نکلا ہوا تھا لیکن ہوٹل کے مالک سے کافی کم۔ وہ آدمی فیصل کو دیکھتے ہوئے بات کر رہا تھا اور مالک شش و پنج میں محسوس ہو رہا تھا۔ اس آدمی کو فیصل نے کل بھی دیکھا تھا۔ کھانا کھانے آیا تھا۔ فیصل کو

گھور گھور کر دیکھتا رہا تھا۔ فیصل کو بڑا عجیب لگا تھا۔ اس سے پہلے آدمی ہوٹل پر کبھی نہیں آیا تھا۔

''چل تُو بھی کیا یاد کرے گا، عیش کر۔'' فیصل نے ہوٹل کے مالک کے الفاظ سنے تھے۔

اس وقت وہ روٹیوں والا خالی چھابہ لے کر تندور کی طرف آیا تھا۔ روٹیاں لینے کے لیے۔

''فیصل۔'' مالک نے اسے پکارا تھا۔ فیصل نے چھابہ اظہر کو پکڑایا۔ اظہر چالیس پینتالیس سالہ آدمی تھا اور اس ہوٹل کا پرانا ملازم تھا۔

''اس آدمی کو تیرے سے کچھ کام ہے۔ یہ جو چار دکانیں چھوڑ کے تہہ خانے والی دکان ہے نا وہیں پر، مہمان ہیں اشرف صاحب کے، وہی تہہ خانے والی دکان کے مالک، تُو چلا جا ان کے ساتھ۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی جو چھوٹا موٹا کام کہیں کر کے آ جانا۔ تھوڑے بہت پیسے بھی دیں گے تیرے کو، انعام۔ چل شاباش۔''

ہوٹل کے مالک نے اسے پہلے کسی دکان پر ایسے کام کرنے کے لیے نہیں بھیجا تھا۔ فیصل کا جانے کو زیادہ دل نہیں تھا۔ ایک تو ان صاحب کی گھوریوں کی وجہ سے، دوسرا یہ بھی نہیں پتا تھا کہ کیا کام کرنا ہے لیکن کچھ انعام کی لالچ میں اور کچھ ہوٹل کے مالک کے غصے کے ڈر سے کہ کہیں مالک گالیاں بکنا شروع کر دے۔ وہ اس آدمی کے ساتھ ہو لیا۔

''تہہ خانے میں آج مزدور کام کو نہیں آئے۔'' فیصل نے پوچھا۔ تین بجے کے قریب کا وقت تھا اور تہہ خانے میں کام کرنے والے مزدوروں کی چھٹی چار بجے ہوتی تھی۔

''نہیں! اشرف کے ہاں فوتگی ہو گئی ہے اس لیے آج چھٹی ہے۔'' اس آدمی نے کہا تھا۔

''تو پھر میں نے کیا کرنا ہے؟'' فیصل کا دل بڑے زور کا گھبرایا تھا۔ اکیلے ہونے کے احساس سے اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ اس لیے وہ تہہ خانے کی آخری سیڑھی پر رک گیا۔ اس تہہ خانے میں دھاگہ بنتا تھا۔

''آ جا پتر بس تھوڑا سا کام ہے تُو آ تو سہی۔'' اس آدمی نے کہا تھا۔ گھبرائے ہوئے دل کے ساتھ فیصل اس کے ساتھ ہو لیا۔ واپس جانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ آدمی اسے تہہ خانے میں موجود دفتر میں لے گیا اور اندر جا کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد کمرے سے فیصل کی چیخیں سنائی دینا شروع ہو گئی تھیں جو بعد میں گھٹتی چلی گئیں۔ ویسے بھی تہہ خانے کے باہر آواز جانے کے چانسز صفر کے برابر تھے۔ اس آدمی نے فیصل کے ساتھ بدفعلی کی اور آرام سے اس کی جیب میں لال نوٹ ڈالا اور فیصل کو لے کر باہر آیا۔

"تم جاؤ، میں نے تہہ خانہ بند کرنا ہے اشرف کے ہاں فوتگی تھی اس لیے اس نے بھروسہ کر کے مجھے بھیجا ہے کہ تھوڑی دیکھ بھال کرلوں۔" ہچکیاں لیتا ہوا فیصل تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ اس نے قدم گھر کی طرف بڑھائے تھے۔ راستے میں اس کے رونے کی شدت میں اضافہ ہوا تھا۔ اس سے چلنا بھی مشکل تھا۔ اس نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور بغیر دیکھے اس نے نوٹ کے ٹکڑے کیے اور اسے پھینک دیا۔

ویسے فیصل کو قائداعظم سے بہت محبت تھی۔ وہ تو قائداعظم کی تصویر والے نقلی نوٹ بھی نیچے گرے ہوئے برداشت نہیں کرتا تھا۔ انہیں اٹھا لیتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے نقلی نوٹ نالی میں سے اٹھایا تھا۔ قائداعظم کی تصویر کو وہ نالی میں نہیں برداشت کرسکتا تھا لیکن آج تو اس نے قائداعظم کی تصویر والے سو فیصد اصلی نوٹ کے خود ٹکڑے کیے تھے اور ان ٹکڑوں کو راستے میں پھینک دیا تھا۔

❁❁❁

سعد کا دل کب اس پر آیا؟ اس بات کا اندازہ خود سعد کو بھی نہیں تھا۔ ویسے تو وہ بچپن سے پڑوسی تھے۔ تنگ گلی میں ان کے گھر کچھ فاصلے پر تھے۔ گلی میں سال کے چار مہینے پانی بھرا رہتا تھا۔ کبھی گٹر کا گندا پانی تو کبھی بارش کا گدلا پانی۔ گھروں کا گند بھی گلی میں ڈالنے کا رواج تھا۔ سوگندگی کا بھی ایک ڈھیر ہر وقت گلی میں موجود رہتا۔

حور یا پری۔ سعد اس کے لیے صحیح لقب نہیں چن سکتا تھا۔ کبھی وہ سعد کو حور لگتی تو کبھی پری اور کبھی دونوں کی خصوصیات بیک وقت اس میں نظر آتیں۔ (ویسے سعد کو حوروں اور پریوں کی خصوصیات کا پتا نہیں تھا لیکن پھر بھی اس میں حوروں اور پریوں کی خصوصیات نظر آتی تھیں۔)

اس کی جھلک دیکھنا بھی سعد کے لیے مشکل تھا۔ بہانے سے وہ کبھی اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا جب اس کے والد گھر پر نہ ہوتے۔ کبھی وہ باہر آتی تو کبھی اس کی بہن۔

"چاچا عبدالرحمٰن گھر پر ہے؟" وہ آتی یا اس کی بہن۔ وہ سوال ایک ہی پوچھتا تھا۔

"نہیں ابو اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ شام کو آئیے گا۔ ویسے کوئی خاص کام ہو تو بتا دیں۔" جواب اس کو ایک ہی ملتا۔ اس سے بھی اور اس کی بہن پاکیزہ سے بھی۔

لیکن اگر جواب دینے والی وہ ہوتی تو اسے گھنٹیاں بجتی سنائی دیتیں اور اگر جواب دینے والی پاکیزہ ہوتی تو وہ بد دل ہو جاتا۔ اس کو دیکھ کر وہ خوش ہوتا اور پاکیزہ کو جواب دیتے ہوئے وہ بد دل ہوتا۔

اس کے علاوہ اس سے ٹکراؤ کی ایک اور جگہ محلے کی پرچون کی دکان بھی تھی۔ جہاں وہ

کبھی دال لینے، کبھی گھی لینے اور کبھی اس جیسی کوئی اور چیزیں لینے آتی تھی۔

اسے دیکھ کر سعد کا دل بڑے زور سے دھڑکتا تھا۔

سعد اس سے محبت کرتا تھا۔ شدید محبت۔ سعد کا اس کے بغیر دل نہیں لگتا تھا۔

سعد کو اسے سوچنا بھی اچھا لگتا تھا۔ وہ خوابوں خیالوں میں اس سے بات کرتا رہتا تھا۔

اسے غائبانہ طور پر اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔

اس سلسلے میں وہ اپنی ماں سے بات کرنا چاہتا تھا اور چند دنوں سے وہ موقع تلاش نہیں کر پایا تھا کہ ماں سے کس طرح کہے اور کیا کہے؟

لیکن ماں پہلے سے جانتی تھی۔

کیوں کہ وہ سعد کے منہ سے اس کا نام کئی بار سن چکی تھی۔ سعد کو خود بھی نہیں پتا تھا کہ وہ کبھی کبھار سوتے میں اس کا نام لیتا ہے۔

جاگتے میں تو وہ دن میں کئی بار دانستہ اور نادانستہ طور پر اس کا نام لیتا تھا۔

"شمع....."

محض اس کا نام پکارنا بھی سعد کو بے حد بھلا لگتا تھا۔

❁❁❁

اس گھر کا کل رقبہ چار مرلے تھا۔ صحن کے ایک طرف لیٹرین اور غسل خانہ تھے۔ دونوں الگ الگ تھے۔ لیٹرین کا دروازہ گہرے سبز رنگ کا تھا اور غسل خانے کا دروازہ ہلکے سبز رنگ کا تھا۔ دونوں دروازے لکڑی کے تھے۔ غسل خانہ قدرے کھلا اور کشادہ تھا۔ کپڑے دھونے کا انتظام غسل خانے میں ہی تھا۔ غسل خانے کے ایک کونے میں واشنگ مشین تھی۔ اسٹیل والی یہ واشنگ مشین کافی پرانی تھی۔

صحن کے سامنے برآمدہ تھا۔ برآمدے کے سامنے دو گول ستون تھے۔ جو کہ یقیناً چھت کو سہارا دیتے تھے۔

برآمدے کے دائیں طرف باورچی خانہ تھا اور پھر ترتیب میں دو کمرے تھے۔ پہلا کمرہ بڑا تھا۔ اس لیے اسے وہ ہال کمرہ کہتے تھے۔ جبکہ دوسرا کمرہ قدرے چھوٹا تھا۔ دونوں کمروں میں کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہال کمرے کی کھڑکی اندر برآمدے میں کھلتی تھی۔ جبکہ دوسرے کمرے کی کھڑکی باہر گلی میں کھلتی تھی۔ دوسرے کمرے کو گھر کے افراد عموماً 'دوسرا کمرہ' ہی کہہ کر پکارتے تھے۔

کمروں اور برآمدے میں کئی سال پرانی سفیدی اپنی موجودگی اور سال خوردگی کے بارے میں خود ہی بتاتی تھی۔

کمروں کے دروازے اور کھڑکیاں لکڑی سے بنے اور گہرے سبز رنگ کے تھے۔ دروازے اور کھڑکیاں بھی اپنی قدامت کے بارے میں خود ہی بتاتے تھے۔ کھڑکیوں کے آگے لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

کالی لوہے کی سلاخیں۔ ان کے سامنے کھڑے ہو کر شمع کو کبھی کبھی ایسے لگتا جیسے وہ کسی جیل کے دروازے کے سامنے کھڑی ہے۔

شمع اس گھر کی سب سے کام چور فرد تھی۔ کاہل اور سست۔ شمع کو دیکھ کر بس یہی دو الفاظ یاد آتے تھے۔

وہ کاہل اور سست کیوں تھی؟ اس کی بھی بڑی خاص وجہ تھی۔ وہ غربت کو ناپسند کرتی تھی اور غریب ہو کر امیر ہونے کے خواب دیکھتی تھی۔ ایک ایسی زندگی کے خواب جس میں ہاتھ سے کھانے پینے کے علاوہ کوئی کام نہ کرنا پڑے۔

اب ایسی زندگی شمع کے نصیب میں تھی یا نہیں، اس کا تو شمع کو خود بھی نہیں پتا تھا۔

نام کی اس شمع کی زندگی کے بہت سے لمحات بے زاری میں صرف ہوتے تھے اور بہت سے لمحات مستقبل کی خوشگوار زندگی کے خواب دیکھتے ہوئے۔ وہ گھر میں ہر دوسرے دن جھاڑو دیتی تھی۔ بے زاری کے ساتھ اور یہ سوچتے ہوئے کہ کاش اپنی شادی شدہ زندگی میں اسے صرف نوکرانیوں کو جھاڑو دیتے ہوئے دیکھنا نصیب ہو۔

وہ برتن دھوتی تھی، کپڑے دھوتی تھی، آٹا گوندتی تھی، سالن پکاتی تھی، روٹیاں پکاتی تھی، مہینہ بھر بعد کونوں کھدروں میں لگے مکڑی کے جالے صاف کرتی تھی۔ غرض شمع گھر کا ہر کام کرتی تھی مگر بے زاری کے ساتھ اور ساتھ یہ سوچتے ہوئے ان شاء اللہ اپنی شادی شدہ زندگی میں وہ یہ سارے کام نوکرانیوں اور ملازموں کو کرتے ہوئے دیکھے گی۔

بس ایک کام تھا جو وہ بے زاری سے نہیں کرتی تھی اور وہ تھا اپنے باپ کی ہر دوسرے تیسرے دن ٹانگیں دبانا۔ ساتھ میں یہ بھی سوچتی تھی کہ وہ مستقبل میں اپنے والدین کو اپنے ساتھ رکھے گی اور ان کی خدمت اپنے ہاتھوں سے کرے گی۔

شمع کچھ اس قدر بیزار رہتی کہ کبھی کبھار پاکیزہ اسے ”مس بیزار“ کہہ کر چھیڑتی۔

”مس بیزار“، شمع کو اپنا لقب سوچ کر ہنسی آتی۔

شمع شکل و صورت کی کافی اچھی تھی۔ اٹھان بھی اچھی تھی۔ اس کی ظاہری شخصیت کے

علاوہ جو خاص بات تھی وہ یہ کہ وہ پڑھائی میں بھی اچھی تھی پورے محلے کی وہ واحد لڑکی تھی جس نے بی اے کے پیپرز ابھی ایک مہینہ پہلے دیئے تھے اور اب رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی۔

بی اے کے بعد اس کا آگے پڑھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ویسے بھی آگے پڑھنے کی کوئی تک بھی نہیں بنتی تھی۔ تک تو ویسے بی اے کے پیپرز دینے کی بھی نہیں بنتی تھی لیکن پھر بھی اس نے دیئے تھے۔ اسے رزلٹ کا کوئی خاص انتظار نہیں تھا؟ اس کی واضح وجہ یہی تھی اسے یقین تھا کہ وہ اچھے نمبروں سے سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو جائے گی اور یہ اس کے لیے بہت تھا۔

جب کبھی شمع اپنے حالاتِ غربت سے بہت زیادہ اکتا جاتی تو وہ ہال کمرے کی کھڑکی کے سامنے سٹول رکھ کر بیٹھ جاتی اور کھڑکی کی جیل کی سی سلاخوں سے صحن میں کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں ٹکائے اپنے مستقبل کے خوبصورت سپنے دیکھتی۔ سپنوں میں وہ بہت امیر ہوتی۔ عمدہ کپڑوں میں ملبوس ہوتی۔ تین چار ملازم ارد گرد گھوم رہے ہوتے اور وہ آرام سے بیٹھی ہوتی۔

حقیقت سے دوران سپنوں کو سوچ کر شمع اپنی خواہشات کی تسکین کرتی تھی۔

مذہب سے بھی اسے اچھا خاصا لگاؤ تھا۔ نمازیں تو اس کی بہت کم چھوٹتیں اور جو چھوٹتیں ان کی قضا بھی وہ ضرور پڑھتی۔ صبح کو قرآن پاک کا ایک چوتھائی پارہ بھی بلاناغہ پڑھتی۔ والدین کی اطاعت بھی کرتی۔ غیبت اور چغلی سے پرہیز تو کرتی لیکن پھر بھی کبھی کبھار کر لیتی۔ ہاں البتہ غیبت سن مزے سے لیتی۔

جھوٹ بولنے کے بعد پشیماں ہوتی اور ہر بار توبہ کرتی کہ آئندہ نہیں بولے گی۔ اس کے علاوہ دعا میں اللہ تعالیٰ سے بہت سارے شکوے کرتی کہ ان لوگوں کو غریب کیوں بنایا ہے اور ساتھ ساتھ آئندہ کی زندگی کے سہل ہونے کی فرمائش بھی ضرور کرتی اور اس طرح شمع اپنے شب و روز گزار رہی تھی۔ اپنی بہن کے ساتھ امیر ہونے کی باتیں کر کے، ہر کام کرتے ہوئے یہ کہہ کر کہ مجھ سے یہ کام نہیں ہوتا اور اپنی ماں زبیدہ کی ڈانٹ سنتے ہوئے۔

عبدالرحمٰن صاحب اس گھر کے واحد مرد تھے۔ شمع اور پاکیزہ کے والد تھے اور زبیدہ کے شوہر تھے۔ وہ ایک سرکاری محکمے میں برسوں سے کلرک تھے۔ یہاں تک کہ اب انہیں ریٹائرڈ ہونے میں صرف دو سال رہتے تھے۔ اب انہیں فکر تھی تو بس یہی ایک کہ کب وہ بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہوں گے۔

زبیدہ، جوڑوں کے درد سے تنگ رہتی تھی۔ وہ اور عبدالرحمٰن صاحب اولادِ نرینہ سے محروم تھے۔ اب تو خیر اولادِ نرینہ کی خواہش کو مرے ہوئے بھی برس ہا برس گزر چکے تھے۔ زبیدہ غصے کی تیز تھی۔ ڈانٹنا شاید ان کا مشغلہ تھا۔ کیوں کہ وہ اکثر و بیشتر پاکیزہ اور شمع کو ڈانٹتی

رہتیں۔ جوڑوں کے درد کے علاوہ پچھلے دو تین سالوں سے ان کو پاکیزہ اور شمع کو نظر بھر دیکھنے سے بھی پریشانی ہوتی۔ ہر بار جب بھی وہ پاکیزہ اور شمع کو چند سیکنڈ بھی غور سے دیکھ لیتیں تو جلدی سے ان کے دل سے بے ساختہ یہی دعا نکلتی

''یا اللہ! اب ان کے لیے اچھے سے رشتے بھیج دے۔''

سادہ سی پاکیزہ ہر حال میں ہنستی، مسکراتی اور خوش رہتی میٹرک کے بعد اس نے آگے پڑھنے کی خواہش ظاہر کی اور نہ ہی کسی نے اس سے کہا۔ ہمہ وقت خوش رہنے والی پاکیزہ، شمع کی بیزاری ختم کر کے اسے راہِ راست پہ لانے کی اسکیمیں بھی بناتی رہتی تھی۔ جس میں وہ اب تک کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

مختصراً چار مرلے کے اس گھر میں سب سے زیادہ اداس، بیزار اور خوش فہم فرد کا نام شمع عبدالرحمٰن تھا۔ اب اس کی آئندہ زندگی میں اس کے ساتھ کیا ہونا تھا اس کا شمع کو تو پتا نہیں تھا۔ ہاں البتہ وہ پر تجسس ضرور رہتی اور خدا سے یہ دعا بھی کرتی کہ ویسا ہی ہو جیسا وہ چاہتی ہے...... سب امیر امیر سا۔

❁ ❁ ❁

شام ہر سُو اپنے پَر پھیلا چکی تھی۔

سورج کی روشنی کچھ ملگجی سی محسوس ہو رہی تھی۔

صحن کے سامنے والی دیوار پر آدھے سے کچھ زیادہ دھوپ موجود تھی۔ پھیکی پھیکی دھوپ۔

جیسے ہی اس دیوار پر سے دھوپ ختم ہوتی، اس کے پانچ یا دس منٹ بعد مغرب کی اذانیں شروع ہو جاتی تھیں۔

اس بات کا تعین شمع نے بچپن سے ہی کر لیا تھا۔ بچپن سے ہی وہ دیکھ رہی تھی جیسے ہی اس دیوار سے دھوپ غائب ہوتی۔ اس کے کچھ وقفے بعد اذانیں بھی ہو جاتیں۔

شمع ساتھ ساتھ موجود گول ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی گرمیوں کی لمبی شام تھی۔

عصر کی نماز پڑھنے کی بعد اس نے صحن میں پانی کا تھوڑا تھوڑا چھڑکاؤ کیا تھا، چار پائیاں بچھائی تھیں، دونوں گھڑے اور ان کا اسٹینڈ لا کر صحن میں رکھا تھا اور اب وہ آرام اور بیزاری کے ساتھ ستون سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

گرمی کا زور حسبِ معمول تیز تھا۔ چار پائیاں بچھانے کے بعد صحن میں برائے نام جگہ

بچی تھی۔

شمع نے گہرے آسمانی رنگ کا لان کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور اس وقت وہ نیلے آسمان کے کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

تھوڑے تھوڑے وقفے سے زبیدہ اور پاکیزہ بھی کمرے سے نکل آئیں۔

زبیدہ اس ٹائم وظیفہ پڑھا کرتی تھی اور زیادہ تر اس کا وظیفہ اتنا لمبا ہوتا کہ مغرب کی اذانوں کے بعد ختم ہوتا۔

پاکیزہ ہاتھ میں شیشہ اور کنگھا لے کر آئی تھی اور وہ چار پائی پر بیٹھ کر کنگھا کرنے لگی۔

''تم کس خوشی میں کھڑی ہو، بیٹھ جاؤ، تھک جاؤ گی۔'' کچھ دیر بعد پاکیزہ نے مدھم آواز میں کہا تھا۔ مدھم آواز میں اس لیے کہ زبیدہ ڈسٹرب نہ ہو۔

شمع نے پاکیزہ کو کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ بس ایک نظر اسے دیکھا تھا اور پھر سے نگاہیں آسمان پر جما دیں۔

شمع کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ چپ چاپ کنگھا کرنے لگی پانچ منٹ میں اس نے کنگھا کر کے بال گوندھ بھی لیے۔ اس کے بالوں کی چٹیا کمر سے بھی کچھ نیچے تک آتی تھی۔

کنگھا کرنے سے جو بال اترے تھے انہیں کنگھے میں سے نکال کر اس نے رول کیے اور کنگھا اور شیشہ لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بیٹھ جاؤ، تمہیں کھڑے دیکھ کر میری ٹانگیں درد کرنے لگ گئی ہیں۔'' پاکیزہ نے اندر جاتے ہوئے شمع سے کہا تھا مدھم آواز میں۔

شمع چپ چاپ بیٹھ گئی۔ بیزاری کے ساتھ۔

پاکیزہ نے رول کیے ہوئے بال کوڑا کرکٹ والے بڑے ڈبے میں ڈالے اور کنگھا اور شیشہ اندر مقررہ جگہ پر رکھ آئی۔

''اتنی اکتائی ہوئی کیوں ہو؟'' ہزار دفعہ کا پوچھا ہوا سوال پاکیزہ نے ایک بار پھر پوچھا تھا۔

''نہیں تو۔'' شمع نے ہزار دفعہ پہلے دیا ہوا جواب ایک بار پھر دیا تھا۔ اکتائے ہوئے انداز میں۔

''اور تم جو اس قدر اکتائی رہتی ہو، مجھے تو اب یہ سوال ہی نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اگر قسمت سے کبھی اچھے موڈ میں دیکھوں تو اس دن مجھے تم سے پوچھ لینا چاہئے کہ اتنی خوش کیوں

ہو...... ہے نا۔'' پاکیزہ نے شمع کی طرف دیکھے بغیر کہا تھا۔ اس لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ یہ سب شمع سے کہہ رہی تھی یا پھر خود کلامی کر رہی تھی۔

''آج گرمی کچھ زیادہ ہے۔'' شمع نے پاکیزہ کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا تھا۔

پاکیزہ نے لحہ بھر گرمی محسوس کرنے کی کوشش کی۔ چہرے پر چند ایک لکیریں ابھری تھیں اور پھر اس نے جواب دیا تھا۔

''نہیں تو، ویسی ہی گرمی ہے جیسی کہ روز ہوتی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے چہرے اور گردن پر ہاتھ پھیرا تھا۔ جہاں اسے بہت ہلکا سا پسینہ محسوس ہوا تھا جو نشاندہی کر رہا تھا کہ آج کا موسم بھی روز کی طرح ہے۔

''اگر تمہیں گرمی لگ رہی ہے تو اندر سے پنکھا لے لو، بلکہ ٹھہرو میں ہی لا دیتی ہوں...... تم جیسی نکمی تو سستی سے اٹھے گی ہی نہیں۔'' مدھم آواز میں طعنہ دیتے ہوئے اندر کی طرف چلی گئی۔ شمع کو تو جیسے پیروں کو لگی اور سر کو بجھی۔ جیسے ہی پاکیزہ اندر سے پنکھے لے کر آئی شمع نے بھڑاس نکالنا شروع کر دی لیکن آہستہ آواز میں۔

''یہ تم ہر وقت نکمی اور سست کسے کہتی رہتی ہو! چارپائیاں کس نے نکالی ہیں؟ چھڑکاؤ کس نے کیا ہے صحن میں؟''

''ہاں تو کون سا احسان کیا ہے میری ذات پر، پچھلے چار دن میں نے بھی صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کیا ہے۔ یہ بھاری بھرکم چارپائیاں بھی نکالی ہیں لیکن میں نے تو نہیں جتایا۔'' پاکیزہ جتا کر بھی یہ کہہ رہی تھی کہ اس نے نہیں جتایا۔

اس سے پہلے کہ شمع کچھ بولتی۔ پاکیزہ نے ہی بولنا شروع کر دیا۔

''ایک کام کو میں دس بار کرتی ہوں اور تم اس کو ایک بار۔ وہ بھی بیزاری کے ساتھ اب تم کو سست اور نکما نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے۔''

شمع کا دل چاہا کہ کوئی چیز اٹھا کر پاکیزہ کو دے مارے لیکن ایک تو پاس کوئی چیز اٹھا کر دے مارنے والی پڑی نہیں تھی۔ دوسرا اگر پڑی بھی ہوتی اور وہ دے مارتی تو اس کے بعد جو نتائج نکلنے تھے ان کو بھگتنے سے بہتر تھا کہ وہ دل کی خواہش کو ہی دبا لے۔ اسی لیے وہ ابھی کوئی کرارا جواب دینے ہی والی تھی کہ زبیدہ بول اٹھی۔

''کتنی بار تم لوگوں سے کہا ہے کہ جب میں وظیفہ پڑھ رہی ہوں تو مت بولا کرو، خلل پڑتا ہے۔ مگر مجال ہے جو تمہارے کانوں پر جوں بھی رینگے، خاموش ہو کر بیٹھو۔''

ماں کی ڈانٹ شمع کو کڑوا گھونٹ لگی تھی۔ البتہ پاکیزہ مسکرانے لگ گئی تھی۔ ماں کی

ڈانٹ سن کر پاکیزہ ہمیشہ مسکرانے لگتی تھی اور پاکیزہ کی مسکراہٹ دیکھ کر شمع کی کڑواہٹ میں اضافہ ہوا تھا۔ ویسے اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ پاکیزہ ڈانٹ سن کر مسکراتی کیوں ہے۔

پاکیزہ اندر سے دو پنکھے لائی تھی۔ ایک اس نے شمع کی طرف کھسکا دیا اور دوسرے سے اپنے آپ کو اور زبیدہ کو جھلنے لگی۔ صحن میں بیٹھنے کے لیے ان کے گھر یہی ہاتھ والے پنکھے استعمال ہوتے تھے۔ جو بجلی نہ ہونے کی صورت میں استعمال کیے جاتے تھے۔ ڈنڈے والا پنکھا (پیڈسٹل فین) ان کے گھر میں نہیں تھا۔ عبدالرحمٰن پچھلے دو سالوں سے ڈنڈے والا پنکھا خریدنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن پیسے بن نہیں پا رہے تھے۔

شمع نے بھی کسلمندی سے پنکھا اٹھایا اور اپنے آپ کو جھلنے لگی۔ بہت آہستہ انداز میں۔

اگر زبیدہ نے ڈانٹا نہ ہوتا تو پاکیزہ شمع کے پنکھا جھلنے کے انداز کو دیکھ کر ضرور کہتی۔

''ہاتھ ٹوٹے ہیں کیا۔'' لیکن اب اس نے کچھ ایسا کہنے سے اپنے آپ کو باز رکھا۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

شمع نے کوئی ردِعمل نہ دکھایا جیسے دستک اس کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں۔

پاکیزہ نے ایک بار ماں کو پنکھا زور سے جھلا اور پنکھا رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کون ہے؟'' پاکیزہ نے کنڈی کھولنے سے پہلے پوچھا تھا۔

اور پاکیزہ کی آواز سن کر باہر کھڑا سعد بددل ہو گیا۔ بلکہ اسے کافی کوفت بھی ہوئی تھی۔

''سعد ہوں، سامنے والے گھر سے۔ چاچا عبدالرحمٰن گھر پہ ہے؟'' سعد نے اکتائے ہوئے انداز میں پوچھا تھا۔

ایک ہی گلی میں گھر ہونے کی وجہ سے، اور بچپن کی سنگت کی وجہ سے پاکیزہ سعد کی آواز پہچانتی تھی۔

پاکیزہ نے دوپٹا سر پر جمانے کے بعد کنڈی کھول دی۔

دروازے کے دونوں کواڑ کے درمیان حاشیہ نام خلا پیدا کر کے اس نے اپنا چہرہ اس خلا پر فوکس کیا تھا اور باہر دروازے کے سامنے کھڑے سعد کو دیکھ کر بولی تھی۔

''نہیں! ابو چاچے فرید کے ہوٹل پر گئے ہیں۔ چائے پینے اور تھوڑی گپ شپ لگانے۔ آپ وہیں جا کر مل لیں۔ یا پھر مغرب کے بعد آئیے گا۔ ابو گھر پر ہوں گے پھر مل لیجیے گا۔ ویسے کوئی خاص کام ہو تو بتا دیجیے۔''

''نہیں کوئی خاص نہیں میں چاچے سے ہوٹل پر جا کر مل لیتا ہوں۔'' سعد نے پاکیزہ کو کوفت بھرے انداز میں جواب دیا تھا اور دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔

''دس بار دروازہ کھٹکھٹاؤ تو نو بار یہی حاضر ہوتی ہے۔ پتہ نہیں شمع کیوں نہیں آتی۔''

سعد نے چڑ کر سوچا تھا۔ اسے پاکیزہ سے کچھ چڑ سی ہونے لگی تھی۔

اور رہ گئی چاچے عبدالرحمٰن سے ملنے کی بات تو وہ پہلے ہی ان سے ہوٹل پر مل کر آ رہا تھا اور ان سے ملتے وقت ہی اس نے دروازہ کھٹکھٹانے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن جب پاکیزہ دروازے پر آئی تو منصوبے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔

اور کنڈی لگاتے ہوئے پاکیزہ مسکرائی تھی۔ سعد محلے اور رشتہ داروں میں موجود ان تین چار لڑکوں میں سے تھا جو اسے پسند تھے۔ ان میں سے کسی کے ساتھ بھی شادی ہونے کی صورت میں پاکیزہ نے خوش رہنا تھا۔

۞۞۞

شاداں کی آنکھوں میں اب پکے گھر کا خواب ختم ہو چکا تھا۔ اسے اب حسرت نہیں تھی کہ گھر پکا ہو۔ کچے گھر کی ایک عادت سی ہو چکی تھی۔

ابھی کل کی بات ہی محسوس ہوتی تھی کہ شاداں یہاں دلہن بن کر آئی تھی اور اب سعد کی دلہن لانے کے بارے میں وہ سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔

سعد، شعیب، مزمل اور صوفیہ اسی ترتیب کے ساتھ اس کے آنگن میں کھلنے والے پھول تھے۔

اکبر کی پرچون، منیاری اور مٹی کے برتنوں کی ایک ملی جلی دکان تھی۔ جس میں پرچون کی چند ایک ہی چیزیں دستیاب تھیں۔ مختلف رنگوں کے دھاگے اور فیتے بھی میسر تھے اور اب اس نے چند ایک مٹی کے برتن بھی رکھ لیے تھے۔ مٹی کے برتنوں کی وجہ سے اس کی آمدنی میں کچھ اضافہ ہوا تھا۔

سعد اور شعیب واجبی سی تعلیم پا چکے تھے۔ بیس سالہ شعیب کو باپ کا ہاتھ بٹاتے ہوئے دو تین سال ہو چکے تھے اور پچیس سالہ سعد ایک ورکشاپ پر بے قاعدگی سے کام پر جاتا تھا۔ شمع کے عشق میں مبتلا سعد شمع کی طرح سُست تھا۔ کام کرنے کا اس کا بھی خاص دل نہ کرتا تھا۔

مزمل کو جنون کی حد تک پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ بڑا افسر بننا چاہتا تھا۔ فی الحال وہ ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔

اور صوفیہ نے چھٹے سال میں پہنچ کر سکول جانا شروع کیا تھا۔ اسے سکول بھیجنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ اردو پڑھ اور لکھ سکے اور تھوڑا بہت حساب کتاب بھی کر لے شاداں کی طرح بالکل

اجڈ گنوار نہ ہو جو کہ گھڑی پر ٹائم کا اندازہ بھی اس بات سے لگاتی کہ گھڑی کی سوئیاں اس وقت کس جگہ پر ہیں۔ وگرنہ ہندسوں کی تو اسے بالکل پہچان نہ تھی۔

ساگ اور مکھن کو پراٹھے پر رکھ کر وہ سعد کو اندر کمرے میں دینے گئی۔ بنیان اور شلوار میں ملبوس سعد چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ چت لیٹا وہ چھت کو گھور رہا تھا۔

''سعد بیٹا! اٹھ کھانا کھا لے۔'' شاداں کی آواز سن کر سعد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جیسے شاداں کی آواز اس کو کسی دوسری دنیا سے اس دنیا میں کھینچ لائی ہو۔

''ہاں، جی اماں!'' چارپائی پر آڑھا ترچھا بیٹھا وہ ماں کو ہونقوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ اس نے نہ ماں کی بات سنی تھی اور نہ ہی اسے ماں کے ہاتھ میں موجود چھابی نظر آئی تھی۔

شاداں نے بیٹے کو بڑے غور سے دیکھا تھا اور ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ اب واقعی وقت آ گیا تھا کہ وہ شمع کو دلہن بنا کر لے آئے لیکن سعد کی کمانے کے معاملے میں لاپرواہ طبیعت، اسے رشتہ لے کر جانے سے روکتی تھی۔ آناً فاناً اس نے بیٹے سے یہی بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''لے کھانا کھا۔'' شاداں نے چھابی سعد کے سامنے رکھی اور خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

ساگ کو دیکھ کر سعد کو بھوک کا احساس ہوا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے شمع کے خیال نے بھوک کے احساس کو دبا رکھا تھا۔

سعد نے کھانا شروع کیا۔ بہت اچھا کھانا تھا۔

''ابا نہیں آیا؟'' سعد نے پوچھا تھا۔ سعد کو پتا تھا کہ ابھی اس کے والد کے آنے میں گھنٹا بھر رہتا ہے اور ابھی وہ نہیں آئے ہوں گے لیکن پھر بھی اس نے پوچھ لیا۔

''نہیں!'' شاداں نے مختصر جواب دیا تھا۔ اکبر رات کا کھانا نہیں کھاتا تھا۔ اسی لیے وہ دوپہر کا کھانا تھوڑا لیٹ کھاتا۔

سعد کھانا کھاتا رہا اور شاداں اسے دیکھتی رہی۔ یوں تو کلین شیو کا رواج کافی کم تھا لیکن سعد کلین شیو ہی تھا اور بڑا بھلا محسوس ہوتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد سعد نے ہاتھ اس رومال سے پونچھے جس میں پراٹھے لپٹے ہوئے تھے اور وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ شاداں نے اسے روک لیا۔

''تیرے سے ایک بات کرنی ہے۔'' شاداں کی آواز سن کر اٹھتا ہوا سعد دوبارہ بیٹھ گیا۔

''جی!'' سعد نے فرمانبرداری سے کہا تھا۔ ماں باپ کا وہ کافی تابع فرمان تھا۔

''کام کے سلسلے میں کب سنجیدہ ہوگا؟''

''سنجیدہ......ہوں تو سہی۔''

''یہ روز روز کے ناغے سنجیدگی کو ظاہر کرتے ہیں۔''

''امی میرا بس دل نہیں کرتا......کیا کروں۔'' سعد نے بے ساختہ سر جھکا لیا۔ یہ وہ بات تھی جس کے بارے میں اس کے ماں باپ نے کئی بار اسے کہا تھا لیکن وہ ان کا کہا پورا نہیں کر سکا تھا۔

''میں تیری شادی کے بارے میں سوچ رہی ہوں، لیکن تُو کچھ سنجیدہ ہو تو......کچھ پیسے میرے ہاتھ پر رکھے تو پھر ہی بات آگے بڑھے۔''

شاداں کے منہ سے شادی کا سن کر سعد کا دل بڑے زور سے دھڑکا تھا ساتھ ہی شمع کا سراپا آنکھوں کے سامنے لہرایا تھا۔

''یہ زبیدہ کی بیٹی ہے نا......شمع......بڑی بھلی لگتی ہے مجھے تیرے لیے پسند ہے مجھے مگر تو کچھ باقاعدہ کما کر لائے تو ہی بات کروں۔......اب اس صورتِ حال میں تو مجھے خود بھی شرم آئے گی، رشتے کی بات کرتے ہوئے، ویسے تجھے کیسی لگتی ہے شمع؟''

شاداں کے منہ سے شمع کا نام سنتے ہوئے سعد کا دل اتنے زور سے دھڑکا کہ انتہا نہیں۔ پورے جسم میں جیسے کرنٹ سا دوڑا تھا۔ ایک سرشاری کا احساس لیے۔

''مجھے بھی شمع اچھی لگتی ہے۔'' سعد کے لہجے میں چھپے جوش کو شاداں نے بھی محسوس کیا تھا۔

''تو بس اب کچھ باقاعدگی سے کما سال چھ مہینے، کچھ پیسے پلے ہوں تو شادی کا سوچیں، اکبر کے پاس جو بچت ہے اس سے ہم تیرے لیے ایک پکا کوٹھا بنوالیں گے اور ولیمے کا خرچہ بھی اس سے نکال لیں گے، بس اب دیکھ لے باقی خرچوں کے لیے پیسے جمع کرنا شروع کر دے۔ وہ سارے تُو نے ہی کرنے ہیں۔ باقاعدگی اور محنت سے کام کرے گا تو مشکل آسان ہو جائے گی۔ میری بس یہی شرط ہے کہ تُو اچھا مستقل کما کر لائے گا تو میں تیرا رشتہ لے کر جاؤں گی۔'' شاداں نے شفقت سے سعد کے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیرا تھا اور چھابی اٹھا کر چل دی اور سعد کے ہونٹ خود بخود پھیل گئے۔ اسے امید نہیں تھی کہ یہ سب اتنا آسان ہوگا۔

''شمع۔'' آنکھیں بند کر کے اس نے شمع کا نام لیا تھا۔ کام پر مستقل جانے کا اسے عزم بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔ بلکہ عزم بھی خود بخود ہوتا چلا گیا۔

اور پھر اگلے چھ مہینوں میں اس نے ایک دن بھی چھٹی نہیں کی تھی اور روز کی مزدوری لا

کر وہ شاداں کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ اس کے علاوہ چوتھے مہینے اس نے اوور ٹائم بھی لگانا شروع کر دیا تھا۔

جو باقاعدگی ماں باپ کے کہنے سے نہ آسکی وہ شمع کو پانے کے خیال سے خود بخود آگئی یہاں تک کہ اب اسے کام کرنے میں مزا بھی آتا تھا۔

شاداں مطمئن ہوگئی۔ اس نے اکبر سے بات کی۔ اکبر نے کہا کہ پاکیزہ بڑی ہے اس کا رشتہ لے جاؤ۔ شاداں نے پاکیزہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''بلاشبہ پاکیزہ بہت اچھی ہے لیکن مجھے تو شمع ہی پسند ہے۔ تو شمع ہی ہماری بہو بنے گی اور ہمارا سعد بھی شمع کے ساتھ خوش رہے گا۔''

سعد کی پسند کے بارے میں شاداں نے بتانا بہتر خیال نہیں کیا تھا۔

''جیسے تمہیں بہتر لگے۔'' اکبر نے آنکھیں موندتے ہوئے کہا تھا۔ اسے شاداں پر بھروسہ تھا آخر اسی بھروسے کے سہارے ہی تو اس نے بتیس سال گزارے تھے۔

❁❁❁

خوشی اور غم زندگی کے یہی دو پہلو ہوتے ہیں لیکن سونیا کو اپنی زندگی میں نہ خوشی محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی غم۔ بس ایک لائن تھی جس پر زندگی چلی جاتی تھی۔

اگلے مہینے کی پانچ تاریخ کو اس نے پورے پینتیس سال کا ہو جانا تھا اور ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔

سونیا سوچتی تھی کہ اس کی شادی اب تک اس لیے نہیں ہوئی کہ اسے آج تک محبت نہیں ہوئی۔ حقیقتاً وہ غلط سوچتی تھی۔

سونیا رحیم کی شادی نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اسے اپنا آئیڈیل نہیں ملا تھا۔

بائیس سال کی تھی وہ، جب عبدالرحیم لغاری صاحب کی حرکتِ قلب بند ہونے کی وجہ سے اچانک موت واقع ہوئی تھی۔ اس کی ماں سمیعہ رحیم تو اس کی پیدائش کے وقت ہی مر گئی تھی۔

رحیم لغاری صاحب کی وفات کے بعد سونیا ہی باپ کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ بزنس سنبھالنے کے لیے۔ بہت ساری فیکٹریوں پر مشتمل بزنس سونیا نے احسن طریقے سے سنبھالا تھا۔

اس کے تمام رشتہ داران سے مالی طور پر کم تھے اور رحیم صاحب کی وفات کے بعد وہ جائیداد اور بزنس پر نظر رکھتے تھے۔ اسی لیے تو وہ ان سب لوگوں سے دور رہی تھی۔ جیسے کہ رحیم لغاری صاحب خود رہتے تھے۔

اور اب تیرہ سال ہونے کو آئے تھے وہ بڑی مہارت سے بزنس سنبھال رہی تھی۔ لالچی رشتہ دار سونیا کی سوجھ بوجھ سے خائف ہو کر خود ہی دور ہٹ گئے تھے۔

وہ کسی ایسے شخص سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی جو اس کی دولت پر نظر رکھے۔ مختلف بزنس مین نے اپنے بیٹوں کو سونیا کے ساتھ بیاہنے کی وقتاً فوقتاً منصوبہ بندی کی تھی لیکن یہ منصوبہ بندیاں سونیا کے انکار سے ناکام ہوتی رہی تھیں۔

اسے اپنے آئیڈیل کی تلاش تھی جس سے اسے محبت ہونی تھی۔ (سونیا کا خیال تھا کہ محبت آئیڈیل سے ہی ہوتی ہے۔ وہ اس نظریے کی تردید کرتی تھی جو کہتا تھا کہ جس سے محبت ہوتی ہے وہ آئیڈیل بن جاتا ہے۔)

اور اسی آئیڈیل کے انتظار میں وہ پینتیسویں بہار دیکھنے والی تھی۔ دھن کی پکی تھی۔ اگر اس کا آئیڈیل نہیں ملتا تو وہ شادی نہیں کرے گی۔ ابھی تک تو وہ یہی ارادہ رکھتی تھی۔

اب سونیا نے تبدیل ہونا تھا یا اس کے ارادے نے۔ اس کا سونیا کو نہیں پتا تھا۔ ویسے خود سونیا کے خیال کے مطابق نہ اس نے تبدیل ہونا تھا اور نہ ہی اس کے ارادے نے۔

❁❁❁

شاداں رشتہ لے کر آئی تھی۔ سندیسہ اور سوچنے کا ٹائم دے کر وہ زبیدہ کو حیران و پریشان چھوڑ کر چلی گئی۔

"پاکیزہ سے پہلے شمع کی شادی تو نہیں کروں گی۔" کئی گھنٹوں تک سوچنے کے بعد وہ بالآخر یہی طے کر پائی تھی۔

کسی کام میں اس کا دھیان نہیں لگ رہا تھا سبزی کاٹتے ہوئے اس نے شمع کو بلایا تھا۔

بے زاری چہرے پر سجائے ہوئے شمع اس کے پاس آئی تھی۔ اس نے شمع کو پیار کیا تھا اور پھر رونے لگ گئی تھی۔ شمع حیران ہوئی تھی۔

"اماں! کیا ہوا رو کیوں رہی ہو؟" شمع نے پوچھا تھا۔ ساتھ بیٹھی پاکیزہ بھی اتنی حیران تھی کہ جتنی کہ شمع۔

"کچھ نہیں جاؤ یہ بھنڈیاں لے اور پکا۔ کڑاہی میں بنانا۔ کڑاہی میں بھنڈیاں لذیذ بنتی ہیں۔" زبیدہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

"اماں ہوا کیا ہے؟" شمع ہنوز حیران تھی۔ بھنڈیوں کی ٹوکری اس نے اپنی طرف بڑھائی تھی۔

"جو کہا ہے وہ کرو۔ جاؤ اسے لے کر۔" زبیدہ اپنی ٹون میں آ گئی تھی۔ ڈپٹتا انداز

دوبارہ اس کے لہجے میں در آیا تھا۔

شمع نے آنکھیں سکیڑ کر ایک نظر ماں کو دیکھا تھا لیکن اسے عافیت اسی میں نظر آئی تھی کہ ٹوکری اٹھا کر چپ چاپ چل دے۔

"اماں کیا ہوا؟ آپ پریشان ہیں کیا؟" شمع کچن کی طرف گئی تو پاکیزہ نے ماں سے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں۔"

"مجھے نہیں بتائیں گی، ایسی کیا پردہ داری۔ اب بتا دیں شاداں خالہ نے اکیلے کمرے میں آپ سے کیا کہا ہے کہ آپ حیران و پریشان ہیں۔" پاکیزہ کا لہجہ ہنوز رسان بھرا تھا۔

زبیدہ نے بیٹی کو دیکھا تھا۔

"کس قدر فرق ہے دونوں کے اٹھنے بیٹھنے میں۔ پاکیزہ جتنی سلجھی ہوئی ہے شمع اسی قدر الجھی ہوئی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ پاکیزہ کا رشتہ آ جاتا۔" زبیدہ کے ذہن میں سوچ خود بخود در آئی تھی۔

"جی اماں۔" پاکیزہ ماں کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔

زبیدہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بالآخر اس نے پاکیزہ کو بتا دیا۔

"شاداں، سعد کا رشتہ لے کر آئی تھی شمع کے لیے۔"

زبیدہ کی بات سن کر پاکیزہ کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ کھل گئیں۔

"سچ!" پاکیزہ کے لہجے میں جوش تھا۔

"اور کیا تیرے خیال میں ایسی باتیں مذاق میں کی جاتی ہیں۔" زبیدہ کا جلا کٹا جواب بھی پاکیزہ کو لطیفہ لگا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تو اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔ خوش ہو جاؤ اماں۔" پاکیزہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا تھا۔

جواباً زبیدہ نے پاکیزہ کو کچھ ایسی کینہ توز نظروں سے دیکھا تھا کہ پاکیزہ کے دانت خود بخود اندر چلے گئے لیکن اگلے پل وہ دوبارہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

پاکیزہ کے قہقہے کی آواز شمع کے کانوں تک بھی پہنچی تھی کچن سے جھانک کر اس نے باہر دیکھا تھا۔

زبیدہ اور پاکیزہ بھی کچن سے جھانکتی شمع کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔ زبیدہ کی نظروں میں کچھ ایسا تھا کہ شمع خائف ہو کر کچھ پوچھے بنا دوبارہ کچن کے اندر چلی گئی۔

"پتا نہیں میں انہیں پاگل لگتی ہوں۔ اب اگر کچھ پوچھ بھی لوں تو بتائیں گے نہیں، اُف اللہ میں کیا کروں؟" شمع نے سوچا تھا۔

پاکیزہ کچن کی طرف جانے کے لیے اٹھی تھی۔

"شمع کو ابھی کچھ مت بتانا۔" زبیدہ کی آواز نے پاکیزہ کا تعاقب کیا تھا۔ پاکیزہ نے رک کر ایک نظر ماں کو دیکھا تھا۔

"اچھا کچھ نہیں بتاتی۔" کہتے ہوئے وہ کچن کی طرف جانے لگی۔ جاتے ہوئے سامنے برآمدے کی دیوار پر لگے نیلے فریم والے گول شیشے میں پاکیزہ نے اپنا عکس دیکھا تھا۔ اپنا عکس دیکھ کر وہ لمحہ بھر کو رک گئی۔

اس جگہ پر شیشہ ان کے گھر کا حصہ تھا۔ اس نیلے فریم والے شیشے سے پہلے کسی اور رنگ کے فریم والا گول شیشہ یہاں پر لگا ہوا تھا۔

"کیا ہی اچھا ہوتا شمع کی جگہ میرے لیے سعد کا رشتہ آیا ہوتا۔" اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے پاکیزہ کے ذہن میں یہی خیال آیا تھا۔

"چلو اللہ کی مرضی۔ یا اللہ میرے لیے سعد سے بھی زیادہ اچھے لڑکے کا رشتہ بھیجنا۔" دوسرے لمحے پاکیزہ نے اللہ سے دعا بھی مانگ لی اور بات کو چٹکیوں میں اڑا دیا اور مزے سے شیشے سے ہٹ کر خراماں خراماں کچن کی طرف چل دی۔ اس وقت اسے بے زار فطرت شمع سے بات کرنے میں بڑا مزہ آنا تھا۔

❁❁❁

کیسا عجیب بے کیف سا احساس تھا جو ہر وقت اس کو گھیرے میں لیے رکھتا تھا۔

زندگی نے اس موڑ پر بھی آنا تھا۔ اس نے سوچا نہ تھا۔

وہ غیر مرئی نقطے کو تکے جا رہی تھی کہ دروازے کی دستک نے اسے چونکا دیا۔

اس دروازے کو کتنے لوگ کھٹکھٹایا کرتے تھے۔ کچھ لوگوں کو موت نے دور کر دیا اور کچھ لوگوں کو زندگی دور لے گئی۔

دروازے میں موجود سوراخ سے اس نے باہر دیکھا تھا یہ سوراخ گزرتے وقت کی سوغات تھا۔ سوراخ سے اسے ایک خاکی لباس میں ملبوس آدمی نظر آیا تھا۔ جس کی جیب کے اوپر لال حروف سے لکھا ہوا Post Man دور سے نظر آ رہا تھا۔

پوسٹ مین کو دیکھ کر اس کا دل اس زوروں سے دھڑکا تھا کہ اسے لگا کہ کہیں سینے کو چیر کر باہر ہی نہ آ جائے۔

اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا تھا۔

"ہاں جی! یہ انہی کا گھر ہے۔" جب پوسٹ مین نے تصدیق کے لیے نام لے کر پوچھا تو اس نے مثبت جواب دیا۔

"آپ نے یہ رجسٹرڈ ڈاک بھیجی تھی، کراچی۔ افسوس کہ اس پتے پر مطلوبہ نام کا کوئی فرد نہیں رہتا۔ رجسٹرڈ ڈاک ہونے کی وجہ سے ہم یہ آپ کو واپس کرنے آئے ہیں۔" پاکستان پوسٹ اس قدر مستعد ہے اگر کوئی اور وقت ہوتا تو وہ جی بھر کر حیران ہوتی لیکن مسئلہ یہی تھا کہ کوئی اور وقت نہیں تھا۔

مرے مرے ہاتھوں سے اس نے ڈاک وصول کی اور دروازہ بند کر کے اندر آ گئی۔ مرے مرے قدموں کے ساتھ۔

اندر آنے کے بعد اسے سمجھ نہ آیا کہ کیا کرے۔ کچھ نہ سوچتے ہوئے وہ ان دو ستونوں کی طرف بڑھ گئی جو کہ برآمدے کی چھت کو سہارا دیئے کھڑے تھے۔ ایک ستون کے ساتھ کھڑے ہو کر وہ گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی اور اس نے رونا شروع کر دیا۔

وہ بھل بھل روئے جا رہی تھی اور واپس آ جانے والی اس ڈاک کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے رونے کی شدت میں اضافہ ہی ہو رہا تھا۔

"تمہیں میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔" رونے کے درمیان اس کے منہ سے یہی الفاظ نکلے تھے۔

وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ اسے پتا تھا کہ رونے سے مسائل نہیں حل ہوں گے لیکن پھر بھی وہ روئے جا رہی تھی۔

رونے کے دوران اس نے واپس آنے والی ڈاک کے ٹکڑے کر دیئے اور ان کو اس نے بے دردی سے اچھال دیا۔ چھوٹے سے صحن میں کاغذ کے ٹکڑے بکھرتے چلے گئے۔

اس گھر کی صفائی کرنے والی مکین وہ خود تھی۔ جب وہ رونے کے شغل سے فارغ ہو جاتی تو یقیناً سب سے پہلے ان کاغذ کے ٹکڑوں کو چنتی اور اسے فیصل کے آنے سے پہلے نہ صرف جی بھر کر رو لینا تھا بلکہ ان کاغذ کے ٹکڑوں کو بھی چننا تھا جنہیں اس نے پھیلایا تھا۔ اگر وہ ان ٹکڑوں کو نہ چنتی تو فیصل واپس آ کر ان کے بارے میں ضرور پوچھتا اور فیصل کو بتانے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

واپس آنے والی ڈاک ایک خط تھا جو اس نے فیصل کے باپ کو لکھا تھا۔ زبردست ہوتے ہوئے اس نے زبردست سے رابطہ کیا تھا۔ خط میں اس نے طلاق کا مطالبہ کیا تھا۔

طلاق کا مطالبہ بھی دراصل ایک قسم کا جوا تھا جو اس نے کھیلا تھا لیکن جوا کھیلنے والا دوسرا فریق سرے سے موجود ہی نہیں تھا تو وہ کیا کرتی۔

اسے فیصل کے باپ سے طلاق نہیں چاہئے تھی لیکن پھر بھی اس نے طلاق مانگی تھی۔

اسے یہی کرنا بہتر لگا تھا۔

آدھا گھنٹا مزید گزرنے تک اس کے رونے کی شدت میں اضافہ ہی ہوا تھا۔

❁❁❁

''نیک بخت! خدا کا شکر ادا کرو کہ اتنا اچھا رشتہ آ گیا ہے۔ صرف ڈیڑھ سال کا تو فرق ہے پاکیزہ اور شمع میں خدا سے دعا کرو کہ پاکیزہ کا بھی نصیب کھول دے اور سعد ماشاء اللہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ اکبر بھی میرا بچپن کا دوست ہے۔ دیکھا بھالا گھر ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اب جب وہ جواب مانگنے آئیں تو ہم ہاں کر دیں گے۔'' عبدالرحمٰن نے زبیدہ کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

عبدالرحمٰن ابھی کچھ دیر پہلے کام سے آئے تھے۔ نو سے پانچ والی کلرک کی ڈیوٹی سے۔

اب وہ چارپائی پر لیٹے ستا رہے تھے اور زبیدہ ساتھ والی چارپائی پر بیٹھی تھی۔

عبدالرحمٰن کی چارپائی کے پائے کے ساتھ نصف سے کم پانی سے بھرا جست کا مگ پڑا تھا۔ عبدالرحمٰن جب آئے تھے تو زبیدہ پانی بھر لائی تھی۔ مگ پانی سے پورا بھرا ہوا تھا۔ عبدالرحمٰن نے نصف سے زیادہ پانی پی لیا تھا اور باقی چارپائی کے پائے کے ساتھ رکھ دیا تھا۔

''لیکن لوگ کیا کہیں گے، ہر کوئی پوچھے گا کہ بڑی سے پہلے چھوٹی کی شادی کیوں کرتے ہو تب میں کیا کہوں گی۔ آپ نہیں جانتے عورتوں کو، ہر دوسری عورت پوچھے گی کہ بڑی میں کوئی عیب ہے کیا، تب کس کس کو صفائی دوں گی!'' زبیدہ کا لہجہ پریشان کن تھا۔

عبدالرحمٰن اس کی بات سن کر مسکرا دیئے۔

''نیک بخت کتنے سال ہو گئے ہیں ہمیں ساتھ زندگی گزارتے ہوئے اور میں آج تک تمہارے ذہن میں یہ بات نہیں بٹھا سکا کہ دنیا کا کام تو باتیں بنانا ہے تم کیوں خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہو۔ بسم اللہ پڑھ کر رشتے کے لیے ہاں کہنے کا سوچو۔'' عبدالرحمٰن کی بات کا زبیدہ پر اثر ضرور ہوا تھا لیکن شش و پنج کو لیے اس نے چارپائی کے ساتھ پڑے پانی کے مگ کو اٹھایا تھا اور کچن کی طرف چلی گئی۔

رات کو سونے سے پہلے زبیدہ نے اس معاملے کو جی بھر کر سوچا تھا عبدالرحمٰن کی باتیں بھی ذہن میں گونجتی رہی تھیں۔ پاکیزہ اور شمع کے سراپے بھی آنکھوں کے سامنے آتے جاتے

رہے لیکن سونے سے پہلے وہ اس رشتے کے متعلق مکمل طور پر مطمئن ہو چکی تھی اور سونے سے پہلے آخری دعا اس نے یہی کی تھی۔

''یا اللہ میری دونوں بیٹیوں کا نصیب اچھا کرنا۔''

اگلے دن کی صبح عام دنوں کی صبح جیسی تھی۔ سب سے پہلے پاکیزہ اٹھی۔ وضو کرنے کے بعد اس نے ماں کو جگایا۔ زبیدہ نے عبدالرحمٰن کو جگایا تھا۔ شمع بھاگتے دوڑتے اٹھی تھی نماز قضا ہونے میں چند منٹ ہی رہتے تھے جب اس نے دو رکعت سنت نماز فجر کہہ کر تکبیر کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے۔

شمع روز ہی اسی طرح اٹھتی تھی۔ آخری وقت میں نماز ادا کرتی۔ زبیدہ کو شمع پر روز سے کچھ زیادہ تاؤ آیا لیکن وہ حسبِ معمول خاموش رہی۔

عبدالرحمٰن چلے گئے، ناشتے سے فارغ ہو کر زبیدہ برآمدے میں پڑی چارپائی پر آن بیٹھی۔ آج تو اس کے گھٹنوں میں صبح سے ہی درد ہو رہا تھا۔ چند لمحوں بعد شمع بھی اس کے سامنے آ بیٹھی۔

''اماں آپ اس رشتے کے لیے انکار کر دیں۔'' شمع نے ماں سے نگاہیں چراتے ہوئے کہا تھا۔

زبیدہ حیران رہ گئی۔ دل تو اس کا چاہا کہ شمع کو اچھی خاصی سنا دے۔ اسے شمع سے اس بے شرمی کی توقع نہ تھی۔

''کیوں؟'' زبیدہ نے تحمل سے کام لیا تھا۔

پاکیزہ بھی کمرے سے نکل آئی اور دروازے کے فریم میں ایستادہ ہو گئی۔ پاکیزہ سے پیٹ میں بات نہ رہ سکی تھی۔ دو دن اس نے بہت کوشش کی کہ شمع کو نہ بتائے لیکن پھر بالآخر اس نے بتا ہی دیا۔

''بس ویسے ہی میں سعد سے شادی نہیں کرنا چاہتی؟''

''یہ ویسے ہی کا کیا مطلب ہے؟'' زبیدہ کا لہجہ کچھ ترش ہوا تھا۔

شمع نے نگاہیں اٹھا کر ماں کو دیکھا تھا۔ بے ساختہ اس کے ذہن میں آیا تھا کہ زبیدہ کے جوڑوں میں کس قدر درد رہتا ہے۔

زبیدہ شمع کو خشمگیں نگاہوں سے گھور رہی تھی۔

''میں......'' شمع نے توقف کیا تھا۔ چند سیکنڈز کا توقف۔ زبیدہ اس وقفے میں شمع کو گھورے گئی تھی اور دروازے کے فریم میں ایستادہ پاکیزہ کبھی ماں کی طرف دیکھ رہی تھی تو کبھی

شمع کی طرف۔

''میں کسی غریب سے شادی نہیں کر سکتی۔ میں تمام عمر غریب نہیں رہنا چاہتی۔'' ہمت کر کے شمع نے کہہ دیا۔ زبیدہ کو حیرت ہوئی بے تحاشہ حیرت۔ البتہ پاکیزہ نے کوئی ردِعمل نہیں دکھایا۔ یہ بات پاکیزہ شمع سے رات کو سن چکی تھی جب اس نے شمع کو رشتے کے بارے میں بتایا تھا۔

''اور کوئی بکواس کرنی ہے یا ختم۔'' زبیدہ نے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔

''یہ بکواس نہیں ہے، اماں میں سنجیدہ ہوں۔'' شمع نے جھنجلاتے ہوئے کہا تھا۔

''تیری سنجیدگی کا میں کیا کروں۔ میں نے تجھ سے نہ پوچھا ہے اور نہ مشورہ مانگا ہے، مجھے جو بہتر لگے گا وہی کروں گی۔ تو جا، اپنا کام کر اٹھ چل۔'' زبیدہ کے الفاظ کے ساتھ ساتھ لہجہ بھی ٹھنڈا تھا۔ برف جیسا ٹھنڈا۔

''لیکن اماں...... آپ میری بات سمجھتی کیوں نہیں، میں حسرتوں کے ساتھ نہیں جینا چاہتی۔ مجھے وہ ہر چیز چاہیے جس کی مجھے خواہش ہے۔''

شمع کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ زبیدہ کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

زبیدہ نے جانچتی نظروں سے بیٹی کو دیکھا تھا شمع اسے معمول سے زیادہ الجھی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''دیکھ بیٹا! جتنی چادر ہو اتنے ہی پاؤں پھیلاتے ہیں۔ ورنہ پاؤں ننگے ہو جاتے ہیں۔ غریب لوگوں کے لیے غریب لوگ ہی رشتے بھیجتے ہیں۔ اب کوئی شہزادہ تو نہیں آئے گا تجھے بیاہنے۔ تھوڑی سمجھداری سے کام لے۔ خود سوچ۔ اگر سعد کو انکار کر بھی دیتے ہیں تو بھی تو تجھے سعد جیسے مالی حالات رکھنے والے شخص کے ساتھ ہی شادی کرنی پڑے گی۔ پیسہ غریب لوگوں کی دسترس میں نہیں آتا غریب پیسے کی دسترس میں آتے ہیں اگر تیرے دل میں کوئی ایسی ویسی خواہش ہے بھی تو اسے دل سے نکال دے۔''

شمع نے زبیدہ کی بات خاموشی سے سنی۔ زبیدہ کے خاموش ہونے پر بھی وہ چند لمحے خاموش رہی۔ اضطراب بھری خاموشی۔ پھر وہ بولی۔

''لیکن اماں، میرے اختیار میں نہیں، میں یہ سب نہیں کر سکتی۔ مجھ سے کوئی کام نہیں ہوتا۔ جو کچھ بھی ہے میں یہ شادی نہیں کروں گی۔ آپ انکار کر دیں۔ یا اگر آپ کو یہ رشتہ اس قدر اچھا لگتا ہے تو پاکیزہ کی کر دیں۔''

شمع کا آخری جملہ سن کر پاکیزہ کا دل بڑی زور سے دھڑکا تھا۔

''پاکیزہ'' زبیدہ نے آواز لگائی تھی۔

''جی اماں!'' پاکیزہ فوراً سے بیشتر آگے بڑھی تھی۔

''اس پاگل کو لے جا میری آنکھوں کے سامنے سے خود تو پاگل ہے میرا بھی دماغ چاٹ جائے گی اور اس کے ذہن میں جو اول فول ہے اسے سمجھا دے۔ میں نے اور عبدالرحمٰن نے طے کر لیا ہے کہ اکبر اور شاداں کو ہاں کہہ دیں گے۔ چودہ پڑھ کے پر نہیں نکل آتے بندے کے جو یہ اپنے آپ کو کوئی اور مخلوق سمجھنے لگ گئی ہے۔ سعد کی پسند ہے۔ شاداں بڑے زور و شور سے کہہ کر گئی ہے کہ اس نے ہاں ہی سننا ہے اور ہم نے ہاں ہی کرنی ہے چاہے یہ کتنا ہی کیوں نہ سر مار لے۔ بات تو مہارانی ایسے کر رہی ہے کہ جیسے شہزادے انتظار میں لائن بنائے کھڑے ہیں۔ غریب ہی نصیب میں لکھا ہے۔ اچھی طرح سمجھا دے اس کو۔ اس کی باتیں سن کر میرا بھی جی خراب ہوتا ہے۔'' زبیدہ نے سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

شمع نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ پاکیزہ نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ ناچار شمع خاموش ہو گئی اور پاکیزہ شمع کو لے کر اندر آ گئی۔

''میں نے تجھے رات کو کہا تو تھا کہ یہ امیر ہونے کے خواب ترک کر دے کوئی معجزہ نہیں ہونا زندگی میں، سعد اچھا لڑکا ہے۔'' پاکیزہ نے شمع کے کندھوں پہ ہاتھ رکھا تھا جنہیں شمع نے دوسرے لمحے ہی جھٹک دیا۔

''تو میں نے کب کہا کہ سعد برا لڑکا ہے۔ تم تو کم از کم میری بات کو سمجھو میرا ایسے ماحول میں گزارا مشکل ہے جہاں کبھی کبھار نوبت یہاں تک آ جاتی ہے کہ کھانے کو بھی کچھ نہیں ہوتا۔ دل سمجھنے والی چیز تھوڑی ہے۔ بہت مشکل ہے یہ سب میں کبھی کسی غریب سے شادی نہیں کروں گی۔'' شمع کے لہجے میں کچھ ایسی بے چارگی تھی کہ پاکیزہ کو اس پر بے تحاشا پیار آیا۔

''دیکھ شمع ہم تیرے دشمن تھوڑی ہیں۔ ہر چیز کی حد ہوتی ہے۔ اب میں کہوں کہ مجھے چاند پہ جا کر رہنا ہے تو یہ ممکن ہے کہ ابا مجھے لے کر چاند پر رہنے چلے جائیں۔ ایسے خواب نہیں دیکھتے جن کی تعبیر نہ ہو۔''

''لیکن پاکیزہ تمہارے دل میں چاند پر رہنے کی خواہش ہے ہی نہیں۔ اس لیے تم یہ مثال نہ دو تو اچھا ہے اور جہاں تک خواب دیکھنے کی خواہش ہے تو میں یہ خواب برس ہا برس سے دیکھ رہی ہوں۔ اب مجھے اس کی تعبیر چاہیے بس مجھے پیسے چاہئیں۔ عیش و آرام چاہیے۔ ساری زندگی کام کر کے نہیں گزار سکتی میں۔'' کہتے کہتے شمع کی آواز بھر آئی۔

اور پاکیزہ نے اپنے آپ کو بے بس محسوس کیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آیا تھا کہ شمع کو کس طرح سمجھائے۔

❁❁❁

''تو تمہیں کیا مسئلہ ہے سعد کے رشتے میں؟'' ایک ایسا شخص شمع سے پوچھ رہا تھا۔ جس کی اس نے کبھی کوئی بات نہیں ٹالی تھی جس کی وہ دنیا میں سب سے زیادہ عزت کرتی تھی۔ عبدالرحمٰن خود شمع سے رشتے کی بابت پوچھ رہے تھے۔

شمع کا سر جھکتا چلا گیا۔

''بیٹا جو مسئلہ ہے مجھے تم خود بتاؤ۔ تمہاری ماں کے منہ سے تو میں سن چکا ہوں لیکن تم خود بتاؤ گی تو بہتر رہے گا۔'' عبدالرحمٰن کا لہجہ کس قدر پُرشفقت تھا۔ شمع کچھ بول نہ پائی۔

چند ثانیے عبدالرحمٰن شمع کے بولنے کا انتظار کرتے رہے لیکن جب وہ کچھ نہ بولی تو انہوں نے شمع کے سر پر ہاتھ رکھا۔ شمع کے سر کو تھپتھپایا تھا۔ شمع کو کس قدر اچھا لگتا تھا جب عبدالرحمٰن اپنا شفیق ہاتھ اس کے سر پر پھیرتے تھے۔ آج بھی اسے اچھا لگا تھا۔

''بیٹا ہم تمہارا بھلا ہی چاہیں گے۔ سعد اچھا لڑکا ہے۔ پیسے کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن پیسوں اور انسانوں کو ایک ترازو میں نہیں تولنا چاہئے۔ سعد کے لیے ہاں کہہ دو۔ وہ تمہیں خوش رکھے گا۔ اعتماد کرو مجھ پر میں تمہارا بھلا ہی چاہوں گا۔ یا مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔'' عبدالرحمٰن کہتے ہوئے مسکرائے تھے۔

باپ کے الفاظ تھے یا کچھ اور شمع کا جھکا سر ایک لمحے میں اٹھا تھا۔ اس نے باپ کو دیکھا تھا۔ کالی داڑھی اب مکمل طور پر کالی نہیں تھی۔ اس میں اچھی خاصی سفیدی در آئی تھی۔

''ابو مجھے آپ پر اعتماد ہے، مجھے سعد کا رشتہ منظور ہے۔'' شمع نے کہا تھا اور باپ کے سامنے سے اٹھ کر اندر آ گئی تھی۔

پلکوں کی باڑ کو توڑ کر چند آنسو نکلے تھے اور چہرے پر پھسلتے چلے گئے تھے۔ ایک طرف سرکش ہوتے جذبات تھے جو پیسے اور عیش کا سامان مانگتے تھے۔ دوسری طرف باپ تھا۔ جو کہتا تھا مجھ پر اعتماد کرو۔ ایسی صورت میں باپ کا مان ہی رکھنا تھا۔ جیسا کہ شمع رکھ آئی تھی۔

کبھی کبھی رشتے بھی آزمائش بن جاتے ہیں۔ اس بات کا پہلی بار ادراک شمع کو آج ہوا تھا اور یہ ادراک کافی تلخ تھا۔

❁❁❁

ایک کے بعد دوسرا دھچکا شاید اس کے لیے تیار تھا۔ ابھی تو اس نے کاغذ کے ٹکڑوں کو چنا

تھا جو کچھ دیر پہلے ایک خط کا حصہ تھے۔ طلاق کے مطالبے والا خط۔

آنکھیں خشک نہیں ہوئی تھیں لیکن اس نے زبردستی آنسو پونچھ لیے تھے پانی پیا تھا تاکہ مزید رونا نہ آئے اور اب فیصل آیا تھا۔ روتا ہوا۔

ماں پوچھتی رہی کہ کیا ہوا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ماں نے ساتھ لپٹایا تو بھی روتا رہا۔ پھر اٹھ کر اپنے صندوق سے ایک سوٹ نکال لایا اور غسل خانے میں نہانے چلا گیا۔ ہلکے سبز رنگ کے دروازے والے غسل خانے میں اس نے نہانے میں کافی دیر لگائی تھی۔

ماں کو ہول سا اٹھنے لگا تھا۔ ذہن میں اخباروں میں پڑھی ہوئی چند ایک خبریں گھومنے لگیں خوف بڑھتا چلا گیا۔

فیصل غسل خانے سے نکلا تو وہ تیر کی سی تیزی سے غسل خانے میں گئی۔ فیصل کے کپڑوں کو ٹٹولا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اگر اس کا شک غلط نکلا تو وہ گیارہ سالہ معصوم بچے کے ننھے ذہن کو کس طرح مطمئن کرے گی لیکن اس کا شک صحیح نکلا تھا..... بیٹے کو ساتھ لپٹا کر وہ خود بھی رودی۔

رونے کا کام گھنٹے سے بھی زیادہ جاری رہا۔ درمیان میں اس نے فیصل کو پیار بھی کیا تھا۔

''میرا بچہ!'' روتے ہوئے فیصل کو روتی ہوئی ماں نے یہی کہہ کر پیار کیا تھا۔

آخر اس نے اپنے آنسوؤں کو صاف کیا اور فیصل کے آنسوؤں کو بھی پونچھا۔

خود پانی پیا اور فیصل کو بھی پلایا۔

گھر کے باہر کا دروازہ بند کیا۔ کنڈی لگائی اور فیصل کو لے کر اندر کمرے میں گئی۔

دوسرے کمرے میں جو صندوق پڑا تھا اس صندوق میں سے اس نے سال خوردہ لکڑی کی صندوقچی نکالی۔ صندوقچی کو کھولا اور اس میں موجود زیور فیصل کو دکھایا۔

تین لڑا ہار، چار سونے کی چوڑیاں، دو بڑی بڑی کانوں کی بالیاں اور ایک عدد پیارا سا جھومر۔

''بیٹا کل ملا کر بارہ تولے سونا ہے۔ میری شادی کے وقت سونے کا جو مول تھا۔ اب اس سے تین گناہ ہو گیا ہے۔ اگر سونا اسی طرح بڑھتا رہا تو یہ تیری پڑھائی کا خرچ اٹھانے کے لیے بہت ہے۔ تُو بس دل لگا کر پڑھ۔ ڈاکٹر بننے کے لیے اسی کو بیچ کر تیری فیس بھروں گی۔ بارہ تک تو ویسے بھی گورنمنٹ سکول کی فیس بہت کم ہے۔ آئندہ تُو نے کسی کام کے لیے نہیں جانا..... میرا لعل۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

فیصل کو بھی اس نے پیار کیا تھا۔

فیصل کو اب پھر رونا آ رہا تھا لیکن وہ رونا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ رونا یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ کمزور ہے۔ جب کہ اس نے ابھی ابھی تہیہ کیا تھا کہ اسے مضبوط بننا ہے۔

❁❁❁

سعد کافی خوش تھا۔ اس کے انداز بھی کافی پُر جوش سے تھے۔

وہ اور شعیب بس دو لوگ ہی گھر میں تھے۔ باقی سب لوگ عبدالرحمٰن صاحب کی طرف گئے تھے۔ ''ہاں'' سننے کے لیے۔

پرسوں جب خالہ زبیدہ آئی تھی تو انہوں نے سعد کو بلا کر شفقت سے اس کے کندھوں کو تھپتھپایا تھا۔ اشاروں میں رشتے کی رضا مندی بھی ظاہر کر گئی تھیں اور اب اکبر، شاداں، مزمل اور صوفیہ ان کے گھر گئے تھے۔ جانا تو سعد بھی چاہتا تھا لیکن ان کے ہاں بات پکی ہونے سے پہلے جانے کا رواج نہ تھا۔

وہ بے چینی سے ان لوگوں کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

شعیب نے بھائی کے پُر جوش انداز دیکھے تو مسکرا دیا۔

''سعد میں ذرا باہر جا رہا ہوں، آدھے گھنٹے تک آ جاؤں گا۔'' شعیب نے کہا تھا۔

پانچ سال کے فرق کے باوجود سعد کو نام لے کر مخاطب کرتا تھا۔

''ہوں۔'' سعد نے اس کی بات کو بے دھیانی سے سنا تھا۔ اس وقت وہ جس دھیان میں تھا۔ اس سے اپنی توجہ نہیں ہٹانا چاہتا تھا۔ شعیب چلا گیا اور سعد برآمدے میں پڑی چارپائی پر لیٹ گیا۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔ وہ چھت کو تکتا رہا۔

''السلام علیکم'' نسوانی آواز نے اسے متوجہ کیا تھا۔

اس نے دیکھا اور اٹھ بیٹھا۔ بہت زیادہ حیران ہوا۔ شمع کے اس وقت یہاں آنے کی اسے توقع تو نہیں تھی۔

''وعلیکم السلام'' کہیں خواب تو نہیں، سلام کا جواب دیتے ہوئے اسے خیال گزرا تھا لیکن ساتھ ہی اسے احساس ہو چکا تھا کہ یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔

وہ بری طرح سٹپٹا ہوگیا۔

''آ آ...... آپ آیئے بیٹھیے۔'' اس نے شمع کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ ساتھ ہی اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ اس وقت گھر میں اکیلا ہے۔ اس وقت شمع کا یوں گھر میں ہونا ٹھیک نہیں۔

شمع اسے گھبرائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

کچھ جھجکتے ہوئے وہ پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''کیسی ہیں آپ؟'' ہر دم جنہیں اپنے آس پاس محسوس کیا جائے اور جب وہ حقیقتاً آس پاس موجود ہوں تو سمجھ نہیں آتا کہ بندہ کیا کرے۔ سعد کو بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

شمع نے شاید سنا بھی نہیں تھا کہ سعد نے اس کا حال احوال دریافت کیا ہے اور اگر سنا بھی تھا تو اس نے دھیان نہیں دیا تھا۔

ایک گھبرائی ہوئی نظر اس نے صحن پر ڈالی تھی جو صحن کو پار کرتی ہوئی داخلی دروازے تک جاتی تھی۔ جیسے اسے خوف ہو کہ کوئی آ نہ جائے۔

''میں...... میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک نظر داخلی دروازے پر ڈالی تھی اور ایک نظر سعد کو دیکھا تھا۔

''نین نقش تو اچھے ہیں۔'' سعد کو دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں آیا تھا۔

سعد کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ اسے توقع نہ تھی۔

اس سے پہلے کہ سعد کچھ سوچتا اور بولتا۔ شمع ہی بول اٹھی۔

''میں اپنے گھر والوں کو انکار نہیں کر سکتی۔ آپ کے پاس امید لے کر آئی ہوں۔ آپ پلیز......'' اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔

خاموش ہوتے ہی اس نے داخلی دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ کوئی نہیں آ رہا تھا۔ شمع کا دل بڑی زور سے دھڑک رہا تھا۔

''آپ مجھ سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں؟'' بمشکل سعد نے پوچھا تھا۔ اسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا تھا۔

اس سوال کا جواب دینا مشکل تھا لیکن شمع سوچ کر آئی تھی کہ وہ شادی نہ کرنے کی وجہ بتا کر آئے گی۔

''کیوں کہ......'' شمع کو کہنے کے لیے ہمت چاہیے تھی۔ اس لیے اس نے توقف کیا تھا۔ ''کیونکہ...... میں کسی امیر آدمی سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ جہاں شادی کے بعد مجھے کوئی کام نہ کرنا پڑے۔ کام کرنے کے لیے نوکروں کی لائن ہو، مجھے آسائشیں چاہئیں۔'' اپنی منہ زور خواہشات کے بارے میں بتانا آسان نہیں ہوتا لیکن شمع اس شادی سے بچنے کے لیے یہ بھی کر رہی تھی۔

سعد کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

''میں...... آپ کو ہر طرح کی آسائش مہیا کروں گا...... جیسی آپ کی خواہش ہے، میں وعدہ کرتا ہوں۔''

شمع، سعد کی بات سن کر مسکرا دی۔ سعد کو یہ مسکراہٹ طنزیہ محسوس ہوئی۔

''کہاں سے آپ مجھے آسائشیں اور نوکر چاکر مہیا کریں گے؟ کہاں سے گاڑی اور بنگلہ آئے گا؟ کہاں سے؟''

''کماؤں گا، محنت کر کے لاؤں گا یہ سب چیزیں۔''

شمع مسکرا دی۔ سعد کو اس بار مسکراہٹ میں طنز پہلے سے زیادہ محسوس ہوا تھا۔

''میں امید لے کر آئی ہوں۔ آپ پلیز اس رشتے سے منع کر دیں۔''

''اگر میں منع نہ کروں تو......''

''تو...... تو مجھے تمام زندگی سمجھوتے کے ساتھ گزارنی پڑے گی لیکن مجھے امید ہے کہ آپ منع کر دیں گے۔''

شمع اٹھ کر جانے لگی ابھی اس نے دو قدم ہی بڑھائے تھے کہ سعد کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

''میں آپ سے بے حساب محبت کرتا ہوں۔''

شمع کے قدم رک گئے۔ اس نے پلٹ کر سعد کو دیکھا تھا۔

''میں آپ کی محبت کی قدر کرتی ہوں لیکن ایک بات بتا دوں کہ اکیلی محبت سے میرا گزارا نہیں ہوتا۔''

شمع کے الفاظ نے سعد کے دل کو جیسے مٹھی میں لے لیا تھا۔

اب کے بار شمع نے پانچ قدم بڑھائے تھے کہ سعد بولا تھا۔ یہ الفاظ دراصل اس کے ترکش میں موجود آخری تیر تھا اور وہ اس تیر پر انحصار کرتا تھا۔

''آپ کے بغیر میں زندگی نہیں گزار سکتا۔''

شمع کے قدم رک گئے۔ اس بار اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ صرف گردن موڑ کر بولی تھی۔

''وہی تو...... میں بھی صرف زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔'' یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے چلتی صحن پار کر کے باہر چلی گئی۔

سعد نے اپنے آپ کو تہی داماں محسوس کیا تھا۔

''شمع۔'' اس کے منہ سے گھٹا گھٹا لفظ نکلا تھا۔ ساتھ میں آنکھوں سے گرم گرم آنسو بھی نکلے تھے۔

❁❁❁

بہت سے لڑکوں نے فیصل کو گھیرا ہوا تھا۔

اوور آل (وائٹ کوٹ) پہنے ہوئے اور Dissector سینے سے لگائے اس کے چہرے پر وہی احمقانہ تاثرات تھے جو کہ ایک فرسٹ ائیر کے سٹوڈنٹ کے چہرے پر پہلے دن عام طور پر ہوتے ہیں۔

آج کی کلاس انٹروڈکشن کی کلاس تھی۔ ٹیچر نے صرف اپنا تعارف کروایا تھا۔ تین سو کی کلاس سے انٹروڈکشن لینا حماقت تھی اور یہ حماقت کوئی ٹیچر نہیں کرتا تھا۔

دور دور تک پھیلا میڈیکل کالج، آخر فیصل میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میڈیکل کالج اتنا بڑا تھا کہ فیصل سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ہر ڈیپارٹمنٹ دوسرے سے کافی زیادہ فاصلے پر تھا۔

کالج آف ہونے کے بعد بھی وہ کچھ دیر لیکچر تھیٹر میں بیٹھا رہا تھا اور لیکچر تھیٹر کے در و دیوار کو دیکھتا رہا تھا۔ لیکچر تھیٹر میں بیک وقت تین سو طلبا بہ آسانی آ سکتے تھے اور یوں کچھ دیر کے لیے لیکچر تھیٹر میں بیٹھنا اس کے لیے مشکل لے آیا تھا۔ چند سینئرز طلباء نے اسے پکڑ لیا تھا اور اسے ایک گراسی پلاٹ میں لے آئے تھے اور اب انہوں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ وہ لڑکے اس کی فولنگ کرنے کے لیے کمر کس چکے تھے۔

''ہاں تو بیٹا جی یہ اوور آل اتار دو۔'' ایک منچلے نے کہا تھا۔

فیصل اوور آل اتارنا تو نہیں چاہتا تھا لیکن اتنے سارے لڑکوں کے سامنے وہ بے بس تھا۔ اس نے اوور آل اتار دیا۔

''چل بیٹا جی شرٹ بھی اتار دے اب...... شرمانا نہیں۔'' ایک اور منچلے نے اپنے سامنے والے کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

فیصل کا دماغ گھومنے لگ گیا۔ شرٹ اتارنے پر اسے سخت اعتراض تھا۔

''نہیں یہ شائستگی کے خلاف ہے۔'' فیصل نے ٹھوس لہجے میں کہا تھا۔

''اوہ، تو کل کے بچے ہمیں شائستگی سکھائیں گے۔ چل بیٹا جو کہا ہے وہ کر، زیادہ ٹر ٹر نہ کر۔''

ایک مضبوط جسم کے مالک لڑکے نے دائیں ہاتھ کا مکا بناتے ہوئے کہا تھا۔ اس لڑکے کو ایک نظر دیکھنے سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے جم کرتا ہے۔

''لیکن......'' فیصل ابھی کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ وہی مضبوط جسم والا لڑکا آگے بڑھا۔

''اے...... تیری تو، ہم جتنی شرافت دکھا رہے ہیں، تُو اتنا ہی پھیل رہا ہے۔ چل سیدھی طرح شرٹ اتار، جو کہا ہے کر۔'' یہ کہہ کر اس لڑکے نے خود ہی کھینچ کر فیصل کی شرٹ پینٹ سے باہر نکالی اور بٹن کھولنے لگ گیا۔

فیصل کا ہاتھ مزاحمت کے لیے آگے بڑھا تھا لیکن پھر اس نے دانستہ طور پر پیچھے کر لیا۔ مزاحمت نے کام بگاڑنا تھا۔ اس لڑکے نے آخری بٹن کھولنے کے لیے شرٹ کو اس بے دردی سے کھینچا کہ وہ بٹن ہی ٹوٹ گیا۔

اگلے لمحے فیصل کی شرٹ اس لڑکے کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے اپنے بازو کے گرد شرٹ کا رول بنا لیا تھا۔

اب فیصل بنیان اور شرٹ میں ملبوس ان لڑکوں کے سامنے کھڑا تھا۔ فیصل نے شکر ادا کیا کہ وہ لڑکے اسے ذرا دور گراسی پلاٹ میں لے آئے تھے۔ جہاں کسی راہ گیر کی نظر کم ہی پڑتی تھی۔

''کیا خیال ہے بنیان اتروا لیں۔'' پیچھے سے آواز آئی تھی۔

''نہیں، نہیں بس کافی ہے، لڑکا شریف محسوس ہوتا ہے۔'' اسی لڑکے نے کہا تھا جس کے ہاتھ میں فیصل کی سفید شرٹ تھی۔ وہ لڑکا بھی شاید کسی وجہ سے باقی لڑکوں پر برتری رکھتا تھا کہ باقی لڑکے اس کے سامنے دبے دبے محسوس ہوتے تھے۔

کسی نے دوبارہ بنیان اتروانے کی بات نہیں کی اور فیصل نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا۔

''چل بیٹا!! اب اپنا تعارف کروا۔ ہر فقرے سے پہلے تو نے کہنا ہے لپ اسٹک لگا کے۔'' اس لڑکے نے کہا تھا۔

''جیسے میرا نام ایکس ہے لپ اسٹک لگا کے...... سمجھ آئی نا۔'' ساتھ والے لڑکے نے فیصل کو سمجھایا تھا۔

فیصل نے انٹر کے دوران اس قسم کی فولنگ کے قصے سن رکھے تھے اور اب وہ خود پھنسا ہوا تھا۔

ایک ٹھنڈی سانس بھرنے کے بعد فیصل نے مطلوبہ اضافے کے ساتھ اپنا تعارف کروایا تھا۔

''میرا نام محمد فیصل ہے لپ اسٹک لگا کے، میں اسی شہر کا رہائشی ہوں لپ اسٹک لگا کے، میں نے ڈی پی ایس سے میٹرک کا امتحان پاس کیا لپ اسٹک لگا کے، میں نے گورنمنٹ ایمرسن کالج سے ایف ایس سی کی لپ اسٹک لگا کے، اور آج میرا میڈیکل کالج میں پہلا دن ہے لپ اسٹک لگا کے، اور میرا مستقبل میں ایک اچھا سرجن بننے کا ارادہ ہے لپ اسٹک لگا کے۔''

فیصل نے اپنا تعارف مکمل کیا تو سب لڑکے تالیاں بجا کر خوش ہونے لگے۔ جیسے دو تین سال کے بچے چابی والے کھلونے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں۔

''یار جی ایم بڑا مزا آیا، اب کچھ اور۔'' ایک لڑکے نے اس لڑکے کو مخاطب کیا تھا جس کے ہاتھ میں فیصل کی شرٹ تھی۔

''ہاں! ہاں کیوں نہیں لیکن بچہ بڑا شریف ہے اسی لیے تھوڑی رعایت دیتے ہیں۔'' اس لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

پھر اس لڑکے نے ایک لڑکے کو فیصل کی شرٹ پکڑائی اور آنکھ مارتے ہوئے اس لڑکے سے کہا کہ بچے کو شرٹ پہناؤ۔

لڑکے نے فیصل کو شرٹ پہنائی لیکن الٹی بٹن پیچھے کی طرف تھے۔ یہاں تک کہ اس نے بٹن بھی پیچھے کی طرف بند کر دیے۔

اب فیصل الٹی شرٹ پہنے کھڑا تھا۔

''چلو بیٹا جی، اب آپ جا سکتے ہو لیکن اونچی آواز میں یہ کہتے جانا۔ فرسٹ ایئر فول۔ فرسٹ ایئر فول۔ مین گیٹ تک تم نے ایسے ہی جانا ہے۔ خبردار کوئی ہوشیاری نہیں کرنی۔ بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کرنا۔ آخر تم نے لوٹ کر تو یہیں آنا ہے۔''

فیصل نے لب بھینچے تھے اور فرمانبرداری سے ایک ہاتھ میں اوور آل لیے گراسی پلاٹ سے نکل کر مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ مین گیٹ کے اوپر لکھا EXIT دور سے پڑھا جا رہا تھا۔

''فرسٹ ایئر فول۔'' فیصل نے کہا تھا۔

''اونچی آواز میں۔'' وہ لڑکے فیصل کے پیچھے آ رہے تھے۔

''فرسٹ ایئر فول۔'' فیصل نے اونچی آواز میں کہا تھا۔

فلک شگاف قہقہے سنائی دیے تھے۔

وہ لڑکے فیصل کو مین گیٹ تک چھوڑ آئے تھے۔

مین گیٹ پر پہنچ کر فیصل نے دوبارہ واپس اندر آنے کی کوشش کی تھی۔ تا کہ کسی جگہ پر رک کر شرٹ سیدھی پہن لے لیکن کچھ فاصلے پر کھڑے لڑکوں نے اسے اشاروں سے خبردار کیا تھا کہ واپس آنے کی صورت میں اسے اپنے آپ کو مزید درگت کے لیے تیار کر لینا چاہیے۔

ناچار وہ باہر آ گیا۔

اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ فٹ پاتھ پر صرف ایک مرد راہ گیر کے علاوہ کوئی نہیں تھا اور ساتھ موجود سڑک پر موجود جم غفیر ٹریفک میں یقیناً نہ کوئی اسے جانتا تھا اور نہ ہی کوئی اس کی طرف متوجہ تھا۔

بڑی مشکل سے اس نے بٹن کھولے اور آناً فاناً شرٹ سیدھی پہنی۔ اس دوران وہ شخص پاس سے گزرا تھا۔ اس نے فیصل کو عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔ فیصل کو مزید کوفت ہوئی تھی۔

''شرافت کا تو دور ہی نہیں ہے۔'' برا منہ بناتے ہوئے فیصل نے سوچا تھا اور اوور آل اور Dissector کو سنبھالتے ہوئے چل دیا تھا۔

❂❂❂

''شمع کی بچی کہاں چلی گئی تھی تم؟ کہاں سے آ رہی ہو؟ اماں مہمانوں کے ساتھ بیٹھی تمہیں بلا رہی ہیں اور تم پتا نہیں کہاں سیر کو روانہ ہو گئی تھی۔ کچھ تو لحاظ کرو چلو آؤ مرو اب کچن میں۔'' ادھر شمع داخلی دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی، اُدھر لیٹرین میں شمع کی تلاش میں جھانکتی پاکیزہ کی نظر اس پر پڑی تھی اور وہ شمع کی طرف آئی تھی۔

کچن میں آ کر پاکیزہ چائے کے برتن سیٹ کر رہی تھی کہ اچانک وہ شمع سے مخاطب ہوئی تھی۔

''کہاں گئی تھی تم؟''

''کک کہیں نہیں۔''

پاکیزہ نے ایک بھرپور نظر شمع کے چہرے پر ڈالی تھی اور پھر تاسف سے بولی تھی۔

''سعد سے مل کر آ رہی ہو۔ اسے کہہ آئی ہو کہ وہ رشتے سے منع کر دے۔''

''نن نن...... نہیں!''

''جھوٹ مت بولو۔'' پاکیزہ کا لہجہ ٹھنڈا تھا۔

شمع نے سر جھکا لیا۔

پاکیزہ نے ایک افسوس بھری نظر شمع پر ڈالی تھی۔

''تمہارا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ پتا نہیں عقل کو کہاں گم کر دیا ہے۔'' پاکیزہ نے ٹرے میں چینی دان رکھا تھا اور ٹرے شمع کو پکڑا دیا تھا۔

''لو اب اسے اندر لے جاؤ اور خدارا اور کوئی گڑبڑ نہ کرنا۔ ابو بھی بیٹھے ہیں۔'' پاکیزہ نے شمع کا دوپٹہ ٹھیک کیا تھا اور اسے اندر کی طرف روانہ کیا تھا۔

رات کو وہ دونوں سونے کے لیے جب پاس پاس پڑی چارپائیوں پر لیٹی تھیں تو پاکیزہ نے شمع سے پوچھا تھا۔

''تم سعد کے پاس کیوں گئی تھیں؟ پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔'' آواز مدہم تھی مبادا کچھ فاصلے پر لیٹے عبدالرحمٰن اور زبیدہ سن نہ لیں۔

''بس ویسے ہی، مجھے بہتر لگا۔'' شمع ڈھٹائی سے بولی تھی۔

شمع کے انداز پر پاکیزہ کا پارہ لمحوں میں چڑھ گیا تھا۔

''پتا نہیں اتنی خودسر کیوں ہو تم، اب امی ابو ہمارے خیر خواہ نہیں ہیں جو تم ٹکر لیتی پھرتی ہو۔ اگر ایسا ہی تھا تو ابو کو انکار کر دیتی۔''

''ابو کو انکار نہیں کر سکتی۔''

''ہاں ابو کو انکار نہیں کر سکتی اور جا کر سعد کو داستانیں سنا سکتی ہو۔ اب کچھ سوچا ہے آگے کیا ہوگا۔''

سب کچھ سوچ سمجھ کر کیا ہے۔''

''سوچ سمجھ کر کیے کا یہ حال ہے، مجھے سمجھ نہیں آتا تمہیں کیسے سمجھاؤں۔'' پاکیزہ زچ ہو گئی۔

''تم سمجھانے کی زحمت نہ کرو اور سونے دو۔'' یہ کہہ کر شمع نے کروٹ لی اور پاکیزہ کی طرف پیٹھ کر لی۔

پاکیزہ نے کینہ توز نظروں سے شمع کی پیٹھ کو دیکھا تھا۔

''صبح امی کو بتاؤں گی، کارستانیاں تب ہی کچھ سدھرے گی۔'' یہ سوچ کر پاکیزہ نے آنکھیں بند کر لیں اور درود شریف پڑھنے لگی۔ وہ سوتے ہوئے درود شریف کا ورد ضرور کیا کرتی تھی۔

اور ساتھ لیٹی شمع دعا کر رہی تھی ''یا اللہ کسی طرح یہ رشتہ ٹل جائے۔ یا اللہ پلیز......''

❂❂❂

سب جاگ چکے اور ناشتہ بھی ہو چکا تھا۔ دھوپ بڑی تیزی سے آنگن میں پھیلنے لگی

تھی۔

لمبائی کے رخ میں چارپائیاں ابھی تک صحن میں پڑی ہوئی تھیں۔

''اُف اللہ آدھا دن گزر گیا ہے اور چارپائیاں ابھی تک صحن میں پڑی ہوئی ہیں کوئی آگیا تو کیا سوچے گا۔ کس قدر سُست لوگ ہیں۔'' پاکیزہ نے خود کلامی کی تھی اور چارپائیاں اندر رکھنے لگی تھی۔

بڑے بڑے لکڑی کے پائیوں والی چارپائی وہ کمر پر لادتی۔ دونوں بازو پھیلا کر چارپائی کو سہارا دیتی اور انہیں صحن سے لا کر برآمدے میں بچھا دیتی۔ اس طرح اس نے تین چارپائیاں برآمدے میں بچھائیں اور چوتھی کو ہال کمرے میں ڈال آئی تھی۔

اتنے میں شمع نے برتن دھو لیے۔ غائب دماغی کے ساتھ کل بات پکی ہوگئی تھی۔ مٹھائی بھی کھلائی گئی تھی۔ شاداں نے برفی کا ٹکڑا شمع کے منہ میں دیا تھا۔ شمع چہرے پر نمائشی مسکراہٹ بھی نہ سجا پائی تھی۔

''شمع برتن دھو لیے ہیں تو مشین لگا لے، کتنے دنوں کے کپڑے اکٹھے ہوئے پڑے ہیں۔'' زبیدہ نے برآمدے میں بیٹھے ہوئے آواز لگائی تھی۔

شمع نے بے دلی سے دھلے برتن ٹوکری میں رکھے تھے۔

کچھ دنوں تک شادی کے لیے باقاعدہ تاریخ رکھنے کے لیے اکبر اور شاداں نے رشتہ داروں کے ساتھ آنا تھا۔

''کیا یہ رشتہ ختم ہو جائے گا'' یہ سوچتے ہوئے شمع کچن سے برآمدے میں آئی تھی۔

''اور مشین لگانا'' یہ سوچ کر وہ بدمزہ ہی ہوئی تھی۔

زبیدہ چارپائی پر بیٹھی تھی۔ چائے کا پیالہ ہاتھ میں پکڑے۔ گرمی ہو یا سردی وہ ناشتے کے بعد چائے ضرور پیتی۔ کھلے منہ والے پیالے میں چائے پینا اسے زیادہ مرغوب تھا بہ نسبت تنگ منہ والے کپ میں۔

''اماں کل مشین لگا لیں گے۔'' شمع نے ماں سے کہا تھا۔ لہجے میں التجا تھی۔

زبیدہ کو شمع کی ٹال مٹول بری لگی تھی لیکن اس نے اسے ڈانٹا نہیں۔ پاس بلایا تھا، ساتھ بٹھایا تھا اور سمجھانے کے لیے بولی تھی۔

''شمع تھوڑی سی ذمہ دار ہو جاؤ۔ اس طرح کب تک چلے گا۔ چست رہا کرو۔ اب تو تمہاری شادی ہونے والی ہے۔''

شمع نے ماں کی بات چپ چاپ سنی تھی کچھ دیر چپ بیٹھی رہی اور ''ہوں'' کہہ کر اٹھ

گئی۔ صحن میں جھاڑو دیتی پاکیزہ نے شمع کے انداز غور سے نوٹ کیے تھے۔

''تھوڑی دیر تک اماں کو اس کی کل والی داستان بتاتی ہوں۔'' جھاڑو پھیرتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

شمع نے کچن کی صفائی کر لی۔

سبزی وغیرہ لینے زیادہ تر زبیدہ خود جاتی تھی۔ عبدالرحمٰن کے پاس وقت نہ ہوتا تھا لیکن آج زبیدہ نے شمع کو پیسے پکڑائے تھے۔

''آدھا کلو مرغے کا گوشت لے لینا، فارمی۔ سلیم چاچے سے لینا۔ اسے کہنا سینے والا دے۔ سینے والے گوشت میں زیادہ بوٹیاں چڑھتی ہیں۔ گرم مصالحہ اور ہلدی بھی توقیر سے لیتی آنا اور چادر اوڑھ کر جاؤ۔ دوپٹے میں جانا ٹھیک نہیں۔'' زبیدہ نے کہا تھا۔ محلے میں دکانیں ہونے کی وجہ سے وہ دکانداروں کے ناموں سے اچھی طرح واقف تھی۔

شمع نے کھونٹی سے کالی چادر اتار کر اوڑھی اور دوپٹا کھونٹی پر ہی ٹانگ دیا۔

کوئی کام کرنے کا دل نہیں کر رہا تھا لیکن مجبوری تھی۔ عبدالرحمٰن کے کہے الفاظ ابھی بھی ذہن میں گونج رہے تھے۔

''اعتماد کرو مجھ پر میں تمہارا بھلا ہی چاہوں گا۔''

''پیسوں اور انسانوں کو ایک ہی ترازو میں نہیں تولنا چاہیے۔''

''سعد اچھا لڑکا ہے۔''

شمع نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

''کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہم بہت امیر ہوتے یا پھر مجھے ایسے امیر ہونے کی خواہشات نہ ہوتیں۔''

شمع نے سوچا تھا اور چادر کو کھینچ کر تھوڑا سا ماتھے پر لے آئی تھی اور ماں کو سلام کر کے باہر چلی گئی۔

سلیم چاچے سے گوشت لیا۔ سینے والا گوشت۔ سلیم چاچے کی دکان کو دس سال ہونے والے تھے۔ وہ اس محلے کے رہائشی نہیں تھے۔ سائیکل پہ آتے جاتے تھے۔ تمام اہل محلّہ ان کی عزت کرتے تھے۔

''توقیر بھائی ہلدی دینا۔'' اس نے کاؤنٹر پر پیسے رکھے تھے، ہلدی لے کر دو گرم مصالحے کے پیسے دیتی اور گرم مصالحہ لیتی۔

''السلام علیکم'' دو گھنٹوں کے انتظار کے بعد بالآخر شمع آ ہی گئی تھی۔

ان دو گھنٹوں میں سعد یہی سوچتا رہا تھا کہ شمع آئے گی یا نہیں۔ شمع کچھ ایسی کھوئی ہوئی تھی کہ اس نے دھیان بھی نہ دیا کہ کون بیٹھا ہے۔

''وعلیکم السلام۔'' شمع نے سنبھل کر جواب دیا تھا۔ اسے سعد کو دیکھ کر اطمینان ہوا تھا۔

قدرت نے اسے ایک اور موقع فراہم کیا تھا۔

''میں دو منٹ میں اندر سے ہلدی لے کر آتا ہوں۔'' توقیر جان بوجھ کر دکان کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ وہ سعد کا دوست تھا اور اس نے جان بوجھ کر انہیں موقع فراہم کیا تھا۔ اپنے تئیں دوستی کا حق ادا کیا تھا۔

''دو منٹ۔'' سعد کو اپنا سر بھاری ہوتا محسوس ہوا تھا۔ زندگی کا تعین دو منٹ میں ہونا تھا۔

ویسے اسے لگا تو ایسے تھا جیسے وہ کل ہی بازی ہار چکا ہے لیکن وہ پھر بھی ایک اور کوشش کرنا چاہتا تھا۔ اس موہوم سی کوشش سے اسے امید وابستہ تھی ویسی امید جیسی کل شمع لے کر اس کے پاس آئی تھی۔

''بات زور زبردستی کی نہیں، آپ میرا اعتبار کریں، میں وعدہ کرتا ہوں میں آپ کو ہر قسم کی سہولت مہیا کروں گا۔ آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔'' زندگی جارہی ہو تو عزت اور انا کا خیال نہیں کرنا چاہئے۔ سعد بھی یہی کر رہا تھا۔

''وعدہ اور اعتبار'' یہی دو الفاظ تھے۔ الفاظ تھے یا جذبات۔ جذبات تھے یا جھوٹی تسلیاں۔ شمع کو سمجھ نہ آیا کہ انہیں کس چیز سے تعبیر کرے۔

''بات اعتبار کی نہیں سعد، سچ بتاؤں تو مجھے یہ جھوٹی تسلیاں لگتی ہیں۔ ایسا کون سا قارون کا خزانہ ہاتھ آجائے گا شادی کے بعد کو گاڑی اور بنگلہ خریدا جاسکے گا۔ اب آنکھیں بند کر کے تو اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ میں اگر آپ سے تعلق قائم کر بھی لیتی ہوں تب بھی سچ یہی ہے کہ میں کبھی خوش نہیں رہ سکوں گی۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں نا۔'' شمع کا لہجہ ترش تھا۔ تیزاب کی طرح۔ سعد کو اپنا آپ جلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

''میں آپ سے بے تحاشہ محبت کرتا ہوں آپ کے بغیر میں خوش نہیں رہ سکتا۔'' سعد کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

سامنے دیوار کو دیکھتی شمع نے نظریں اٹھا کر سعد کو دیکھا تھا۔ سعد ٹوٹ کر بکھرنے کو تیار تھا۔ شمع کو سعد سے صرف ہمدردی ہوئی تھی۔ اب اس ہمدردی کی لپیٹ میں وہ اپنی ساری زندگی تو نہیں دے سکتی تھی۔

''میں نے کل بھی آپ سے کہا تھا کہ صرف محبت سے میرا گزارا نہیں۔'' شمع کے الفاظ سن کر سعد کو آج بھی اتنی تکلیف ہوئی تھی جتنی کل ہوئی تھی۔

ابھی وہ مزید بے عزت ہونے کے لیے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ توقیر اندر سے آگیا۔ ہلدی تو ساتھ ہی پڑی تھی کاؤنٹر کے پاس۔ شمع کو تھیلی میں ہلدی ڈال کر دی۔

توقیر کی بھی اپنی مجبوری تھی۔ وہ ان کو زیادہ دیر تنہائی نہیں مہیا کرسکتا تھا اگر کوئی آجاتا تو وہ اور اس کی دکان دونوں بدنام ہو جاتے۔

''آپ کو میری بات سمجھ آئی ہوگی اور میں آپ سے امید رکھتی ہوں کہ آپ میری خواہش کا احترام کریں گے۔'' اس کی محبت کا تو احترام نہیں کیا تھا۔ اپنی خواہش کا احترام کرنے کا کہہ رہی تھی۔ یہ انسان بھی بڑا خود غرض ہوتا ہے۔

ہلدی کے بعد گرم مصالحہ لیا اور شمع چلی گئی۔

شمع کے جانے کے بعد توقیر نے سعد سے کچھ پوچھا تھا۔ سعد نے جواب نہ دیا اور چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔

''بے چارہ'' توقیر نے سعد کو لقب سے نوازا تھا۔ اندرونی حصے سے اس نے ان دونوں کی گفتگو کا بیشتر حصہ سنا تھا۔

گھر پہنچنے تک شمع کا ذہن مفلوج ہی رہا۔ چادر کھونٹی پر ٹانگی، دوپٹہ اتار کر گلے میں ڈالا۔ گھڑے سے پانی بھرا۔ گلاس لے کر برآمدے میں ماں کے پاس آبیٹھی۔ زبیدہ نے خونخوار نظروں سے دیکھا تھا۔ ساتھ والی چارپائی پر پاکیزہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

شمع ابھی پانی کا گھونٹ لے ہی رہی تھی کہ زبیدہ نے پوچھا تھا۔

''تو کل سعد سے مل کر آئی ہے اور اس سے بکواس کر آئی ہے۔''

پانی کا گھونٹ شمع کے حلق میں پھنس گیا۔ اسے امید نہ تھی کہ پاکیزہ یہ سب زبیدہ کو بتا دے گی۔

پانی کا گلاس اس نے منہ سے علیحدہ کیا ہی تھا کہ زوردار تھپڑ اس کی گال پر پڑا تھا۔ گلاس دور جاگرا۔ زمین میں پانی فوراً جذب ہوتا گیا۔

''کرتوت دیکھے ہیں، خود بھی بدنام ہوگی ہمیں بھی کہیں کا نہیں چھوڑے گی۔ بہتر تھا کہ پیدا ہوتے ہی تیرا گلا گھونٹ دیتی۔'' زبیدہ نے بالوں کو پکڑا تھا۔ دو تین جھٹکے دیئے تھے۔ چہرہ اوپر کر کے دو تین تھپڑ بھی کس کر منہ پر لگائے تھے اور پھر زوردار دھکا دیا تھا۔ شمع چارپائی سے لڑکھڑا کر فرش پر آن گری تھی۔

آنکھوں میں آنسو آ گئے اور سامنے کا منظر دھندلا گیا۔ زبیدہ سخت غصے میں شمع کو لعن طعن کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ ہانپ بھی رہی تھی۔

''اس نحوست کو میری آنکھوں کے سامنے سے لے جا۔'' زبیدہ نے پاکیزہ سے کہا تو وہ میکانکی انداز میں اٹھی۔ شمع کو کندھوں سے پکڑ کر اندر ہال کمرے میں لے آئی۔ کمرے میں پہنچ کر شمع نے پہلے اپنے کندھوں سے پاکیزہ کے ہاتھ جھٹکے تھے۔ پھر آنکھوں سے آنسو صاف کیے تھے۔

''میں یہ سب نہیں چاہتی تھی، لیکن مجھے اماں کو بتانے کے سوا کوئی چارہ ہی نظر نہ آیا۔''

شمع نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ پاکیزہ کچھ لمحے نادم سی کھڑی رہی۔ پھر باہر ماں کے پاس آ گئی۔ شمع کے ساتھ کھڑا رہنا اسے فضول محسوس ہوا تھا۔

زبیدہ ہانپ رہی تھی۔ پاکیزہ نے اسے پانی پلایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ زبیدہ یہ بات ابھی عبدالرحمٰن کو نہ بتائے لیکن ماں کو یہ کہہ نہ سکی۔ ویسے زبیدہ خود بھی یہ عبدالرحمٰن کو بتاتے ہوئے شرمندہ ہوتی۔ اب عبدالرحمٰن کو بتانا ہے یا نہیں اس کا فیصلہ زبیدہ اب تک نہ کر سکی تھی۔ اسے کام بگڑتا محسوس ہوا تھا۔

رات کو باوجود کوشش کے زبیدہ عبدالرحمٰن کو نہ بتا سکی۔ اس سے بیٹی کی توہین ہوتی تھی۔ شوہر کی نظروں میں بیٹی کی توہین برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ خود سعد اور شاداں سے مل کر آتی ہے اگر صورتِ حال ٹھیک نہ ہوئی تو عبدالرحمٰن سے بات کرے گی۔

لیکن نہ تو شاداں کی طرف جانے کی نوبت آئی اور نہ ہی عبدالرحمٰن کو بتانے کی۔

پاکیزہ نے ساتھ پڑی چارپائیوں میں سے ایک پر لیٹی ہوئی شمع سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن شمع اس سے نہیں بولی تھی۔ پاکیزہ کی طرف پیٹھ کر کے لیٹ گئی تھی۔

شمع کے پاس یہ آخری موقع تھا۔ پاکیزہ سے بات کرنے کا۔ جو اس نے گنوا دیا اگلی صبح پاکیزہ کپڑے دھوتے ہوئے کرنٹ لگنے سے مر گئی تھی۔

شمع نے صبح ناشتہ نہیں کیا تھا۔ زبیدہ نے کچھ اس بے رخی سے چھابی اس کے سامنے رکھی تھی کہ ناشتہ کرنے سے دل اچاٹ ہو گیا۔

صحن کے بعد ہال کمرے میں وہ جھاڑو دے ہی رہی تھی کہ پاکیزہ برتن دھو کر اور کچن صاف کر کے، میلے کپڑے اکٹھے کرنے لگ گئی۔ پاکیزہ کی پھرتی سے شمع کو بلاوجہ چڑ ہوئی تھی۔

غسل خانے میں پڑی اسٹیل کی مشین کی تار کا ایک بڑا حصہ ننگا تھا۔ پلگ میں دینے کے لیے سوئچ بھی نہیں تھا۔ تاروں کو پلگ میں دیا جاتا تھا۔

مشین میں پانی بھرا تھا۔ کپڑے دھونے والے صابن کے چھوٹے ٹکڑے کیے۔ اسے بھی مشین میں ڈالا۔ کپڑے ڈالے اور باہر آ گئی۔

مشین کی ناب گھمانے کے لیے اس نے غسل خانے کے چکر بھی لگائے تھے۔ آخری بار وہ کپڑے مشین سے نکالنے گئی تھی۔ آخری بار جو وہ ہلکے سبز رنگ کے دروازے والے غسل خانے میں گئی تو پھر نہ آئی۔

شمع اس وقت توریاں کاٹ رہی تھی۔ جب زبیدہ نے اسے کہا تھا کہ پاکیزہ کو آواز دے کر بلاؤ۔

چار و ناچار اس نے پاکیزہ کو پکارا تھا لیکن کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

پھر اس نے چار پانچ بار مزید پاکیزہ کو آواز دی تھی لیکن جواب ندارد۔

''اونچی آواز میں کہو۔'' زبیدہ نے شمع سے کہا تھا۔

سو آخری بار اس نے حلق کے بل چیخ کر پاکیزہ کو پکارا تھا لیکن کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا۔

زبیدہ کے چہرے پر تاثرات بگڑ گئے تھے۔ خوفناک قسم کے تاثرات واضح تھے۔

''کمینی! کیا مر گئی ہے اندر، سن کیوں نہیں رہی، چل باہر آ کیا کپڑوں سے چپک گئی ہے۔''

زبیدہ نے اونچی آواز اور چیختے انداز میں کہا تھا۔ لفظ 'کمینی' وہ ذہنی انتشار کی موجودگی میں استعمال کرتی تھی۔

غسل خانے سے نہ تو کسی قسم کی آہٹ کی آواز آئی تھی اور نہ ہی پاکیزہ کی آواز ابھری تھی۔ شمع نے کوفت سے چھری کو توریوں سے بھری ٹوکری میں رکھا تھا جس میں سے وہ اٹھا کر توریاں کاٹ رہی تھی۔

''دیکھتی ہوں جا کر پتا نہیں کیا ہوا ہے، جواب ہی نہیں دے رہی۔'' شمع کے انداز میں کوفت ہی کوفت تھی۔

''نکمی اولاد میری قسمت میں لکھی ہوئی تھی۔'' زبیدہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی۔

شمع نے پاؤں انگوٹھے والی چپل میں پھنسائے۔ پہلے ایک دو قدم پر چپل کے گھسٹنے کی آواز بھی پیدا ہوئی تھی۔ پھر غسل خانے کے دروازے تک جانے تک کوئی بھی آواز نہیں ابھری

تھی۔

غسل خانے تک جاتے ہوئے اس کی کوفت میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ اندر جا کر وہ پاکیزہ پر چلانے ہی والی تھی کہ......

اس نے دیکھا پاکیزہ نیچے گری پڑی تھی۔ نیچے غسل خانے کے گیلے فرش پر۔ شمع کا دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔

''پاکیزہ'' اس کے منہ سے نکلا تھا اور وہ بہت تیزی سے گری ہوئی پاکیزہ پر جھکی تھی۔

کل والا جو غصہ اسے پاکیزہ پر تھا۔ اس کا اب نام ونشان نہیں رہا تھا۔

''گیلے کپڑوں سے مجھے سخت نفرت ہے، اور کپڑے دھوتے ہوئے کپڑے گیلے نہ ہوں، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے تمام کاموں میں مجھے ناپسندیدہ کام کپڑے دھونا ہی لگتا ہے۔'' اس کے کانوں میں کئی بار کے کہے ہوئے پاکیزہ کے الفاظ گونجے تھے۔

پیلی پلین کاٹن کا جو سوٹ پاکیزہ نے زیب تن کیا ہوا تھا۔ کافی حد تک گیلا تھا۔

''پاکیزہ...... پاکیزہ!'' اس نے بہن کو جھنجھوڑا تھا لیکن کوئی جواب بھی نہیں ملا تھا۔

''پاکیزہ'' اب کے بار وہ حلق کے بل چیخی تھی، ویسے ہی حلق کے بل جیسے برآمدے میں بیٹھ کر توریاں کاٹتے ہوئے چیخی تھی لیکن احساسات دونوں بار مختلف تھے۔

شمع کی چیخ سن کر زبیدہ کو انہونی کا احساس ہوا تھا۔ زبیدہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے غسل خانے تک آئی تھی۔

غسل خانے میں جا کر زبیدہ نے دیکھا کہ پاکیزہ گری پڑی ہے اور شمع نے پاکیزہ کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا ہے۔

''کیا ہوا؟'' زبیدہ بڑی تیزی سے قریب آئی تھی اور نیچے بڑی تیزی سے بیٹھی تھی۔

نیچے بیٹھتے ہوئے اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ اس طرح تیزی سے بیٹھتے ہوئے اس کے گھٹنوں میں پھر سے درد اٹھ جائے گا۔ جو پندرہ دن دوائیاں کے کھانے اور مکمل آرام کے بعد آہستہ آہستہ ختم ہونا شروع ہوا تھا۔

''امی دیکھیں نا پاکیزہ کو کیا ہوا ہے، بول ہی نہیں رہی۔'' شمع نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ ساتھ میں پاکیزہ کو جھنجھوڑا بھی تھا۔

زبیدہ نے پاکیزہ کو ہلایا تھا۔ دوسرے لمحے زبیدہ پاؤں کے بل کی بجائے چوکڑی مار کر بیٹھنے لگی تھی کہ کرنٹ لگنے سے وہ بڑے زور سے اچھلی تھی۔ فوراً اس نے نیچے دیکھا تو مشین کی آدھی ننگی تار پڑی تھی۔ جس کا ایک سرا پلگ میں لگا ہوا تھا۔

تار کا وہ سرا جس کے اوپر انسولیٹر کی کوٹنگ تھی، وہاں سے پکڑ کر زبیدہ نے تار کو کھینچا تھا۔ تار پلگ سے نکل گئی تھی اور پھر وہ بیٹی کو جھنجھوڑنے لگی تھی۔

پاکیزہ کرنٹ لگنے سے مرگئی تھی۔ اتنی تو بات ان کی سمجھ میں آجانی چاہیے تھی۔

لیکن وہ اس وقت تک انجان تھے یا انجان بن کر حقیقت سے نظریں چرا رہے تھے۔ اس بات کا ادراک مشکل تھا۔

❁❁❁

لیکچر تھیٹر میں بیٹھنے کے لیے لکڑی کے بنچ تھے۔ ابھی لیکچر شروع نہیں ہوا تھا۔ فیصل، غضنفر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آج میڈیکل کالج میں ان کا پانچواں دن تھا اور غضنفر کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اس کا تیسرا دن تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بہت زیادہ گھبراہٹ تھی اور گھبرائی ہوئی آنکھوں والے غضنفر سے فیصل کی اچھی انڈرسٹینڈنگ ہوگئی تھی۔

فیصل کے دائیں طرف غضنفر بیٹھا تھا بائیں طرف ایک خلا تھا۔ خلا کے بعد والا بنچ شاید لڑکیوں کے لیے مختص تھا۔ کیوں کہ ان پانچ دنوں میں وہاں صرف لڑکیاں ہی بیٹھی تھی۔

خلاء کے پار بنچ پر بیٹھی پہلی لڑکی کے سوٹ کا رنگ نیلا تھا۔

''نیلا رنگ اچھا ہوتا ہے، قدرتی رنگ۔'' پہلے فیصل نے سوچا تھا اور پھر اس نے خود کو سرزنش کی تھی۔

وہ پچھلے چار دنوں سے مسلسل اس لڑکی کو سوچ رہا تھا۔

''آخر مجھے ہو کیا گیا ہے۔'' فیصل کو الجھن ہوئی تھی۔

اس لڑکی نے اپنے بیگ سے ہاف لیٹر سیون اپ کی بوتل نکالی اور غٹ غٹ پینے لگی تھی۔ فیصل کو اندازہ نہ ہوا کہ اس ہاف لیٹر کی بوتل میں مشروب ہے یا پانی۔

پھر فیصل سوچنے لگا کہ مشروب تو اس تیزی سے نہیں پیا جا سکتا جس تیزی سے اس لڑکی نے پیا تھا۔ تو یقیناً پانی ہوگا۔

''فیصل مجھے تو Anatomy کی کچھ سمجھ نہیں آرہی، کیا کروں۔'' غضنفر نے فیصل کو مخاطب کیا تھا۔

فیصل بوکھلا گیا۔

''آں...... کیا کہا تم نے؟'' سنا بھی نہیں تھا۔

''یار مجھے Anatomy سمجھ ہی نہیں آرہی کیا کروں۔'' غضنفر کے لہجے میں پریشانی تھی۔ دراصل یہ پریشانی اس کی ذات کا حصہ تھی۔

"یار کوئی مسئلہ ہی نہیں، تم بس یاد کرنا شروع کر دو۔ جب بندہ یاد کرنا شروع کرتا ہے تو اسے چیزیں خود ہی سمجھ آنے لگ جاتی ہیں۔ یہ میرا آزمایا ہوا ٹرک ہے، چاہو تو آزمالو۔"

فیصل نے کہا تو غضنفر نے سر ہلا دیا۔

فیصل کی نظر بھٹک کر ایک بار پھر اس لڑکی کی طرف گئی تھی۔ جو نیلے لباس میں ملبوس تھی اور نیلی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ لڑکی ہاف لیٹر بوتل دوبارہ اپنے بیگ میں رکھ رہی تھی۔

"یہ ہینڈ بیگ ہے یا کالج بیگ" فیصل نے سوچا تھا۔

"شاید ٹو ان ون ہے۔" یہ اگلی سوچ تھی۔

"تم روز کا کام روز کرتے ہو؟" غضنفر پوچھ رہا تھا۔

فیصل دوبارہ غضنفر کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"یار ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ہاں البتہ ان دنوں میں جو کچھ پڑھایا ہے اسے میں نے گھر جا کر ضرور دیکھا ہے، ویسے یار تم پریشان کیوں ہو اتنے۔"

فیصل نے اس کے چہرے پر پریشانی کی حد تک پائے جانے والے ہونق پن کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"نہیں تو، پریشان تو نہیں ہوں میں۔" غضنفر مسکرایا تھا۔ فیصل کو اس کی مسکراہٹ بھی پریشان پریشان سی لگی تھی۔

ابھی فیصل غضنفر کو مزید کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ شور مچاتا ہال یک دم خاموش ہو گیا۔

اسسٹنٹ پروفیسر لیکچر دینے کے لیے کلاس میں آ چکے تھے۔

یہ آخری لیکچر تھا۔ لیکچر ختم ہونے کے بعد اٹھتے ہوئے، اس کی نظر دوبارہ نیلی لڑکی کی طرف گئی تھی۔ فیصل نے محسوس کیا تھا کہ اس لڑکی کے اوور آل کا سائز نارمل سے کافی چھوٹا تھا۔ اسی لیے اس کے سوٹ کا رنگ کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو رہا تھا۔

"اُف" سوچنے کے بعد فیصل نے اپنے سر پر ہاتھ مارا تھا۔

"میں اس لڑکی پر کیوں اتنا غور کر رہا ہوں، پتا نہیں کیا ہو گیا ہے، غضنفر پر ہی غور کر لیتا ہوں۔" فیصل نے لیکچر تھیٹر سے باہر جاتے ہوئے سوچا تھا۔

اب وہ غضنفر کو غور سے دیکھنے لگ گیا تھا۔ غضنفر نے بھی نیلے رنگ کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ کالی پینٹ کے ساتھ، شرٹ کا چیک چھوٹا تھا اور نیم کالے رنگ کا تھا۔ اوور آل نارمل سائز کا تھا۔ غضنفر کا بیگ......اف......بس فیصل غضنفر پر اتنا ہی غور کر پایا تھا۔ غضنفر پر غور کرتے

ہوئے وہ بدمزہ ہو رہا تھا۔

لیکچر تھیٹر سے نکلنے کے بعد فیصل نے غضنفر سے کہا کہ آؤ نماز پڑھتے ہیں لیکن غضنفر نے کہا کہ یار گھر جا کر پڑھ لوں گا۔ غضنفر کا انداز سُست تھا۔

فیصل نے غضنفر سے مزید کچھ نہ کہا۔ پچھلے دو دن وہ فیصل کے ساتھ نماز پڑھنے کالج کی مسجد میں گیا تھا لیکن آج کہہ رہا تھا کہ گھر جا کر پڑھ لوں گا تو فیصل نے بھی کوئی ردِعمل دکھانا بہتر خیال نہ کیا۔

سلام کرنے کے بعد غضنفر بائیک اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا اور فیصل لائبریری کی طرف۔

فیصل نے لائبریری جا کر اپنا بیگ، بیگز کے لیے مختص شیلف پہ رکھا اور کالج میں موجود مسجد کی طرف بڑھ گیا۔

مسجد اور لائبریری کافی فاصلے پر تھے۔ آنے جانے میں فیصل کو لگ بھگ دس منٹ لگ گئے۔

وضو گاہ میں جا کر اس نے وضو کیا۔ نماز ادا کی۔ دعا مانگی۔ اس وقت وہ مسجد میں اکیلا تھا۔ وہ ابھی دعا مانگ ہی رہا تھا کہ جینز ٹی شرٹ میں ملبوس ایک لڑکا مسجد میں آیا اور فیصل کے پاس نماز پڑھنے لگ گیا۔

فیصل نے ایک نظر اس لڑکے کو دیکھا، ایک نظر میں ہی اس نے اس لڑکے کو پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکا تھا جو اس کی فولنگ کرنے میں سب سے آگے تھا۔ ویسے تو فولنگ کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا لیکن فیصل دوبارہ کسی جال میں نہیں پھنسا تھا۔

دعا مانگتے ہوئے فیصل کی نظر دوبارہ اس لڑکے پر پڑی وہ لڑکا سجدے میں تھا۔ سجدے میں اس کی ناک زمین کو نہیں چھو رہی تھی۔ بلکہ وہ زمین سے اٹھی ہوئی تھی۔

دعا مانگ کر فیصل نے دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرے تھے اور ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا تھا۔

"تبلیغ اور امر بالمعروف کا کام بھی کس قدر مشکل ہے۔" فیصل نے سوچا تھا۔

"اللہ نے اپنے پسندیدہ بندوں، انبیاء کو بھی تبلیغ کے لیے چنا تھا۔" یہ سوچ کر فیصل نے اپنے آپ کو ڈھارس بندھائی تھی۔

فیصل اس لڑکے کا نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اس دوران وہ مسجد کا بھی جائزہ لینے لگ گیا تھا۔

مسجد کافی بڑی تھی۔ نیم شفاف شیشے جیسی ٹائلوں سے سجی ہوئی تھی۔ فرش بھی پھسلتی

ٹائلوں کا تھا۔ سامنے قبلہ کی طرف موجود ٹائلوں پر دائیں طرف اللہ تعالیٰ کے اور بائیں طرف حضرت محمد ﷺ کے اسمائے حسنیٰ لکھے ہوئے تھے۔ اوپر بڑے حروف میں کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔

''ماشاء اللہ'' فیصل کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

''یا اللہ طلباء کو توفیق دے کہ وہ مسجد میں آ کر نماز پڑھیں۔'' دل میں دعا بھی مانگی تھی۔

وہ لڑکا ابھی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تھا۔ دعا مانگے بغیر ہی اٹھنے لگا تو فیصل نے اسے آواز دی۔

''بات سنیں۔'' فیصل بھی کھڑا ہو گیا اس لڑکے کے ساتھ۔

وہ لڑکا اچھا خاصا ہینڈسم تھا۔ فیصل معترف ہو گیا۔

''ہاں، کہیے...... ایسے لگتا ہے کہ آپ کو کہیں دیکھا ہے۔''

''جی جی وہ آپ نے دو تین دن پہلے گراسی پلاٹ میں فولنگ......''

''اوہ ہاں ہاں، یاد آیا اور سناؤ کیسے ہو دوست؟ کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟''

''محمد فیصل۔'' فیصل نے نام بتایا تھا۔

''ہاں فیصل کسی قسم کی پڑھائی شڑھائی میں مشکل ہو تو بتانا، فولنگ شولنگ سے نہیں ڈرنا، یہ تو ابھی مہینہ بھر ہوتی رہے گی، ہر کسی کی ہوتی ہے۔'' اس لڑکے کا انداز دوستانہ تھا لیکن اس کے لہجے میں ایک غرور جھلکتا تھا۔ فیصل نے محسوس کیا تھا۔ ایسے لوگوں کو دین کی کوئی بات بتانا فیصل کو ہمیشہ مشکل لگا تھا۔ ایک دل کیا کہ رہنے دے مت بتائے لیکن پھر خود کو سرزنش کی۔ دین کی تبلیغ اس کی ذمہ داری تھی۔

''آپ کا کیا نام ہے؟''

''میرا نام GM ہے۔'' لڑکے نے اپنا نام بتایا تو فیصل کو عجیب لگا۔

''جی ایم'' فیصل نے زیر لب دہرایا تھا۔

''آؤ آؤ باہر چلیں۔'' جی ایم باہر جانے لگا تو فیصل بھی ساتھ ہو لیا۔

''وہ اصل میں، میں نے آپ کو کچھ بتانا تھا۔'' جھجکتے ہوئے فیصل نے کہا تھا۔ اس وقت وہ مسجد کے اندرونی حصے سے صحن میں آ گئے تھے۔

''ہاں ہاں کہو۔'' صحن میں آ کر جی ایم رک گیا۔ جی ایم کو دیکھ کر فیصل بھی رک گیا۔

فیصل نے جی ایم کو نظر بھر دیکھا تھا اور کہنا شروع کیا تھا۔

''میں نے ابھی آپ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے تو سجدے میں آپ کی ناک زمین کو نہیں چھو رہی تھی۔ بلکہ اوپر اٹھی ہوئی تھی اصل میں میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ سجدے کے لیے

ضروری ہے کہ ناک زمین پر لگی رہے، یہ واجب ہے اور واجب کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔'' فیصل خاموش ہو گیا۔

''یہ کہنا تھا۔''

''ہاں۔''

جی ایم مسکرایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''یار اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ میرا مقصد تو خدا کی عبادت ہے نا تو پھر یہ چھوٹی چھوٹی باتیں کیا معانی رکھتی ہیں۔''

فیصل کا سر نفی میں بڑی زور سے ہلا تھا۔

''ایسا نہیں ہے جی ایم بھائی، عبادت تو کرنی ہے ہم نے، لیکن خدا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق۔ اپنی طرف سے نہ ہم کوئی اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی کمی۔ ناک کا زمین پر لگے رہنا خدا نے واجب مقرر کیا ہے تو ضروری ہے عبادت کے لیے کہ ناک تو زمین پر رہے۔ ورنہ نماز نہیں ہو گی۔ اپنے طریقے سے عبادت کرنی ہے تو پھر ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر یا عیسائیوں کی طرح مٹھیاں بھینچ کر کھڑے ہو جائیں تو کیا بھلا عبادت ہو جائے گی۔'' ہمت کر کے فیصل نے کہہ دیا۔ یہ بھی غور نہ کیا کہ جی ایم کے ماتھے پر کتنی شکنیں ابھری ہیں اور منہ کا زاویہ کس قدر درجے تبدیل ہوا ہے۔

''بحث کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' جی ایم نے کچھ ایسے تیز انداز میں کہا تھا کہ فیصل بوکھلا گیا۔ دوسرے ہی لمحے جی ایم فیصل کو کینہ توز نظروں سے نوازتا مسجد سے باہر جا رہا تھا اور فیصل حیران سا وہیں کھڑا تھا۔ اس کے کانوں میں ایک بار پھر گونجا تھا۔

''بحث کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

۞ ۞ ۞

شمع صحن میں جھاڑو دے رہی تھی۔

''یہ کس طرح سے جھاڑو پکڑا ہوا ہے۔ بالکل مٹھی بند کر کے اس طرح جھاڑو پکڑو گی تو زور کس طرح سے لگاؤ گی۔'' پاکیزہ کے الفاظ گونجے تھے۔

شمع نے مطلوبہ انداز میں جھاڑو پکڑ لیا۔

''ذرا جما کے جھاڑو لگایا کرو۔ تم جب جھاڑو لگاتی ہو تو کچرا ویسے کا ویسا پڑا رہتا ہے۔'' پاکیزہ کا اگلا فقرہ یاد آیا تھا۔

شمع نے مطلوبہ انداز میں جھاڑو پھیرنا شروع کر دیا۔

"آنکھیں کھلی رکھا کرو۔ جھاڑو دیتے ہوئے۔ آگے پڑا کچرا دیکھو گی تو ہی اسے میلو گی نا۔" آنکھیں کھلی رکھنے کا پاکیزہ اسے کس قدر کہتی تھی۔

شمع نے جھاڑو رکھ دیا۔ کہنی ٹکا کر رونے لگ گئی۔

"پاکیزہ، میری بہن مجھے اکیلا چھوڑ کر تم کہاں چلی گئیں۔" آنکھوں سے آنسو بڑی روانی سے بہتے تھے۔

کافی سارے آنسو بہانے کے بعد شمع نے برآمدے میں موجود اپنے ماں باپ کو دیکھا تھا۔

زبیدہ اس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھی تھی۔ شمع جانتی تھی کہ اس وقت ماں کے چہرے پر کس قدر وحشت ہوگی۔ عبدالرحمٰن چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں جو خالی پن تھا وہ بھی شمع کو بغیر دیکھے محسوس ہوا تھا۔

آنکھوں سے پھر آنسو نکلے تھے اور بڑی روانی سے بہتے چلے گئے تھے۔ آنسو کچھ اس طرح بہتے تھے جیسے انہیں اپنی منزل پر پہنچنے کی جلدی لیکن حقیقت میں ان کی کوئی منزل تھی ہی نہیں۔

شمع نے ایک بار پھر جھاڑو دینا شروع کیا تھا۔ ابھی اس نے دوبارہ پھیرا ہی تھا کہ زبیدہ نے اسے بلایا تھا۔

شمع اٹھ کر ماں کے پاس چلی گئی تھی۔

"جی اماں!" شمع کا لہجہ بھی بھیگا ہوا تھا۔

"ادھر آ۔" زبیدہ اسے اپنے قریب کر کے اور پھر سینے سے لگا کر رونے لگ گئی۔

آنسو تو شمع کی آنکھوں میں کھڑے تھے۔ سو وہ بھی بہنے لگ گئے۔

"پاکیزہ کی بڑی یاد آ رہی ہے۔" روتے ہوئے زبیدہ نے کہا تھا۔

"مجھے بھی۔" شمع بولی تھی، روتے ہوئے۔

زندگی بھی کتنی بے ثبات ہے۔ پل بھر میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا۔ کچھ بھی پتا نہیں چلتا۔

کتنی ہی دیر وہ ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر روتی رہی تھیں۔

عبدالرحمٰن ہنوز لیٹے رہے۔ انہوں نے تو کوئی حرکت بھی نہیں کی تھی۔ البتہ ان کی آنکھوں سے بھی آنسو نکلے تھے۔ جو کنپٹی کی طرف بہتے چلے گئے تھے۔

"اللہ میری بیٹی کو جنت نصیب کرے۔" دوبارہ آنکھیں صاف کرتے ہوئے عبدالرحمٰن

نے خدا سے دعا کی تھی پچھلے چار دن وہ خدا سے یہ دعا کرتے رہے تھے کہ یا اللہ میری بیٹی کو واپس بھیج دے میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آج وہ خدا سے کہہ رہے تھے کہ میری بیٹی کو جنت نصیب فرما۔ فطری فرق تھا جو آج پاکیزہ کی موت کے چھٹے دن عبدالرحمٰن کی دعا میں آیا تھا۔

❁ ❁ ❁

زندگی کی ڈھب ہی نرالی تھی۔ سعد نے سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی اس کے لیے سوالیہ نشان بن جائے گی۔

پاکیزہ کی حادثاتی موت۔ اس کا تو پاکیزہ کے ساتھ کوئی خونی رشتہ بھی نہیں تھا۔ بچپن میں کبھی برس ہا برس اکٹھے کھیلا کرتے تھے اور پھر جب وہ شمع کی طرف متوجہ ہوا تھا تب اسے پاکیزہ رکاوٹ محسوس ہوتی تھی۔ دروازہ کھٹکھٹاتا تو پاکیزہ آ جاتی۔ دو دو تین تین گھنٹے توقیر کی دکان پر انتظار کرتا رہتا اور زبیدہ آ جاتی یا پھر پاکیزہ، لیکن اسے پاکیزہ کی موت کا بہت دکھ ہوا تھا۔ ویسے بھی جوانی کی موت ہر سننے والے اور جاننے والے کو دکھ دیتی ہے اور شمع کے حوالے سے پاکیزہ اسے تھوڑی بہت عزیز بھی تھی۔

سوگ کے تین دنوں میں اس نے عبدالرحمٰن کو بہت زیادہ نڈھال دیکھا تھا۔ چند لمحوں میں وہ بہت زیادہ بوڑھے لگنے لگ گئے تھے۔

شاداں، سعد کو زبیدہ اور شمع کے پاس بھی تعزیت کے لیے لے گئی تھی۔ شمع تو چند لمحے بیٹھ کر اٹھ گئی۔ ان چند لمحوں میں بھی اس نے بہت سارے آنسو بہائے تھے اور زبیدہ کی آنکھوں سے تو جیسے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

پاکیزہ کی موت کو دو ہفتے ہو چکے تھے۔ شمع کی باتیں بھی اس کو یاد تھیں۔

"صرف محبت سے میرا گزارا نہیں ہوتا۔" یہ فقرہ تو اب بھی اس کے کانوں میں گونجتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شمع کو سنبھلنے میں کافی وقت لگ جائے گا لیکن اس نے اب کیا کرنا تھا، اس کا وہ تعین نہیں کر پایا تھا۔

پاکیزہ کی موت کی وجہ سے بلاشبہ اس بات کو نہ سوچنے کی شعوری کوشش کی تھی لیکن وہ کامیاب نہیں ہوا تھا۔

ویسے سعد کو کبھی کبھی لگتا تھا کہ وہ بازی ہار چکا ہے۔

شمع کو اپناتا تو شمع نے خوش نہیں رہنا تھا اور اگر شمع کو چھوڑ دیتا تو اس نے خوش نہیں رہنا تھا۔

اس کی حالت ایک ایسے کشتی سوار کی تھی جو بیچ سمندر میں تھا اور اس کی کشتی میں سوراخ

ہو چکا تھا۔ کشتی سے باہر چھلانگ لگانے کی صورت میں بھی اسے سمندر نے نگلنا تھا اور کشتی میں بیٹھے رہنے کی صورت میں بھی اس نے سمندر کی خوراک بننا تھا۔

❁❁❁

اس لڑکی کا نام کوئل تھا۔ جس کے پاس شاید تمام رنگوں کے کپڑے موجود تھے۔ کپڑوں کے بارے میں یہ خیال فیصل کا تھا۔

ہینڈ بیگ نما کالج بیگ وہ زیادہ تر دائیں کندھے پر لٹکائے پھرتی اور لیکچر تھیٹر میں وہ بیگ یا تو اپنی سائیڈ پر رکھتی یا پھر گود میں۔

فیصل کو تو اس کی آواز بھی کوئل کی کوک سے مشابہ محسوس ہوتی تھی۔ سریلی مدھم سی آواز۔ کوئل ہمیشہ لیکچر تھیٹر میں اپنی مستقل جگہ پر بیٹھتی۔ دوسری رو کی دائیں طرف سے پہلی لڑکی۔

فیصل کی جگہ بدلتی رہتی لیکن اسے ہر جگہ سے کوئل نظر آتی تھی۔ یا پھر وہ خود ایسی جگہ کا انتخاب کرتا تھا۔ جہاں سے وہ کوئل کو دیکھ سکتا۔

''فیصل تم اس لڑکی کو ٹکٹکی باندھ کر کیوں دیکھتے ہو؟'' غضنفر نے ایک دن پوچھا تھا۔

''نہیں تو۔'' فیصل نے تردید کی تھی۔

''اچھا مجھے لگا کہ شاید تم اس لڑکی کو دیکھتے رہتے ہو۔'' فیصل نے تردید کی تو غضنفر نے بھی مان لیا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ حتمی نتیجے پر خود تو کم ہی پہنچتا تھا۔ دوسروں پر زیادہ انحصار کرتا تھا۔

''کیا واقعی میں کوئل کو دیکھتا رہتا ہوں۔'' فیصل نے سوچا تھا۔

اور جو جواب اس کو دل دے رہا تھا۔ اس کو وہ خود ماننے سے انکاری تھا۔

آخری لیکچر کے بعد لائبریری میں بیگ رکھنے کے بعد وہ کالج کی مسجد میں چلا گیا۔

اب تو کالج کے در و دیوار اور راستے فیصل سے اور فیصل ان چیزوں سے مانوس ہو گیا تھا۔

غضنفر اب فیصل کے ساتھ مسجد نہیں جاتا تھا۔ لیکچرز اور ڈسکشنز کے ختم ہونے کے بعد وہ فوراً گھر کی طرف چلا جاتا۔ فیصل کے استفسار پر ایک دن غضنفر نے اسے بتایا تھا کہ وہ کبھی کبھار گھر جا کر نماز پڑھتا ہے لیکن زیادہ تر اتنا تھکا ہوتا ہے کہ کھانا کھاتے ہی سو جاتا ہے۔

فیصل، غضنفر کو نماز کی تلقین کرنا چاہتا تھا لیکن اس کو جی ایم کے الفاظ یاد آ گئے۔ فیصل نے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ویسے فیصل کو امید تھی کہ غضنفر، جی ایم جیسا کچھ نہیں کہے گا لیکن پھر بھی اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔

''آئندہ کبھی کہوں گا۔'' فیصل نے ارادہ کیا تھا۔ مسجد فیصل کو زیادہ تر خالی ملتی تھی۔ کبھی کبھار کوئی اکا دکا طالب علم نماز پڑھتا مل جاتا۔

آج جب فیصل مسجد میں گیا تو ایک لڑکا پہلے سے نماز پڑھ رہا تھا۔ وہ جی ایم تھا۔

فیصل وضو گاہ سے وضو کر کے مسجد کے اندرونی حصے میں گیا تو اسے جی ایم نماز پڑھتا نظر آیا۔ جی ایم حسبِ معمول جینز شرٹ میں ملبوس تھا۔

فیصل نے جی ایم سے کافی فاصلے پر نماز پڑھنا شروع کی تھی۔ جی ایم نے بھی فیصل کو دیکھا تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد جی ایم فیصل کے ساتھ آ کر تشہد پڑھنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

سلام پھیر کر فیصل نے جی ایم کو اپنے ساتھ بیٹھے دیکھا تو اسے عجیب محسوس ہوا تھا۔ دعا مانگ کر وہ اٹھنے والا تھا۔ فیصل کا ارادہ تھا کہ اٹھتے ہوئے وہ جی ایم کو سلام کرے گا لیکن فیصل کے سلام کرنے سے پہلے ہی جی ایم نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا البتہ اس نے سلام نہیں کیا تھا۔

''السلام علیکم'' فیصل نے ہی کہا تھا۔

جی ایم نے سر کے اشارے سے جواب دیا تھا۔

''آؤ باہر چلیں۔'' جی ایم فیصل کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آیا۔

''سوری یار، میں نے تمہیں ہرٹ کیا تھا۔ اس دن مجھے تم سے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔ تم نے تو میرے بھلے کے لیے ہی کہا تھا لیکن میں تم پر چڑھ دوڑا۔ اگین سوری۔'' جی ایم کہہ رہا تھا۔

فیصل نے جی ایم کے تاثرات جاننے کے لیے اس کے چہرے پر غور کیا تھا کہ واقعی وہ شرمندہ ہے یا صرف خانہ پُری کر رہا ہے۔ فیصل کو اندازہ نہیں ہوا تھا۔

''اِٹس او کے۔'' فیصل نے کہا تھا۔ یہ بات انہوں نے مسجد کے صحن میں کھڑے ہو کر کی تھیں۔ پھر وہ جوتے پہن کر مسجد سے باہر نکل آئے۔ فیصل مسجد کے دروازے پر رک گیا۔ وہ جی ایم سے رخصت چاہتا تھا۔

''آؤ یار کینٹین چلتے ہیں۔'' جی ایم نے ایک بار پھر فیصل کا ہاتھ پکڑا تھا۔

سکول اور انٹر کے دوران وہ کبھی قسمت سے کینٹین گیا تھا۔ ماں تو اسے ہر دوسرے تیسرے جیب خرچ دیتی تھی لیکن اس کا خرچ کرنے کو دل نہیں کرتا تھا، جمع کر لیتا۔ پیسے جمع کر کے وہ واپس ماں کو دے دیتا۔ ماں لیتے ہوئے کہتی۔

''بیٹا تمہارے خرچ کے لیے ہیں، کھا لیا کرو کچھ۔''

وہ بس مسکرا دیتا۔

''نہیں، میں نے گھر جانا ہے، مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' فیصل نے جی ایم کو جواب دیا تھا۔ ایک تو اس کے پاس پیسے کم تھے۔ اسے جی ایم کے کپڑوں اور جوتوں سے اس کی مالی حالت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ دوسرا اسے واقعی دیر ہو رہی تھی۔

''کہاں رہتے ہو تم؟'' جی ایم نے پوچھا تو فیصل نے اپنے علاقے کا نام بتا دیا۔

''ارے وہ تو میرے راستے میں پڑتا ہے، میرے پاس کار ہے، تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔''

فیصل نے رسان سے اپنا ہاتھ جی ایم کے ہاتھ سے چھڑوایا تھا۔

''نہیں مجھے بس پر جانے کی عادت ہے، میں چلا جاؤں گا۔''

جی ایم کو حیرانی ہوئی تھی۔ اسے کبھی کسی بس پر جانے والے (غریب) سٹوڈنٹ نے اس طرح انکار نہیں کیا تھا۔ لفٹ کی آفر کرنے پر وہ خوشی خوشی گاڑی میں بیٹھ جاتے۔

''بس پر جانے میں دیر نہیں ہو گی۔'' جی ایم کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

اسے فیصل کا انکار کچھ زیادہ اچھا نہیں لگا تھا۔ فیصل مسکرا دیا۔

''ایسی دیر کی عادت ہے جناب۔''

''او کے اللہ حافظ چلتا ہوں۔'' فیصل نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا اور مصافحہ کر کے جانے لگا تھا۔

ابھی اس نے دو تین قدم ہی بڑھائے تھے کہ اسے پیچھے سے جی ایم کی آواز سنائی دی تھی۔

''مجھ سے دوستی کرو گے۔''

پہلے فیصل رکا تھا۔ پھر الٹے قدموں پر جی ایم کے پاس آیا تھا۔

''ایک روپے کا سکہ، ایک ہزار کے نوٹ کے برابر نہیں ہوتا۔ گاڑی میں جانے والے اور پیدل چلنے والے کا بھلا کیا جوڑ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ سے دوستی نہیں کر سکتا۔''

جی ایم کو اس جواب کی بھی امید نہیں تھی۔

''کیوں احساسِ کمتری ہے تمہیں؟''

''نہیں، اصل میں آپ کو احساسِ برتری ہے۔'' فیصل کے الفاظ نے بڑی چوٹ کی تھی۔

''میں کہتا ہوں کہ تمہیں احساسِ کمتری ہے۔''

''تو کہہ لیں، مجھے فرق نہیں پڑتا۔'' مسکراتے ہوئے فیصل نے کندھے اچکائے تھے۔

''اچھا چلتا ہوں، اللہ حافظ۔'' یہ کہہ کر فیصل لمبے لمبے ڈگ بھرتا لائبریری کی طرف مڑ گیا۔ اس نے لائبریری سے اپنا بیگ لینا تھا۔

فیصل نے جی ایم سے کہا کہ تمہارے اندر احساسِ برتری ہے، تو جی ایم کو چبھا تھا۔ جی ایم نے فیصل کو احساسِ کمتری کا طعنہ دیا تو فیصل کو برا نہیں لگا تھا۔ فرق تو تھا۔

اور یہ فرق ہونے اور نہ ہونے کا تھا۔

''پتا نہیں سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو، پتا نہیں کس چیز کا غرور ہے۔'' بڑبڑاتے ہوئے جی ایم نے بڑی سہولت سے اپنی خامی فیصل کے سر کر دی تھی۔

شمع، ہال کمرے میں موجود تھی اور برآمدے میں کھلنے والی لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی کے سامنے سٹول رکھے بیٹھی تھی، جیل میں موجود قیدی لگتی تھی۔ ہاتھ میں کڑھائی والا فریم تھا۔ سوٹ کے دامن پر ایک بڑا سا پھول تھا۔ جس کی چار پتیاں کاڑھی جا چکی تھیں اور دو پتیوں کو کاڑھنا باقی تھا۔ سفید رنگ کے سوٹ پر ہلکے آسمانی رنگ کا آدھا کاڑھا ہوا پھول تھا۔

''میرا جہیز تمہارے جہیز سے بہت زیادہ اچھا ہو گا، اتنی محنت جو کرتی ہوں۔'' پاکیزہ کہتی تھی۔ اسے اپنے جہیز کی بڑی فکر رہتی۔ چارپائیوں پر بچھانے والی چادریں کاڑھی تھیں۔ کرسیوں پر چڑھائے جانے والے غلاف کاڑھے تھے اور اب وہ فارغ اوقات میں رنگ برنگے سوٹ کاڑھا کرتی تھی۔

''ویسے تو سفید رنگ تو مجھ پر بھی بہت جچتا ہے لیکن تم پر بھی تھوڑا بہت اچھا لگتا ہے۔ یہ سفید سوٹ میں تمہیں سوغات میں دوں گی چاہے تو جہیز میں رکھ لینا چاہے ابھی پہن لینا۔''

پاکیزہ نے جب مذکورہ سوٹ کاڑھنا شروع کیا تھا تو شمع سے کہا تھا۔

''مجھے جہیز کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بہت امیر گھر میں جاؤں گی۔ جہاں جب نئے سوٹ کا دل کیا، بازار سے جا کے لے آئے یا آرڈر پر تیار کرا لیا۔ یہ سوٹ میں یہیں پہن لوں گی۔'' شمع نے ایک ادا سے کہا تھا۔ پاکیزہ کو شمع کی ادا بری لگی تھی۔

''یہ تم چھچھوروں کے خواب کیوں دیکھتی رہتی ہو؟ جب آرڈر پر سوٹ تیار کروانا تو مجھے بھی بتانا۔ چاولوں کی خیرات کروں گی۔ ویسے تمہارے خود کے ہاتھ ٹوٹے ہیں جو کڑھائی نہیں کرتی۔ میں اپنی مہینوں کی محنت تمہیں نہیں دوں گی۔'' پاکیزہ اپنے کہے سے پھر رہی تھی۔

"کڑھائی تو مجھ سے ہوتی نہیں دل ہی نہیں کرتا وہ تو میں نے امی کی ڈانٹ سے بچنے کے لیے تھوڑی بہت سیکھ لی اور رہ گئی تمہاری مہینوں کی محنت تو وہ تو تم مجھے دے چکی ہو۔ اب یہ سوٹ تمہارے لیے ناجائز ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی مسلمان بھائی اپنے بھائی کو چیز مفت دے کر واپس لیتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے اُلٹی کر کے کھانے بیٹھ جائے۔" شمع نے مزے سے کہا تھا۔

"ہائیں!" پاکیزہ کے منہ سے بس اتنا نکلا تھا لیکن پھر وہ تھوڑا سنبھل کر بولی تھی۔

"لیکن میں نے تمہیں سوٹ دیا ہی نہیں۔"

"لیکن زبان تو دی ہے۔"

"اوہ چلو یہی آخری عیش کر لو، پھر ساری زندگی خواب دیکھتی رہنا کہ آرڈر پر بنواؤں گی۔" پاکیزہ نے ناک سکیڑ کر کہا تھا۔

آنکھ سے آنسو نکلا تھا اور سیدھا سفید سوٹ کے آدھ کڑھے ہلکے آسمانی پھول کی ایک پتی میں جذب ہو گیا تھا۔

شمع نے کڑھائی والے فریم کو سینے سے لگا لیا تھا۔

"پاکیزہ، میری جان اب سوٹ کو کون کاڑھے گا، مجھے عیش کون کرائے گا۔" شمع فریم کو سینے سے لگائے روتی چلی گئی۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے، میں نے تمہارے کاڑھے سوٹ پہننے ہیں۔" شمع نے روتے ہوئے کہا تھا۔

❀❀❀

سونیا اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنے لگی تھی۔ پتا نہیں اسے کیا ہوا تھا۔ جب سے پینتیس سال کی ہوئی تھی۔ بار بار یہی سوچ آتی کہ آئیڈیل کو اب گولی مارے اور تھوڑا سا کمپرومائز کر کے کسی اچھے سے مرد سے شادی کر لے۔

اب اس اچھے سے مرد میں کون سی خوبیاں ہونی چاہیے، یہ بھی گھمبیر مسئلہ تھا۔ وہ اپنے آئیڈیل کا تعین نہیں کر سکتی تھی۔ کجا کہ اچھے مرد کی خوبیوں کا تعین کرتی۔

چند مہینے مزید گزرے تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ یہ آئیڈیل وغیرہ سب بے کار ہے۔ اب واقعی اسے شادی کر لینی چاہیے۔

اب کس سے شادی کرنی چاہیے۔ یہ مسئلہ بھی اسے اتنا ہی الجھا ہوا محسوس ہوا تھا۔ جتنا آئیڈیل کی تلاش کا تھا۔ کسی بزنس مین سے وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی کیوں کہ سب

بزنس مین اسے خودغرض محسوس ہوتے تھے جن کی نظریں اس کے بزنس پر ہوتی تھیں۔

"مجھے کسی ایسے شخص سے شادی کرنی چاہیے جو میرے دل کو اچھا لگے۔" چند مہینوں میں وہ مزید اتنا ہی تعین کر پائی تھی۔ اب اسے اس بات کا انتظار تھا کہ آخر کوئی تو ہوگا جو اس کے دل کو اچھا لگے گا۔

❀❀❀

ہال کمرے کی جیل جیسی سلاخوں والی کھڑکی بند تھی۔ گول فریم والا شیشہ جو برآمدے کی دیوار پر لگا ہوتا تھا۔ اس وقت کھڑکی کی چٹخنی کے ساتھ دھاگے کی مدد سے لٹکا تھا۔ اس شیشہ میں شمع کا عکس نظر آ رہا تھا۔ جو دلہن بنی بیٹھی تھی۔

سرخ جوڑا، بھاری کام والا، سرخ لالی اور سرخ لپ اسٹک۔ ماتھے پر جھومر، کانوں میں بالیاں، گلے میں ہار اور ہاتھوں میں چوڑیاں۔ چار عدد سونے کی چوڑیاں ایک ہاتھ میں اور سرخ کانچ کی بے شمار چوڑیاں دوسرے ہاتھ میں۔ سٹول پر بیٹھی تھی۔ نکاح ہو چکا تھا۔

"نہیں اماں میں نے شادی نہیں کرنی۔" دو ہفتے پہلے شمع نے زبیدہ سے کہا تھا۔

"تجھے ابھی بھی امیر گھر میں، امیر بندے سے شادی کرنی ہے۔" زبیدہ کا انداز دکھ بھرا تھا۔

"نہیں اماں، ایسی بات نہیں ہے، پیسے کا کیا کرنا ہے، جانا تو قبر میں ہی ہے نا، مجھے کوئی آسائش نہیں چاہیے۔ بس میں آپ کے اور ابو کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں اور کچھ نہیں۔" شمع نے اپنا سر زبیدہ کے کندھے کے ساتھ ٹکایا تھا۔ پاکیزہ کی موت نے بہت کچھ تبدیل کیا تھا۔

شمع کی بے زاری، سُستی اور پیسے کی لالچ نما خواہش۔ سب چیزیں جیسے کہیں گم ہو گئی تھیں۔ زبیدہ نے شمع کا گال تھپتھپایا تھا۔

"میری بیٹی!" زبیدہ بھی اب نہیں ڈانٹتی تھی۔

"بوڑھے ہیں میں بھی اور عبدالرحمٰن بھی، آج ہیں کل نہ ہوں کچھ پتا ہے بھلا۔"

"اماں کیسی باتیں کرتی ہیں؟ آپ ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گی، پاکیزہ تھوڑی ہیں جو مجھے چھوڑ کر چلی جائیں گی۔" شمع نے زبیدہ کی بات کاٹی تھی۔

زبیدہ نے ایک بار پھر شمع کا گال تھپتھپایا تھا۔ آٹھ مہینے ہونے کو آئے تھے پاکیزہ کو گزرے ہوئے۔ اب بات بے بات آنسو نہیں نکلا کرتے تھے۔

"عبدالرحمٰن بہت ڈرتا ہے سچ بتاؤں تو مجھے بھی خوف لگا رہتا ہے۔ اب دیکھ انکار مت کر۔ ہم جلد از جلد تیرا فرض ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ادا کرنے دے۔ ذمہ داری ادا ہو گی تو اچھا

لگے گا۔"

زبیدہ کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ شمع دوبارہ انکار نہ کرسکی تھی۔ بس چپ چاپ دو آنسو بہا دیئے تھے۔

دروازے کا کھٹکا ہوا اور شمع نے دروازے کی طرف دیکھا تو اسے زبیدہ آتی نظر آئی۔

شادی والے گھر میں خاموشی تھی۔ مکمل خاموشی۔ رشتہ داروں، محلے داروں کسی کو بھی نہیں بلایا تھا۔ شمع نے منع کیا تھا اور شاید زبیدہ اور عبدالرحمٰن بھی یہی چاہتے تھے۔

زبیدہ نے آکر شمع کے جھومر کو چھوا تھا۔

"میری بیٹی بہت خوبصورت لگ رہی ہے۔" زبیدہ اب شمع کو 'میری' کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ جیسے اسے خوف ہو کہ کوئی شمع کو چھین لے گا۔

"یہ جھومر تیرے نانا نانی نے مجھے میری شادی کے وقت دیا تھا۔ تیرے نانا نے خود دو تین دن ساتھ بیٹھ کر اپنے کسی سنار دوست سے بنوایا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ اپنی کس بیٹی کو دوں گی، دیکھ تیری قسمت میں تھا۔" یہ کہتے ہوئے زبیدہ کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور پھر وہ شمع کو ساتھ لگا کر ہچکیاں لے کر رونے لگی تھی۔ شمع بھی رو پڑی۔ یہ آنسو صرف شمع کی رخصتی کے نہیں تھے بلکہ کسی کی غیر موجودگی کے بھی تھے۔

"لے اتنا رو لی، ساری لالی اتر گئی، دوبارہ لگاتی ہوں۔" زبیدہ نے کپڑے سے گالوں کو رگڑا اور دوبارہ لالی لگائی۔

"رخصتی کا کہہ رہے ہیں، تجھے لینے آئی ہوں۔" زبیدہ نے شمع کا کانچ کی چوڑیوں والا ہاتھ پکڑا تھا۔ چوڑیاں کھنکھنا اٹھی تھیں۔

"آؤ چلیں۔" زبیدہ نے شمع کو اٹھنے کا کہا تھا۔

شمع اسٹول سے اٹھ گئی۔ ایک نظر بند کھڑکی کو دیکھا تھا۔

"شمع جب تم یہ بال آگے کیے اس کھڑکی کے سامنے اسٹول پر بیٹھی ہوتی ہو تو پوری فلم کی اداکارہ لگتی ہو۔" کھلکھلاتی آواز آس پاس گونجی تھی۔

"ایک لڑکی تھی جس کا نام مس بے زار تھا اسے ایک شہزادے کا انتظار تھا جس نے آکر اس کی بے زاری کو توڑنا تھا۔"

شمع نے ایک نظر روغن اتری دیواروں کو دیکھا تھا۔ یک دم بچپن یاد آ گیا تھا۔ جب وہ اور پاکیزہ قلانچیں بھر بھر کر بھاگتے تھے۔

"اماں!" شمع ماں سے لگ گئی۔ آنکھیں پھر بھر آئیں۔

"بس شمع، بس اب رونا نہیں، اب کیا دوبارہ لالی لگاؤں گی۔" زبیدہ نے ماحول کو ہلکا پھلکا کرنے کی کوشش کی تھی۔

باپ کے سینے سے لگ کر بھی وہ بے تحاشہ روئی تھی۔

رخصت ہوئی اور کچھ ہی دیر بعد وہ مسہری پر بچھی سرخ پھولوں والی سفید چادر پر اکیلی بیٹھی تھی۔ پکے سیمنٹ والے کمرے میں ابھی کچھ دنوں پہلے کی گئی سفیدی کی ہوا پوری طرح نہیں گئی تھی، محسوس ہوتی تھی۔ سعد کی شادی سے پہلے انہوں نے سارا گھر پکا کروایا تھا۔ انہوں نے بھی شادی سادگی سے کی تھی۔ البتہ کچھ عرصے تک ولیمہ کرنے کا ارادہ تھا۔

سعد کمرے میں آیا تھا۔ شمع کو دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سعد شمع کے سامنے بیٹھا تھا۔

"کیسی ہو؟" سعد نے پوچھا تھا۔ وہ آپ کے تکلف میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

"ٹھیک۔" شمع کا جواب ایسا ناپا تلا تھا کہ بات آگے بڑھائی ہی نہیں جاسکتی تھی۔

خاموشی کا ایک وقفہ آ گیا۔ پھر بالآخر سعد ہی بولا تھا۔

"خوش ہو؟"

شمع کو سوچنا پڑا کہ کیا وہ خوش ہے یا نہیں۔

"پتا نہیں۔"

سعد نے شکر ادا کیا کہ جواب صرف 'نہیں' نہیں تھا۔

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ اس بار خاموشی کو توڑنے میں سعد نے کچھ زیادہ وقت لگایا تھا۔ الفاظ ترتیب دینے میں اسے دیر لگ گئی تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ میں نے خود غرضی دکھائی، تم شادی نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن میں نے تمہارے کہنے پر بھی انکار نہیں کیا، اصل میں شمع تمہیں اندازہ نہیں کہ تم میرے لیے کس قدر اہمیت رکھتی ہو، تمہارے بغیر مجھے زندگی فضول لگتی ہے۔ اس لیے خود غرضی دکھانے پر مجبور تھا۔ مجھے معاف کرنا لیکن وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں ہر چیز، ہر آسائش مہیا کروں گا، روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اللہ نے چاہا تو نوکروں کی بھی ایک فوج ہوگی خدمت کے لیے، اور بنگلہ گاڑی بھی، چاہے مجھے خود کو بھی بیچنا پڑے سب کچھ تمہیں دوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔" سعد ہونٹ کاٹتے ہوئے شمع کے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہتا رہا اور شمع یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ شمع کو دیوانگی کی انتہا محسوس ہوئی تھی۔ اچھا بھی لگا تھا۔

کچھ دیر شمع یوں ہی خاموش بیٹھی رہی اور پھر بولی۔

''سعد، زندگی کا کوئی پتا نہیں، کب ختم ہو جائے، کچھ معلوم نہیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ نوکر چاکر، گاڑی، بنگلہ کچھ نہیں چاہیے۔ آپ کا خلوص اور محبت کافی ہے۔ اپنی محنت سے آپ جو کما لائیں گے وہ میرے لیے من و سلویٰ ہے۔ مجھے آپ کا کمایا ہوا حلال رزق ہی کافی ہے۔'' اتنا کہہ کر شمع چپ کر گئی۔ وہ حقیقت بیان کر چکی تھی۔

شمع کی بات سن کر سعد کو بھی اچھا لگا تھا۔

''میں تمہیں زندگی کسی سمجھوتے میں نہیں گزارنے دوں گا۔ تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔ جب میں نے کوئی سمجھوتا نہیں کیا تو تمہیں کیوں کرنے دوں۔'' سعد نے سوچا شمع سے مزید کچھ کہنا اسے بہتر نہیں لگا تھا۔ ویسے اس کے ارادے مضبوط تھے۔

کچھ دیر کے لیے پھر سے خاموشی چھا گئی۔

جھجکتے ہوئے سعد نے شمع کا ہاتھ پکڑا تھا۔ شمع نے سعد کو ایک نظر دیکھا تھا۔ پھر نظریں جھکا لی تھیں اور شمع کا ہاتھ پکڑ کر سعد کو ایسے لگا تھا۔ جیسے ہفتِ اقلیم کی دولت ہاتھ آ گئی ہو۔

❁ ❁ ❁

''امر بالمعروف و نہی عن المنکر، کس قدر مشکل ہے۔'' فیصل نے سوچا تھا۔ آج اس نے ایک بار پھر یہی مشکل کام کرنا تھا۔ جی ایم کو کچھ بتانا تھا۔ اپنے آپ کو روک بھی نہیں سکتا تھا۔ اچھے کام سے اپنے آپ کو روکنا اچھا بھی نہیں ہوتا۔

جی ایم ابھی نماز پڑھ رہا تھا جب فیصل اس کے ساتھ جا بیٹھا تھا اور جی ایم کے نماز ختم کرنے کا انتظار کر رہا تھا۔

جی ایم نے سلام پھیرا فیصل کو ساتھ بیٹھے دیکھا، مسکراہٹ کے ساتھ مصافحہ کیا۔ دعا نہیں مانگی۔ فیصل نے جی ایم کے دعا نہ مانگنے کو نوٹ کیا تھا۔

''باہر چلیں۔'' فیصل نے کہا تھا۔

دونوں مسجد کے احاطے سے باہر آ گئے۔

''میں نے آپ سے کچھ کہنا تھا۔'' 'عزت افزائی' کی امید رکھتے ہوئے فیصل نے کہا تھا۔

''کہو۔'' جی ایم نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے بلیو جینز کے ساتھ لیمن کلر کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔

فیصل نے ایک نظر جی ایم کے لباس کو دیکھا تھا۔ کچھ توقف کیا تھا اور کہنا شروع کیا تھا۔

''اصل میں... میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں، ڈریسنگ کا ٹرینڈ تبدیل ہو رہا ہے۔ ٹی

شرٹس کا سائز بھی چھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔ انفیکٹ شرٹس کا سائز تو بہت چھوٹا ہو گیا ہے۔ اصل میں......''

''جو کچھ کہنا ہے کہو، اِدھر اُدھر کی مت ہانکو۔''

''ہاں بتاتا ہوں۔ آپ نماز پڑھ رہے تھے تو سجدے کے درمیان آپ کی شرٹ بیک سے کافی زیادہ اٹھ جاتی تھی۔ جس سے بیک نظر آ رہی تھی۔ بیک خوداتی نیوڈ تھی کہ لاشعوری نظر کے بعد میں دوسری نظر ڈال ہی نہیں سکا۔ مرد کا ستر ناف سے لے کر گھٹنوں تک ہوتا ہے۔ سو ناف سے گھٹنوں تک کا حصہ اگر نماز میں ڈھکا ہوا نہ ہو تو نماز نہیں ہوتی ڈریسنگ کے سلسلے میں احتیاط کر لینی چاہیے تو اچھی بات ہے۔ نماز بہتر بنانے کے لیے......''

جی ایم سینے پر ہاتھ باندھے فیصل کو دیکھے گیا تھا۔ خاموش ہونے پر فیصل عزت افزائی کا منتظر تھا۔

''یعنی اب مجھے دوبارہ نماز پڑھنی چاہیے۔'' ہاتھ ہنوز باندھے ہوئے تھے۔ فیصل جی ایم کی بات سن کر چونکا تھا۔

''آں...... ہاں...... پڑھ لیں تو بہتر ہے۔''

''لیکن اب بھی سجدے میں جا کر شرٹ اوپر کو اٹھے گی۔''

''گھر جا کر پڑھی جا سکتی ہے۔''

''گھر جاتے ہوئے دیر ہو جائے گی۔ نماز قضا ہو جائے گی۔''

جی ایم کی بات سن کر فیصل چند لمحے خاموش ہو گیا۔

''اوور آل کے ساتھ پڑھ لیں۔'' کچھ دیر بعد فیصل نے تجویز پیش کی۔

''میرے پاس تو اوور آل ہے ہی نہیں۔''

''میرا لے لیں۔'' فیصل نے کندھے پر رکھا اوور آل پیش کیا۔

جی ایم نے مسکراتے ہوئے لے لیا۔

اوور آل پہن کر وہ مسجد کے اندر جانے لگا۔

''حوصلہ افزائی کا شکریہ۔'' اندر جاتے جی ایم نے فیصل کے الفاظ سنے تو رک گیا۔

''تمہارا شکریہ۔ اتنی اہم بات کی طرف توجہ دلائی، تمہیں دیر تو نہیں ہو رہی۔'' جی ایم نے کہا تھا۔

''اسے دیر نہیں کہتے۔'' فیصل کی آنکھوں میں روشنی تھی۔

''او کے۔ میرا انتظار کرو۔ میں نے تم سے کچھ کہنا ہے۔'' جی ایم یہ کہہ کر اندر چلا گیا۔

فیصل کافی خوش تھا۔ اسے جی ایم کا انداز اچھا لگا تھا۔ ویسے مسجد میں جب وہ جی ایم کے ساتھ بیٹھا اس کے نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا تب اس نے نوٹ کیا تھا کہ جی ایم کی ناک سجدے میں زمین پر ٹکی ہوئی ہے۔

پندرہ منٹ تک وہ دوبارہ فیصل کے سامنے تھا اور اسے اوور آل اتار کر دے رہا تھا۔

''مجھ سے دوستی کرو گے۔'' اوور آل اتارتے ہوئے جی ایم نے کہا تھا۔

''کیوں نہیں۔'' فیصل مسکرایا تھا۔

''اب تم نے گھر جانا ہے؟'' جی ایم نے پوچھا تو فیصل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آؤ میں تمہیں ڈراپ کر دوں۔''

''نہیں میں بس پر چلا جاؤں گا۔''

''دوست بھی مانتے ہو اور غیریت بھی برتتے ہو۔''

''ایسی بات نہیں، میں گاڑی پر آپ کے ساتھ چلا گیا تو ماں کو اچھا نہیں لگے گا۔''

فیصل کے جواب پر جی ایم حیران ہوا تھا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ......'' فیصل نے توقف کیا تھا۔ ''کیونکہ انہیں امیر لوگ اچھے نہیں لگتے۔''

جی ایم کی حیرت میں اضافہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ جی ایم مزید کچھ پوچھتا فیصل بول پڑا۔

''آپ پلیز ایسا کچھ مت پوچھیئے گا جو میں نہ بتا سکوں۔''

اور پھر جی ایم نے مزید کچھ نہیں پوچھا تھا۔

❁❁❁

سعد آج ورکشاپ سے آیا تو معمول سے زیادہ خوش تھا۔ ورکشاپ قریب ہی تھی۔ دوپہر کا کھانا کھانے وہ گھر آیا کرتا تھا اور اس وقت وہ کھانا کھانے آیا تھا۔

اپنے کمرے میں مسہری پر بیٹھا وہ کھانے کا انتظار کر رہا تھا جو شمع لے کر آنے والی تھی۔ مسہری کے سامنے تین کرسیاں پڑی تھیں۔ یہ مسہری اور کرسیاں شمع کے جہیز کی تھیں۔

شمع کھانا لے آئی۔ بھنی ہوئی دال اور روٹیاں۔

''کھانا بعد میں کھاتے ہیں، پہلے میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔'' سعد نے چھابی کو ہاتھ سے پرے کیا تھا۔ شمع اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''کیا؟''

''منہ دکھائی۔''

''اب؟ چار مہینے بعد!''

''تو کیا اب نہیں دے سکتا۔''

''میں نے یہ تو نہیں کہا۔''

''تو پھر ہاتھ آگے کرو۔''

شمع نے اپنا بایاں ہاتھ آگے کر دیا۔

''اوں ہوں بایاں نہیں۔ دایاں ہاتھ دو۔''

شمع نے دایاں ہاتھ آگے بڑھایا تو سعد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دودھیا ہاتھ۔ سعد کو شمع کے ہاتھ بہت پیارے لگتے تھے۔ نرم و نازک ایسے جیسے تراشے ہوئے ہوں۔

سعد نے جیب سے چاندی کی انگوٹھی نکالی اور شمع کی شہادت کی انگلی میں پہنا دی۔ انگوٹھی کا ڈیزائن مور پنکھ سے مشابہہ تھا۔

''سونے کی اوقات نہیں ہوئی۔ اس لیے چاندی کی انگوٹھی لے آیا ہوں۔'' سعد کا لہجہ دھیما تھا۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ میرے لیے سونے کی انگوٹھی سے بھی زیادہ قیمتی ہے، منہ دکھائی جو ہے۔'' شمع نے مسکراتے ہوئے انگوٹھی کا ڈیزائن دیکھا تھا۔ مور پنکھ سے مشابہ ڈیزائن والی انگوٹھی اسے بے حد پسند آئی تھی۔

شمع کی بات سن کر سعد کھل اٹھا۔

''تھوڑے امیر ہو جائیں گے تو اس ڈیزائن کی سونے کی انگوٹھی بنوا لیں گے، تبدیل کر لیں گے اسے سونے سے۔'' سعد کا لہجہ مستحکم تھا۔

''اف سعد کیسی باتیں کرتے ہیں، مجھے یہی چاندی کی انگوٹھی بہت اچھی لگی ہے۔ یہی بہت ہے۔ سونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی تو اتنا سونا ہے میرے پاس۔ آٹھ تولے تو آپ نے حق مہر میں دیا تھا۔ امی ابو نے الگ دیا تھا۔ اتنے سارے سونے کا کیا کروں گی۔''

شمع کی بات سن کر سعد نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس سر ہلا دیا۔

''ویسے سعد ایک بات تو بتائیں۔ آپ نے انگوٹھی دائیں ہاتھ میں اور شہادت کی انگلی میں کیوں پہنائی ہے۔ بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں کیوں نہیں پہنائی۔'' سعد مسکرا دیا۔

''تمہاری منہ دکھائی ہے۔ اس لیے میں نے تمہاری سہولت کے لیے دائیں ہاتھ میں پہنائی ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم اسے کبھی اپنے سے علیحدہ نہ کرو۔ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے،

میری خوشبو بن کر۔ ہاں جب سونے کی انگوٹھی لے دوں گا تب بھی اس کی جگہ سونے کی انگوٹھی اپنے ہاتھوں سے پہناؤں گا اور شہادت کی انگلی میں اس لیے پہنائی ہے کہ مجھے انگوٹھی اسی انگلی میں اچھی لگتی ہے۔ زمانے کی ریت چاہے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں انگوٹھی پہنانے کی ہو مجھے شہادت کی انگلی میں اچھی لگتی ہے۔ سوتم انگوٹھی شہادت کی انگلی میں ہی پہنو گی۔'' بات میں استحقاق تھا۔

شمع کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''سونے کی انگوٹھی کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر آپ کی خواہش ہے تو ٹھیک ورنہ مجھے تمام عمر کے لیے یہی کافی ہے، آپ کھانا کھائیں، ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

''تم آؤ تو اکٹھے کھاتے ہیں۔'' کھانا وہ دونوں اکٹھے کھاتے تھے۔ شمع کے بغیر سعد کا کھانے کو دل نہیں کرتا تھا۔

''پاکیزہ کو بھی چاندی کے زیورات اچھے لگتے تھے، چاندی کے جھمکے بنوائے تھے۔ اس نے کڑھائی کر کر کے، خوبصورت سے۔ ہر وقت پہنے رہتی، بعد میں ابو نے مدرسے کے لیے دے دیئے۔'' کھانا کھاتے ہوئے شمع اداسی سے بولی۔

''یہ آپ نے دیکھے نہیں میں نے آج کرسیوں کے کور بھی تبدیل کیے ہیں۔ یہ کڑھائی والے کور پاکیزہ نے اپنے جہیز کے لیے کاڑھے تھے۔ بڑی محنتی تھی میری بہن، اللہ اسے جنت نصیب کرے، رمضان میں اس کی کاڑھی ہوئی چادر مسہری پر بچھاؤں گی ان چیزوں سے مجھے پاکیزہ کی خوشبو آتی ہے۔'' شمع نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

کھلکھلاتی، پراندے والی پاکیزہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی تھی۔

''کھانا تو کھاؤ۔'' سعد نے شمع سے کہا تو وہ ایک بار پھر کھانا کھانے لگ گئی۔

کھانا کھانے کے بعد سعد نے اس رومال سے ہاتھ پونچھے جس میں روٹیاں لپٹی تھیں۔

''میں نے کچھ اور بھی کہنا ہے تم سے۔''

''جی کہیے۔''

سعد کہنے سے ہچکچا رہا تھا۔ تھوڑے توقف کے بعد اس نے کہہ دیا۔

''اگلے ہفتے ہم کراچی جا رہے ہیں۔''

''کیوں؟'' شمع کو حیرت ہوئی تھی۔

''میرا ایک دوست ہے یہیں ملتان کا۔ کراچی کام کرتا ہے۔ ایک فیکٹری میں۔ جتنا

میں پورے مہینے محنت کر کے کماتا ہوں۔ اس سے چار گناہ اس کی تنخواہ ہے۔ میرے کہنے پر اس نے میرے لیے بات کی ہے تو منیجر نے کہا ہے کہ اگر آدمی صحت مند ہے اور ٹھیک کام کر سکتا ہے تو بلوا لو۔ تو اسی سلسلے میں۔ میرے دوست نے وہاں ہمارے لیے مکان بھی دیکھ لیا ہے۔''

سعد کی بات شمع نے پُرسکون ہو کر سنی۔ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی اور پھر بولی۔

''نہیں سعد، ہم نے وہاں نہیں جانا۔ یہاں سب ٹھیک تو ہے۔ آپ کی آمدنی سے اللہ کا شکر ہے اچھا گزارا ہو جاتا ہے۔'' شمع نے صاف انکار کیا تھا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن صرف گزارا تو نہیں کرنا۔ میں تمہیں آسائشیں دینا چاہتا ہوں۔ جو یہاں ممکن نہیں۔''

''میں کوئی آسائش نہیں چاہتی۔ میں اپنوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ یہاں میرے امی ابو ہیں۔ آپ کے امی ابو ہیں۔ صرف پیسوں کے لیے وہاں جانا، یہ غلط بات ہے۔'' شمع کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ سعد نے لمحہ بھر سوچا تھا۔ شمع کی بات میں وزن جو تھا۔

''صرف محبت سے میرا گزارا نہیں ہوتا۔'' یہ شمع کا کہا ہوا فقرہ ہی تھا جو سعد کے کانوں میں گونجا تھا۔

''پاکیزہ کو ابھی نہیں بھولی نا، اسی لیے جذباتی ہو رہی ہے۔ خواہشیں مرتی تھوڑی ہیں، انہیں تو قابو میں کرنا پڑتا ہے، تھپک تھپک کر سلانا پڑتا ہے اور میں نے شمع کو کوئی سمجھوتا نہیں کروانا۔'' لمحہ بھر میں سعد نے یہی سوچا تھا۔

''تمہاری بات ٹھیک ہے شمع، امی ابو سے ہم فون پر بات کر لیا کریں گے۔ توقیر نے دکان پر فون رکھ لیا ہے۔ پی سی او کا کام دیتا ہے اور پھر آتے جاتے رہیں گے نا۔''

''فون پر بات بھلا ساتھ رہنے کے برابر ہو سکتی ہے۔ یہاں سے کراچی بہت دور ہے۔ کہاں آ جا سکیں گے۔ آنے جانے کا تو آپ ایسے کہہ رہے ہیں جیسے دونوں شہر ایک ہی گلی میں ہوں۔ اگر ایسا ہی آپ کو شوق ہے فیکٹری میں کام کرنے کا تو یہیں ملتان میں کسی فیکٹری میں کام کر لیں۔''

''یہاں کون سی فیکٹریوں پر فیکٹریاں لگی ہیں۔ جو ایک دو ہیں وہاں ورکرز کی تنخواہ بس گزارے لائق ہے۔ شمع مان جاؤ نا۔''

''نہیں سعد فضول بحث مت کریں۔ میں ملتان سے باہر اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔'' شمع نے برتن سمیٹے اور اٹھ کر جانے لگی تھی۔

"شمع تمہیں میری قسم، کراچی جانے کے لیے مان جاؤ۔" سعد نے حربہ استعمال کیا تھا۔
جاتی شمع رک گئی۔

"قسم خدا کے سوا کسی کی نہیں ہوتی۔ ایسا کہنے سے بھی گناہ ہوتا ہے۔" اتنا کہہ کر شمع پھر سے جانے لگی کہ سعد جلدی سے شمع کے سامنے آگیا اور رکاوٹ بن کر سامنے کھڑا ہو گیا۔

"مجھے باہر جانے دیں اور اگر آپ کو کراچی جانے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر اکیلے چلے جائیں۔" شمع نے سائیڈ سے نکلنے کی کوشش کی تو سعد نے کوشش کو ناکام بنا دیا۔

"تمہارے بغیر میرا دل نہیں لگتا، اس لیے اکیلا جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، تمہیں میری محبت کا واسطہ پلیز مان جاؤ کراچی جانے کے لیے۔" سعد زندگی میں آج پہلی بار کسی سے اتنی منت کر رہا تھا۔

شمع نے نظریں اٹھا کر سعد کو دیکھا تھا۔ شکایتی نظروں سے۔ سعد اسے اپنی محبت کا واسطہ دے کر کچھ ماننے کا کہہ رہا تھا۔ انکار کے تمام راستے مسدود تھے۔

"جو دل آئے کریں۔" شمع نے اسے ایک طرف دھکیلا تھا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

"یاہو۔" سعد نے خوشی سے نعرہ لگایا تھا جو شمع کو زہر لگا تھا۔

"ہائے اتنی دور امی ابو کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جاؤں گی۔" کچن کی طرف جاتے ہوئے شمع نے پریشان ہو کر سوچا تھا۔

❁❁❁

سیمنٹ سے بنا ہوا بنچ گراسی پلاٹ کے دائیں کونے پر تھا۔ جس پر اس وقت فیصل اور جی ایم بیٹھے تھے۔

گھاس کا سبز سبز سا رنگ آنکھوں کو بہت بھلا محسوس ہوتا تھا۔ پلاٹ کے بائیں سائڈ پر دائرے کی صورت میں گلاب کے پودے لگے تھے جن پر لگے سرخ گلاب کے پھول بڑے بھلے محسوس ہوتے تھے۔ گلاب کے پودوں سے کچھ فاصلے پر شیشم اور جامن کے درخت تھے۔ جامن کا درخت ہر سال اپنے موسم میں پھل بھی دیتا تھا۔

"تمہیں ایک بات بتاؤں تم ضرور حیران ہو گے۔" جی ایم نے کہا تھا۔

"تمہاری ہر بات ہی حیران کن ہوتی ہے، جیسے اس وقت تمہاری جیب سے جھلکتا سگریٹ کا پیکٹ۔" فیصل بھی اب جی ایم کو آپ کی بجائے تم، کہہ کر پکارتا تھا۔

"یہ!" جی ایم نے مسکرا کر پیکٹ جیب سے نکال کر ہاتھ میں لیا تھا۔ برانڈڈ سگریٹ کا چمکتا ہوا پیکٹ جی ایم کے مردانہ ہاتھ میں جچتا تھا۔

"عام سی بات ہے سگریٹ پینا، میں بھی پی لیتا ہوں۔ ایک مرد کی شخصیت کو سوبر بناتا ہے۔"

ہنسنے کی باری فیصل کی تھی۔ سو وہ ہنسا بھی تھا۔

"تم کیوں ہنسے ہو؟" جی ایم نے سگریٹ کا پیکٹ شرٹ کی جیب میں رکھنے کی بجائے پینٹ کی جیب میں ڈالا۔

"ویسے ہی، تمہاری باتیں عجیب لگیں، میرے نزدیک تو عیب ہے، سگریٹ پینا اور تمہارے نزدیک فیشن۔ ہماری سوچ، ہمارا لائف سٹائل، ہمارا اسٹیٹس سب کچھ ڈیفرنٹ ہے پھر بھی ہم دوست ہیں، ہے نا عجیب بات۔"

"اس میں عجیب کیا ہے، دوستی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔" جی ایم نے پینٹ کی جیب

سے سیل فون نکالا تھا۔میسج کی بیپ جو بجی تھی۔

''یہی تو المیہ ہے۔اس بات کو سمجھ لیں تو کتنے مسائل حل ہو جائیں۔ زندگی میں دو رشتے ایسے ہیں جو انسان چنتا ہے۔ باقی سارے رشتے تو خدا کی مرضی سے اسے پیدائشی طور پر ملتے ہیں اور دو رشتے جو انسان چنتا ہے وہ ہیں دوست اور رفیقِ حیات اور ہم ان دو رشتوں کو چننے میں بھی مادی چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ خاص طور پر دولت۔ اگر انسان سوجھ بوجھ سے، محبت سے ان رشتوں کو چُنے تو ان رشتوں کو نبھانے میں دشواری ہی نہ ہو۔'' فیصل کہتا رہا اور جی ایم اسے دیکھتا چلا گیا۔

''اور ہاں ایک بات اور۔ صرف یہی دو رشتے ہیں جو ٹوٹ سکتے ہیں۔ باقی سارے رشتے تو قبر تک ساتھ جاتے ہیں۔''

فیصل خاموش ہوا تو جی ایم نے فیصل کو غور سے دیکھا۔کس قدر مطمئن چہرہ تھا فیصل کا۔

''باتیں تو تم بہت اچھی کرتے ہو۔اچھا تو پھر تم نے مجھے چننے میں سوجھ بوجھ اور محبت سے کام لیا تھا۔''

جی ایم کی بات پر فیصل سوچ میں پڑ گیا۔

''نہیں پتا ہی نہیں چلا، نہ سوجھ بوجھ کا وقت ملا اور نہ ہی محبت سے کام لیا۔تمہاری دوسری بار پیشکش کو رد نہیں کر سکا۔''

جی ایم مسکرا دیا۔

اس لیے کہ ہمارے درمیان دوستی کے علاوہ بھی کچھ رشتے ہیں۔'' جی ایم نے ذرا سنبھلتے ہوئے کہا تھا۔

''کیا مطلب اور کیسے رشتے؟'' فیصل حیران ہوا تھا۔

''اس بات کو چھوڑو، میں نے تمہیں کہا تھا کہ تمہیں ایک بات بتاؤں گا تم ضرور حیران ہو گے، تم نے پوچھی ہی نہیں وہ بات۔''

''ایک تو درمیان میں باتیں چھوڑنے کی تمہاری بڑی عجیب عادت ہے۔ چلو اب بتاؤ وہ بات جسے سن کر میں نے حیران ہو جانا ہے۔''

''تم اپنا پیدائش کا سن بتاؤ۔''

''کیوں؟'' کیوں کہنے کے ساتھ فیصل نے اپنا پیدائش کا سن بھی بتا دیا۔

''اور میں اس طرح تم سے دو سال بعد پیدا ہوا ہوں کیوں کہ میرا پیدائش کا سن تمہارے دو سال بعد آتا ہے۔

''ہیں......!!'' فیصل واقعی حیران ہوا تھا۔اس نے جی ایم کو اوپر سے نیچے تک دیکھا تھا جو اس سے دو تین سال بڑا محسوس ہوتا تھا۔

''یہ قد کاٹھ تو مستقل ایکسر سائز اور جم جانے کا نتیجہ ہے اور رہ گئی بات تم سے سینئر ہونے کی تو وہ یہ کہانی ہے کہ میری مدر کو شوق تھا کہ میں چھوٹی عمر میں ہی اپنی تعلیم مکمل کر لوں۔ تم یقین کرو جب میں نے میٹرک پاس کیا اس وقت میں صرف تیرہ سال کا تھا اور یہی وجہ ہے کہ میں تم سے سینئر ہوں۔''

جی ایم نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔تو فیصل نے سر ہلا دیا۔

''واقعی حیران ہونے والی بات ہے۔''

''اچھا میں اب چلتا ہوں، لیکچر شروع ہونے والا ہے اور تمہارا اب کس چیز کا لیکچر ہے؟'' فیصل نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''میرا......میرا pharma کا لیکچر ہے۔''

''چلو پھر تم pharma کے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جاؤ اور میں Biochemistry کے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جاتا ہوں۔ ویسے تم نے Biochemistry کے لیے کس Author کی بک پڑھی تھی؟''

جی ایم سوچ میں پڑ گیا۔ایسی باتوں پر وہ الجھ جاتا تھا۔

''میں نے جو پڑھی تھی اسے چھوڑو، تم لائبریری سے بکس لے کر خود جج کر لیا کرو جو بک اچھی لگے وہی پڑھ لو۔''

''مشورے کا شکریہ...... یہ تو مجھے پتا ہے اور اسی طرح کر رہا ہوں۔سینئر ہو کر بھی تم ہیلپ نہیں کرتے، اچھا اب جا رہا ہوں، پھر ظہر کی نماز کے وقت ملاقات ہو گی۔تم بھی جاؤ۔''

فیصل کھڑا ہو گیا۔اس نے کتابیں سنبھالیں، جی ایم سے ہاتھ ملایا۔ جسے جی ایم نے پکڑنے کے بعد نہ چھوڑا۔

''آج لیکچر مت لو۔تم سے بہت سی باتیں کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔'' جی ایم نے فیصل کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔

''نہیں، سٹڈی پر نو کمپرومائز، میں نے تمہاری بری عادات ترک کروائی ہیں نہ کہ تم نے میری اچھی عادات چھڑوائی ہیں۔ ٹائم ہوتا تو تمہیں لیکچر تھیٹر تک چھوڑ آتا چلو اچھے بچے کی طرح خود بھی جاؤ اور مجھے بھی جانے دو۔'' فیصل نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ جی ایم کے ہاتھ سے چھڑوایا اور جانے کے لیے قدم بڑھانے لگا۔

''کوئل کو زیادہ ٹکٹکی باندھ کر مت دیکھا کرو۔'' جی ایم کی آواز نے فیصل کا تعاقب کیا۔ فیصل کا دل کوئل کا ذکر سن کر بڑی زور سے دھڑکا تھا، ساتھ میں ڈھیر ساری شرمندگی بھی ہوئی تھی۔

''میں کسی کوئل کو نہیں دیکھتا دیکھتا۔'' فیصل نے مڑ کر کہا تھا اور وہاں سے چلا گیا۔ شرمندہ ہوتا ہوا۔

ساتھ میں یہ بھی سوچا تھا کہ جی ایم کو کس طرح پتہ چل گیا اور پیچھے بنچ پر بیٹھا جی ایم ہنسنے لگ گیا تھا۔

❁ ❁ ❁

کراچی جیسے بہت بڑے شہر کے حد سے زیادہ گنجان آباد علاقے کے ایک چھوٹے سے گھر میں شمع کا دل دوسرے دن سے ہی گھبرانے لگ گیا تھا اور دوسرے دن ہی اس نے سعد سے کہہ دیا تھا کہ یہاں آنا بے کار رہی ہے۔ ہم گھر چلتے ہیں واپس، اپنا گھر اپنا ہوتا ہے۔

سعد مسکرایا تھا۔

''شمع اب آگئے ہیں تو تھوڑی ہمت ہی کر لو، کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے یہ قدم تمہارے لیے اٹھایا ہے، میں تمہیں دنیا کی ہر خوشی دینا چاہتا ہوں کہ تمہیں کبھی احساسِ محرومی نہ ہو کہ ہم غریب ہیں۔ دیکھ لینا، گاڑی بنگلہ میں تمہیں دنیا کی ہر آسائشیں مہیا کروں گا۔'' سعد نے ٹھہر ٹھہر کر کہا تھا۔ شمع سعد کو بس دیکھ کر رہ گئی۔ حیران صورت لیے اسے اس چیز کا اندازہ تھا لیکن یہ نہیں لگتا تھا کہ صورتِ حال اس قدر بڑھ چکی ہوگی۔

''سعد میں......'' شمع کو کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ اسی لیے وہ مزید کچھ کہنے سے اٹکی تھی لیکن کچھ توقف کے بعد اس نے کہہ دیا۔

''سعد میں آپ کو کس طرح واضح کروں، شادی سے پہلے آپ سے میں نے جن باتوں کا یا جن خواہشات کا اظہار کیا تھا وہ سب ختم ہو چکی ہیں، پاکیزہ چلی گئی۔ میں نے بھی ایک دن چلے جانا ہے، آپ نے بھی چلے جانا ہے اس درمیان کہیں پیسہ نہیں ہے، مجھے کسی قسم کی آسائش کی خواہش نہیں رہی، بس آپ کا ساتھ چاہیے، مرتے دم تک۔'' شمع نے آنکھیں موند کر سر سعد کے کندھے پر ٹکا دیا تھا۔ ایک تحفظ کا احساس ہوا تھا۔ سعد مسکرایا تھا۔ بڑی رنگین مسکراہٹ تھی۔

''خواہشیں مرا نہیں کرتیں، بلکہ مرے بغیر ہی کہیں دفن ہو جاتی ہیں، جو کبھی کبھی اپنی قبر [illegible] ہیں۔'' سعد [illegible] ان باتوں کا اختتام سعد کی اسی سوچ پر ہی ہوتا

تھا۔

سعد نے بڑے دھیمے انداز میں شمع کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ اسے شمع کے سیاہ، چمکتے ہوئے لمبے بال بہت پسند تھے۔

''تمہارے بال بہت خوبصورت ہیں، دل کرتا ہے کہ تمام عمر انہیں ہاتھ لگاتا رہوں۔''

شمع نے آنکھیں کھولیں اور سعد کی طرف دیکھا۔ شمع کی غزالی آنکھوں میں محبت اور سرشاری کے رنگ تیر رہے تھے۔

سعد کو دیکھتے ہوئے وہ مسکرائی اور پھر ایک نظر اپنے بالوں پر ڈالی۔ نیم گندھے ہوئے بال اپنے بانکپن کے بارے میں پہلی نظر میں بتاتے تھے۔

''پاکیزہ کے بال مجھ سے بھی زیادہ اچھے، گھنے اور لمبے تھے۔ میں اس کے بالوں کو رشک سے دیکھا کرتی تھی۔ کمر سے بھی نیچے تک جاتے تھے۔''

شمع کو یک دم پاکیزہ کے بال یاد آگئے تھے۔

سعد کے چہرے پر سجی مسکراہٹ تھوڑی پھیکی پڑ گئی۔ اسے شمع کی بات بے موقع لگی تھی لیکن اس نے کچھ کہا نہیں تھا۔

❁ ❁ ❁

''کیا کوئی بندہ اس قدر خوبصورت ہوتا ہے کہ کوئی اسے دیکھے تو دیکھتا ہی چلا جائے۔ اسے دنیا میں اس بندے کا چہرہ ہی دنیا کا حسین ترین لگے۔'' سونیا یہ سوچتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ کافی دیر سے وہ سونے کے لیے لیٹی ہوئی تھی لیکن اسے نیند نہیں آرہی تھی۔

''خوبصورتی کا معیار ہر انسان کے لیے مختلف ہوتا ہے جیسے مجھے اس ورکر کے خدوخال بے حد حسین لگے ہیں۔ کیا پتا وہ باقی دنیا کے لیے عام سے ہی ہوں۔'' یہ سوچتے ہوئے سونیا نے اپنا چہرہ گھٹنوں پر رکھ دیا۔

جہازی سائز بیش قیمت بیڈ کے بیچوں بیچ وہ گھٹنوں پر چہرہ رکھے بیٹھی تھی۔ بالوں کو کٹوانے کا رواج ابھی نیا نیا تھا اور سونیا نے ایک بے حد خوبصورت سٹائل میں بال کٹوائے ہوئے تھے جو اس کے چہرے کی مناسبت سے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ شب خوابی کا ہلکے گلابی رنگ کا سوٹ بھی اس کی شخصیت سے مطابقت رکھتا تھا۔

''کیا اس شخص کا چہرہ دنیا کے حسین ترین چہروں میں ہے؟'' دماغ نے سوال اٹھایا تھا۔

''نہیں، اس شخص کا چہرہ دنیا کا حسین ترین چہرہ ہے اور یہی چہرہ میرے آئیڈیل کا بھی چہرہ ہے۔'' دل نے فٹ جواب دیا تھا سوال ختم ہونے سے بھی پہلے۔

سونیا نے گھبرا کر چہرہ گھٹنوں سے اٹھایا تھا۔ جیسے چوری پکڑے جانے کا خدشہ ہو۔ دل مسکرا اٹھا تھا۔

''صرف شکل وصورت پر مرمٹنا کہاں کی عقل مندی ہے ایسے بہت سے ہیں راہوں میں۔'' دماغ نے کہا تھا اور سونیا نے جلدی سے سر ہلا دیا تھا۔

سونیا کی حرکت پر دل ایک بار پھر مسکرا دیا تھا۔

❁❁❁

شیشے کا بنا کیبن جس میں سعد بے مقصد کھڑا تھا کچھ دیر پہلے میڈم نے اسے بلوایا تھا اور پانچ منٹ اسے کھڑا رکھا تھا۔ الٹے سیدھے ٹیبل پر ہاتھ مارے تھے۔ خوامخواہ میں درمیان میں سعد کا جائزہ بھی لیا تھا۔

''خدوخال ہوں یا جسامت واقعی خدا کا بنایا ہوا شاہکار ہے اور مجھے یہ چاہئے۔'' دل نے بے دھڑک کہا تھا اور سونیا بڑے زور سے اچھلی تھی۔

اسے دل سے ایسی بے تکلفی کی ہرگز امید نہ تھی۔

''بیٹھ جاؤ۔'' مچلتے دل کو سونیا نے سنبھالا تھا۔

سعد میکانکی انداز میں بیٹھ گیا۔

''کہاں رہتے ہو؟''

سعد نے اپنے علاقے کا نام بتایا تھا۔ سونیا کو کسی پھٹے حال علاقے کا نام سننے کی امید تھی اور امید پوری ہونے کے باوجود اسے مایوسی ہوئی تھی۔

''کیا نام ہے؟'' یہ سوال پہلا ہونا چاہئے تھا لیکن سونیا کی طرف سے کیا جانے والا دوسرا سوال تھا۔

سعد نے اپنا نام بھی بتا دیا۔

''یہاں کب سے کام کر رہے ہو؟''

''ابھی ڈیڑھ مہینہ ہوا ہے۔'' سعد نے جواب دیا تھا۔

''میڈم کو کیا ہوا ہے، یہ پوچھنے کا مقصد؟'' سعد نے سوچا تھا۔

''تمہارے والدین ساتھ ہیں؟''

''نہیں جی میں ملتان کا رہائشی ہوں، والدین میرے ملتان ہی ہیں۔ کراچی تو روزگار کے سلسلے میں آیا ہوں یہاں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہوں۔''

سونیا کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ بیوی کا سن کر۔

سونیا نے مزید کوئی سوال نہ کیا۔

''ٹھیک ہے جاؤ۔'' کچھ دیر بعد سونیا نے کہا تھا۔

سعد اٹھ کر چلا گیا اور سونیا نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ کافی دیر وہ اسی انداز میں بیٹھی رہی تھی۔

''شادی شدہ ہے تو کیا ہوا، مجھے تو یہی چاہئے، وہ پہلی بیوی کو چھوڑ بھی سکتا ہے۔'' دل نے ایک بار پھر مچلنا شروع کیا تھا اور سونیا حیران ہو رہی تھی کہ یہ دل کو کیا ہوتا جا رہا ہے جو ایسی فرمائشیں کرنے لگ گیا ہے۔

❁❁❁

''شمع، شمع رحمٰن، کہاں ہیں آپ؟ شمع رحمٰن۔'' سعد صحن کے بیچوں بیچ کھڑا تھا اور شمع کو آوازیں دے رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' شمع ہاتھ پونچھتے ہوئے گھر کے اکلوتے کمرے سے نکلی تھی۔

''چلاّ تو ایسے رہے ہیں جیسے کوئی میلوں دور بیٹھی ہوں۔ آرام سے بلائیں گے تو بھی سنائی دے جائے گا۔ چھوٹا سا تو گھر ہے۔'' شمع سعد کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

سعد کے چہرے کی کھلکھلاہٹ۔ خوش ہی اتنا تھا۔

''آج میں بہت خوش ہوں۔'' سعد اونچی آواز میں بولا تھا۔

''کیوں خوش ہیں؟ بتا دیں لیکن ٹھہریں۔ آپ ابھی مجھے کیا کہہ کر بلا رہے تھے، شمع رحمٰن... میں اپنے پیارے سیاں کو بتانا چاہتی ہوں کہ میرا مکمل نام شمع عبدالرحمٰن ہے۔ ہاں تو آپ کس لیے اتنے خوش ہیں؟''

''کچھ اور کہنا ہو تو کہہ دو پھر بتا دیتا ہوں۔'' سعد کا لہجہ جارحانہ ہو چکا تھا۔

''نہیں، نہیں اور کچھ نہیں کہنا۔ بس آپ بتائیں ایسی کون سی خوشی ہاتھ لگی ہے۔'' شمع کے انداز اور الفاظ دونوں وہ نہیں تھے جن کی سعد کو توقع تھی۔ بہرحال اس نے بتا دیا ''میڈم نے میری تنخواہ ڈبل کر دی ہے، کہتی ہیں کہ انہوں نے آج تک مجھ جیسا محنتی ورکر نہیں دیکھا۔ بہت پسند کرتی ہیں مجھے'' سعد کے چہرے سے خوشی جھلکتی تھی۔

''ماشاءاللہ بہت اچھی بات ہے۔'' شمع کا دل بے شک مرجھایا تھا، ملتان جانے کا راستہ جو مسدود ہوا تھا لیکن وہ سعد کو کہہ نہیں سکتی تھی۔ سو چہرے پر مسکراہٹ سجا لی۔ ''کسی اور کی بھی تنخواہ بڑھائی ہے؟'' شمع نے پوچھا تھا۔

''نہیں صرف میری بڑھائی ہے۔'' سعد نے شمع کا دایاں ہاتھ پکڑا تھا جس کی شہادت

کی انگلی میں مور پنکھ سے مشابہہ ڈیزائن والی چاندی کی انگوٹھی تھی۔ یہ انگوٹھی سعد کو شمع کے ہاتھ میں بہت اچھی لگتی تھی۔ سعد کو لگتا تھا کہ یہ انگوٹھی شمع کے ہاتھ کی خوبصورتی ہے۔ سعد کی عنایت کردہ خوبصورتی۔

''کیا مطلب؟ صرف آپ کی؟ تو فیکٹری میں باقی سارے ورکر نکمے ہیں کسی اور کی تھوڑی سی بھی نہیں بڑھائی اور آپ کی ڈبل کر دی۔

''مجھے اس کا نہیں پتا، بس ہماری میڈم کافی موڈی ہیں۔'' سعد نے بے دھیانی سے کہا۔

''تنویر کی بھی نہیں بڑھائی؟''

''نہیں''

''تو آپ کہتے تھے کہ تنویر بھی بہت محنتی ہے، پھر تو اس کی بھی بڑھانی چاہیے۔'' شمع نے سعد کے اس ساتھی کا حوالہ دیا تھا جس کے توسط سے وہ یہاں آئے تھے۔

''نہیں اور کسی کی نہیں بڑھائی، میڈم میرے کام سے متاثر ہوئی ہیں اور منیجر سے کہا ہے کہ اس ورکر کی تنخواہ ڈبل کر دو، بس۔''

سعد نے شمع کے ہاتھ میں موجود انگوٹھی کو چھو کر کہا تو نہ جانے شمع کو اس کی یہ خوشی اداس کر گئی۔

شمع کا اگلا سوال تیار تھا۔

''آپ کی میڈم اتنی فارغ ہیں کہ معمولی ورکر کے کام سے متاثر ہونے لگ گئی ہیں؟''

جواباً سعد نے شمع کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ گڑبڑا گئی۔

''میرا مطلب...... کچھ نہیں۔'' شمع شرمندہ ہوگئی۔

''چلو چھوڑو، تم سناؤ دن کیسا گزرا؟'' کچھ دیر بعد وہ ہشاش بشاش لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''آپ کا انتظار کیا، کھانا بنایا، پاکیزہ کی بھی بہت یاد آئی۔ اسلامی مہینے کے حساب سے آج پاکیزہ کو مرے ہوئے پورا سال ہوگیا ہے۔ اللہ جنت میں جگہ دے میری بہن کو۔''

''آمین۔'' سعد نے کہا تھا، اور کتنا عرصہ اسی طرح ہر بات میں پاکیزہ کا ذکر آیا کرے گا۔ ساتھ ساتھ سعد کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا۔

❁ ❁ ❁

''ہاں کیسا ہوا تمہارا فرسٹ ٹرم کا پہلا پیپر؟'' فیصل نے جی ایم سے پوچھا تھا۔ وہ اس وقت مسجد سے باہر نکل رہے تھے، ظہر کی نماز پڑھ کر۔

''ایکسیلنٹ۔'' جی ایم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔ فیصل کو جی ایم کا قہقہہ کافی عجیب لگا۔ ''کتابیں کبھی میں نے تمہارے ہاتھ میں نہیں دیکھیں اور جب پیپر کا پوچھا جائے تو جواب ملتا ہے ایکسیلنٹ، عجیب بات ہے۔'' فیصل نے کہا تھا۔ وہ دونوں قدم سے قدم ملا کر چل رہے تھے۔

جی ایم نے ایک بار پھر زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

''بتاتا ہوں یار...... وہ اس طرح کہ کچھ پیپر جو مجھے آتا تھا وہ تو میں نے حل کر لیا اور جو دو سوال نہیں آتے تھے ان کے لیے میں واش روم چلا گیا، وہاں میں نے کتاب چھپا رکھی ہوئی تھی۔ وہ سوال جلدی جلدی وہاں سے دیکھ لیے اور پھر ہال میں جا کر انہیں بھی پیپر پر چھاپ دیے، ویری سمپل۔'' اتنا کہہ کر جی ایم نے فیصل کی طرف دیکھا تھا جو اس سے ایک قدم پیچھے رک گیا تھا۔

''کیا ہوا؟'' جی ایم نے فیصل کی آنکھوں میں حیرانی کو جان بوجھ کر نظرانداز کیا تھا۔

''تم اس طرح اچھے ڈاکٹر بننا چاہتے ہو؟''

''ڈاکٹر کون پاگل بن رہا ہے۔'' جی ایم کی آواز اس قدر دھیمی تھی کہ ساتھ کھڑا فیصل بھی نہ سن سکا۔

''کیا کہا؟ مجھے سنائی نہیں دیا۔'' فیصل کی آواز میں بھی حیرانی تھی۔

''میں کہہ رہا ہوں کہ اس سے کیا ہوتا ہے۔ ہر کوئی چیٹنگ کرتا ہے۔ میں نے اگر کچھ انوکھے انداز میں کر لی ہے تو کیا حرج ہے۔''

''دوسروں سے ہمیں کیا مطلب؟''

''اچھا چھوڑو، آگے چلو، یہ بات چل کر بھی کی جا سکتی ہے۔'' جی ایم کے کہنے پر فیصل ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد فیصل نے کہا تھا۔ ''ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا کمانے کی ہوس نے تم لوگوں کو غفلت میں ڈالے رکھا۔ یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔''

''اب مزید کوئی بھاشن نہ دو پلیز۔'' جی ایم نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

''بھاشن کون سا بھاشن۔'' فیصل کو جی ایم کے الفاظ انتہائی برے لگے تھے۔

''میں نے تو قرآن مجید کی ایک آیت پڑھی ہے تمہیں سمجھانے کے لیے بس۔'' فیصل نے کہا تھا۔

''یعنی تم نے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا ہے۔'' جی ایم کی آواز کسی کھائی سے آتی محسوس

ہورہی تھی۔

''ہاں میں نے سورۃ التکاثر کی پہلی دو آیات اردو میں پڑھی ہیں۔ آج صبح ہی میں نے سورۃ التکاثر تفسیر کے ساتھ پڑھی ہے، ویسے تم نے بُرا کیا، تمہیں اللہ سے معافی مانگنی چاہیے۔'' جی ایم کا سر جھکتا چلا گیا۔ اسے ندامت ہونے لگی۔

''تمہیں پہلے بتانا چاہئے تھا کہ اب جو بات کر رہے ہو وہ ایک آیت کا ترجمہ ہے۔ میں سمجھا تم خود سے نصیحت کر رہے ہو۔''

چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔ بالآخر فیصل نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور سر جھکائے کھڑے جی ایم سے بولا تھا۔

''دنیا کی حرص بہت بُری چیز ہے، ایک دوسرے سے سبقت لینا ایسے لگتا ہے جیسے ہمارا مقصدِ زندگی بن گیا ہے، تمہیں اللہ سے اپنی حرکت اور اس وقت کے کہے نازیبا الفاظ کی معافی مانگنی چاہیے۔ اچھا اب چلو مجھے دیر ہو رہی ہے۔ امی پریشان ہو جاتی ہیں اگر میں لیٹ ہو جاؤں۔''

فیصل نے جی ایم کو گھسیٹا تو جی ایم چل پڑا۔ اس کے دماغ میں سوچوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔

''اپنی امی سے ملواؤ گے۔'' چلتے ہوئے جی ایم نے کہا تھا۔ بہت سارے جذبات نے اسے یہ کہنے پر مجبور کیا تھا۔

فیصل ہنس دیا۔

''امی سے پوچھوں گا۔ اگر وہ راضی ہوگئیں تو ٹھیک ہے۔ خود سے کچھ کہنا میں مناسب نہیں سمجھتا، پلیز ناراض مت ہونا۔''

''نہیں، نہیں اس میں ناراض ہونے والی کون سی بات ہے۔'' جی ایم نے کہا تھا۔ وہ گہری سوچ میں غرق تھا۔

❁❁❁

سونیا کا دل اسے ایک پل بھی چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ بالآخر اس نے دل کی مان لی۔ سعد میں اس کے آئیڈیل والی صرف ایک بات نہیں تھی اور وہ یہ کہ وہ غریب تھا جبکہ سونیا کا آئیڈیل تو کامیاب ترین شخص تھا۔ بہرحال اس نے دل کے کہنے پر کمپرومائز کر لیا۔ سینتیس سال کی عمر میں ایک ستائیس سال کے مرد کو پسند کرتے ہوئے اتنا کمپرومائز کرنا بنتا بھی تھا۔

اور آج ایک بار پھر سعد میڈم کے سامنے بیٹھا تھا۔ شیشے کے بنے کیبن میں جہاں لکڑی

کی ایک بہت خوبصورت میز ان دونوں کے درمیان تھی۔ لکڑی کی میز پر پیپر ویٹ، پین کیپر کے علاوہ بہت ساری فائلیں بھی پڑی تھیں اور سونیا وقفے وقفے سے سعد کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل اتنا سمجھ لیتا تھا کہ وہ سعد کو یک ٹک دیکھنے کی خواہش پوری نہ کرتی۔

سعد کو اب اپنی میڈم عجیب لگنے لگ گئی تھی۔ اس طرح بے مقصد اپنے شیشے کے بنے آفس میں اسے بلانے کی وجہ اس کو سمجھ نہ آتی تھی۔

سونیا تھوڑا سنبھل کر بولی۔

''تم اپنی زندگی سے خوش و مطمئن ہو؟'' سونیا نے حتی المقدور اپنا انداز ہلکا پھلکا رکھا تھا۔

''جی۔'' اثبات اور حیرانی کا عنصر اس 'جی' میں شامل تھا۔

''تو تم اپنی زندگی میں بہتری نہیں چاہتے؟''

سونیا میڈم کی بات نے سعد کو الجھا دیا۔ وہ کوئی جواب بھی نہیں دے سکا تھا۔

''میں اصل میں...... میں چاہتی ہوں کہ تم میرے ساتھ بیٹھو۔ یہاں ایک اور اس جیسی چیئر ہو اور ہم دونوں اکٹھے بیٹھ کر کام کریں۔'' میڈم کے منہ سے ایسی باتیں سن کر سعد کو عجیب لگا تھا۔ اس نے حیران نظروں سے میڈم کو دیکھا، دور کہیں خطرے کی گھنٹی بھی بجی تھی۔

'مجھ سے شادی کرو گے، سعد اکبر؟'' بالآخر سونیا نے کہہ ہی دیا۔

سعد کو سمجھنے میں کچھ لمحے لگ گئے۔ اس بات کی امید جو نہیں تھی اور جب بات سمجھ میں آئی تو وہ بڑی تیزی سے کھڑا ہو گیا۔ جارحانہ انداز کے ساتھ۔

''نہیں میڈم، میں شادی شدہ ہوں۔'' سونیا نے سعد کی بات بڑے آرام سے سنی۔ اپنی کالے رنگ کی ریوالونگ چیئر کے ساتھ ٹیک لگا کر۔ مسکراتے ہوئے، ہاتھ میں پین گھماتے ہوئے اور پھر اسی اطمینان کو اپنے لہجے میں سمو کر بولی۔

''تو کیا ہوا؟ تم دوسری شادی بھی کر سکتے ہو۔''

سونیا نے پہلی بیوی کو چھوڑنے کا قصداً نہیں کہا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ بات کام خراب نہ کر دے۔ بزنس کی طرح دل کا معاملہ بھی وہ خوب سوچ بوجھ سے نبٹا رہی تھی۔

''سوری میڈم، میں ایسا کسی صورت نہیں کر سکتا، میں اپنی شمع سے بے وفائی ہرگز نہیں کر سکتا۔''

سعد کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ملازمت پر تین حرف بھیجے اور فوراً اس شیشے کے کیبن سے نکل آئے لیکن پتا نہیں کون سے بات اس کے پاؤں کی زنجیر بن رہی تھی۔ اسے روک رہی تھی۔

سونیا کو اس جواب کی امید ہرگز نہیں تھی لیکن بہر حال اب جواب تو موصول ہو چکا تھا۔

وہ ایک بار پھر نرم لہجے میں بولی تھی۔ ''خوب سمجھ بوجھ کے ساتھ۔ سوچ لو، پھر کبھی جواب دے دینا۔'' سونیا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''میرا جواب ہمیشہ نہیں ہے اور میں یہ ملازمت بھی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ آئندہ کبھی نہیں آؤں گا۔ اللہ حافظ۔'' یہ کہہ کر سعد تیزی سے باہر نکل گیا۔

''ارے۔'' سعد کو باہر جاتے دیکھ کر سونیا کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا۔

اسے اس ردِعمل کی بھی امید نہیں تھی لیکن بہر حال......

سونیا نے ایک بار پھر اپنی بلیک ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔

''شمع۔'' سعد کے منہ سے ابھی ابھی سنا ہوا نام اس نے دھرایا تھا۔

تنویر سے اس نے سعد کے بارے میں معلومات لی تھیں۔ جب ساتھ ہی زندگی بھر کا بنانا ہے تو چھپانا کیا۔ یہ سوچ کر اس نے بلا دھڑک تنویر سے سعد کے بارے میں پوچھا تھا۔ تنویر حیران تو ہوا تھا۔ میڈم کو عجیب نظروں سے بھی دیکھا تھا لیکن بہر حال اس نے وہ سب بتا دیا جو وہ جانتا تھا۔

تنویر کے مطابق سعد زندگی میں ڈھیر سارا پیسہ کمانا چاہتا ہے اور ملتان چھوڑ کر کراچی آنے کا واحد مقصد یہ فیکٹری تھی اور اس کی اچھی تنخواہ۔

سو حفظِ ماتقدم سونیا نے سعد کی تنخواہ ڈبل کر دی تا کہ اس کے پیروں کی بیڑیاں کچھ اور مضبوط ہو جائیں اور پھر اس نے سعد سے بات کی۔

تنویر نے اسے سعد کی بقیہ ذاتی زندگی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس لیے سونیا زیادہ سوجھ بوجھ نہیں دکھا سکی۔ اب اس پر سعد کی شمع سے محبت بھی آشکار ہو چکی تھی سو اس نے اب مہرے اس بات کو مدنظر رکھ کر چلنے تھے۔

''سعد واقعی نوکری چھوڑ کر چلا گیا ہے یا پھر آئے گا؟'' یہ وہ سوال تھا جس نے سونیا کو پریشان کیا تھا۔ آنے اور نہ آنے کے اسے برابر چانسز نظر آتے تھے۔

***

''پاکیزہ، پاکیزہ، پاکیزہ تم ہر وقت پاکیزہ کا ہی تذکرہ کیوں کرتی رہتی ہو۔ پاکیزہ مر چکی ہے۔ بھول جاؤ اسے۔ ہر وقت کے تذکرے سے وہ واپس نہیں آنے والی۔'' سعد چلا رہا تھا۔

ساتھ چارپائی پر بیٹھی شمع نے حیرانی سے سعد کو دیکھا تھا۔ جیسے اسے اپنے آنکھوں دیکھے

اور کانوں سنے پر یقین نہ آیا ہو۔

دو آنسو بڑی تیزی سے آنکھوں سے نکلے اور بہتے چلے گئے۔ ایک آنسو بہہ کر نیچے گر گیا جبکہ دوسرا ٹھوڑی پر اٹک گیا تھا۔ اٹکنے والا آنسو بھی دوسرے ہی لمحے گر گیا۔

شمع نے آنکھیں بند کی تھیں جیسے اس جگہ سے فرار چاہتی ہو۔ پھر چپ چاپ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔

شمع کے کمرے سے جاتے ہی سعد کو اپنے الفاظ کی سنگینی کا احساس ہوا تو اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''اوہ، یہ میں نے کیا کہہ دیا، بڑا ظلم کیا شمع پر، ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔''

سعد کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس منہ سے شمع کے پاس جائے۔

''میڈم کی بات پر غصہ تھا تو تھوڑا کنٹرول کر لیتا، اب......'' سر ہاتھوں میں تھامے وہ کتنی دیر بیٹھا رہا۔

آخر ہمت کر کے اٹھا۔ شمع باہر برآمدے میں ایک چوکی پر بیٹھی تھی۔ ایک کمرے کے اس گھر میں شمع کمرے سے نکل کر برآمدے میں ہی بیٹھ سکتی تھی۔

وہ چوکی پر بیٹھی بے آواز رو رہی تھی۔ سعد کو شرمندگی نے آ گھیرا تھا۔ شمع کو اس طرح منہ چھپائے روتے دیکھ کر سعد کو حد درجے افسوس ہوا۔ سعد شمع کے قریب پاؤں کے بل بیٹھ گیا۔

''مجھے معاف کر دو۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سعد نے کہا تھا۔

شمع نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ آنسو بہاتی رہی تھی۔

''اوہ، اب شمع کو کس طرح چپ کرواؤں، ایسا کہا ہی کیوں تھا۔'' سعد نے سوچا تھا۔

''وہ بس فیکٹری میں کچھ گڑبڑ ہو گئی، بس اس لیے غصے میں تھا تو منہ سے الٹا سیدھا نکل گیا مجھے معاف کر دو، سوری۔'' سعد نے شرمندہ لہجے میں کہا۔ اسے شمع کے آنسو تکلیف دے رہے تھے۔

''آپ کا کوئی قریبی عزیز مرتا اور میں اس طرح کہتی تو پتا چلتا کہ کیا بیتتی ہے۔'' شمع نے روتے ہوئے کہا تھا۔

سعد کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ یک دم اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے بُرا نہیں کیا بلکہ بے حد بُرا کیا ہے۔ کسی کا دل دکھانا واقعی حد سے زیادہ بُرا ہوتا ہے۔

شمع کے آنسو بہنے کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آ رہی تھی اور چند لمحوں بعد ساتھ بیٹھا سعد بھی شمع کے ساتھ رو رہا تھا۔

شمع نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ اسے سعد کے رونے پر حیرانی ہوئی تھی۔

''چلیں آپ تو مت روئیں، آپ روتے ہوئے بہت بُرے لگتے ہیں۔'' شمع نے آنکھیں صاف کی تھیں۔

''تم بھی اچھی نہیں لگتی روتے ہوئے۔'' سعد نے بھی اپنے آنسو صاف کیے تھے۔

''آئندہ ایسا مت کہیے گا۔ مجھے آج بہت دکھ ہوا ہے۔'' شمع نے کہا تو سعد کا سر ایک بار پھر شرم سے جھک گیا۔

''وہ بس فیکٹری کی پریشانی تھی، اس لیے.....'' سعد نے بات آدھی چھوڑی تھی۔

''کیا پریشانی تھی فیکٹری کی؟'' شمع نے پوچھا تھا۔

''پریشانی، وہ بس تم نہیں سمجھوگی۔ اب تمہیں کیا بتاؤں۔'' سعد نے پہلی بار شمع سے کچھ چھپایا تھا۔

''تو پھر ایسی چھوٹی موٹی پریشانی میں ایسی بڑی بڑی باتیں سنا دی جاتی ہیں۔ چلو خیر.....'' شمع نے ایک طویل سانس لی۔

''اوہ! میں بھی کیسی لاپرواہ ہوں، آپ پیروں کے بل بیٹھے ہیں اور میں چوکی پر۔'' یہ کہہ کر شمع نے اپنے نیچے سے چوکی کھینچ لی تھی۔ کچھ لمحے پیروں کے بل سعد کے ساتھ بیٹھی رہی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سعد کی کچھ دیر پہلے کی جانے والی بات اسے بُری تو لگی تھی لیکن سعد کے آنسوؤں نے کافی حد تک تلافی کر دی تھی۔

اور سعد کو شمع کا اس طرح چوکی کھینچ لینا بہت اچھا لگا تھا، ویسے اس نے شمع سے کہا ضرور تھا کہ بیٹھی رہو چوکی پر، کچھ نہیں ہوتا۔

کیا ایسی بیوی کے لیے میڈم کی بات مانی جا سکتی ہے؟

بالکل نہیں۔

❀❀❀

نیلی یونیفارم پہنے وہ شش و پنج میں مبتلا کھڑا تھا۔ فیکٹری میں اس کے درجے کے تمام ورکرز کی یونیفارم نیلی تھی۔ کام تو وہ چھوڑ آیا تھا لیکن اب یونیفارم کس لیے پہن لی تھی، اس بات کا سعد کو بھی صحیح طرح سے نہیں پتا تھا۔

''کھڑے کیوں ہیں؟ جائیے نا دیر نہیں ہو رہی۔'' شمع نے کہا تھا۔

''آں ہاں جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر سعد نے دہلیز پار کر لی۔ اتنی پُرکشش تنخواہ چھوڑنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''آج جا کر دیکھتا ہوں کیا ہوتا ہے۔ پھر ہی کوئی حتمی فیصلہ لوں گا۔'' یہ سوچ سعد فیکٹری کی بس پر بیٹھ گیا جو ملازمین کو لے جاتی تھی اور پھر فیکٹری بھی پہنچ گیا۔ کام بھی شروع کر دیا۔

دوسری طرف سونیا بڑی بے چینی سے آفس آئی تھی۔ وہ رات کو صحیح طرح سو نہیں سکی تھی۔ ایک تو سعد کی سوچ اور دوسری بڑی بات کچھ دنوں سے وہ اپنی ایک چھوٹا سا زخم محسوس کر رہی تھی۔ پھوڑا نما زخم۔ اس نے دھیان نہیں دیا تھا لیکن کل رات اس میں اچانک بڑی شدت سے درد اٹھا تھا جو کچھ دیر بعد ختم بھی ہو گیا تھا۔

اس زخم کے بارے میں تو اس نے اپنے فزیشن سے بات کر لی تھی۔ جسے اس نے آج چیک اپ کروانے جانا تھا اور سعد کے سلسلے میں اس نے پورا لائحہ عمل تیار کر لیا تھا اور اس لائحہ عمل پر عمل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ سعد کام پر آئے۔ اب سعد فیکٹری آتا تھا یا نہیں اسی لیے وہ بے چینی سے آفس آئی تھی اور فیکٹری کے اندرونی حصے میں جا کر سعد کو کام کرتے دیکھ کر سونیا نے سکون کا سانس لیا تھا۔ میڈم کو دیکھ کر سعد نے نظریں چرا کر دوبارہ اپنے کام پر توجہ مرکوز کر دی تھی اور سونیا بھی وہاں سے ہٹ گئی۔ ابھی اس نے ہفتہ بھر سعد کو نہیں 'چھیڑنا' تھا۔ یہ اس کے پلان کا حصہ تھا۔

میڈم کے اس طرح بے گانگی سے گزر جانے پر سعد نے سکون کا سانس لیا تھا۔ وہ یہ ملازمت جو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

''ویسے اگر میں میڈم سے شادی کر بھی لیتا ہوں تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ شمع کو بھی جلد از جلد ہر سہولت میسر کر سکوں گا۔ مزہ آ جائے گا۔'' ایک پل کو سعد کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا۔ جسے اس نے دوسرے ہی پل جھٹک دیا تھا اور اپنے آپ کو اچھی طرح سرزنش کی تھی۔

''میں شمع سے بے حد محبت کرتا ہوں، اس کے ساتھ خوش ہوں، زندگی میں تیسرے بندے کی کہیں گنجائش نہیں۔'' سعد نے تجدیدِ محبت کی تھی۔ ایسے موقعوں پر تجدید کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔

❀❀❀

سونیا اپنے فزیشن کے پاس بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر اعظم کراچی کے بہت اچھے ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے زخم دیکھا، تشویش کا اظہار کیا، مشکل مشکل ٹیسٹ کروائے۔ سونیا کو کل آنے کا کہا۔ ٹیسٹ کی رپورٹس ملنے میں دیر جو لگنی تھی۔

اگلے دن سونیا ایک بار پھر ڈاکٹر اعظم کے سامنے بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر اعظم کے ماتھے پر

لکیریں سی ابھری تھیں۔

سونیا کو تسلی دی اور حوصلے سے کام لینے کا کہا تھا۔

اور پھر اسے بتایا تھا کہ سونیا کو Cervical Cancer ہے۔

کینسر کا نام سن کر سونیا سن سی ہو گئی تھی۔ کینسر ایک نہایت خطرناک بیماری ہے۔ اتنا تو سونیا کینسر کے بارے میں جانتی ہی تھی۔

''تو پھر ڈاکٹر اب کیا ہوگا؟'' سونیا نے ہمت سے کام لیتے ہوئے پوچھا تھا۔

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا، تمہیں کینسر سپیشلسٹ کو ریفر کر دیتا ہوں تم ان سے ملو، امریکہ سے انہوں نے سپیشلائیزیشن کی ہے، بہت ہی قابل اونکولوجسٹ ہیں۔ وہ [illegible] بتائیں گے۔''

ڈاکٹر اعظم نے سونیا کو ڈاکٹر مسعود کا کارڈ دیا۔ خود ان سے فون پر سونیا کے سلسلے میں تفصیلی گفتگو بھی کی تھی۔

''گھبرانا نہیں، you are brave lady'' ڈاکٹر اعظم نے شفقت سے کہا تھا اور سونیا میکانکی انداز سے اٹھ کر جانے لگی تھی۔

''ڈاکٹر مسعود کے پاس ابھی چلی جاؤ۔ میں نے تمہارا کہا ہے۔ وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' ڈاکٹر اعظم نے کہا تو سونیا نے سر ہلا دیا۔

❁❁❁

سعد جتنا خوش ہوتا کم تھا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ شمع بھی شرمائی شرمائی بیٹھی تھی۔ سر جھکائے مسکرائے جا رہی تھی۔ دونوں آج بے حد خوش تھے۔ انہیں آج پتا چلا تھا کہ شمع امید سے ہے۔

چھوٹے سے صحن میں چارپائی بچھی تھی۔ جس پر وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ صحن میں پانی کا چھڑکاؤ بھی کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے مٹی کی ہلکی ہلکی خوشبو بھی آ رہی تھی۔

صحن میں چارپائی سعد نے بچھائی تھی۔ چھڑکاؤ بھی اسی نے کیا تھا اور اب وہ چائے بنانے اندر گیا تھا۔ بدذائقہ سی چائے بنا لایا تھا۔ جسے شمع بڑی خوشی سے پی رہی تھی جبکہ سعد خود منہ بسور کر پی رہا تھا۔

''کیا ہوا، منہ کیوں بگاڑ رہے ہیں، پی لیں مجھے تو بہت اچھی لگ رہی ہے۔''

''تمہاری پسندیدگی کا معیار خراب ہے۔''

شمع کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''پاکیزہ بھی یہی کہا کرتی تھی، لیکن مجھے آپ دونوں سے اتفاق نہیں۔ اگر پسندیدگی کا

معیار خراب ہوتا تو کم از کم آپ میرے شوہر نہ ہوتے۔'' وہ مسکرا کر بولی تھی۔

''اوہ ہو...... کہہ تو ایسے رہی ہو جیسے تم نے مجھے چنا ہے، محترمہ تم میری پسند ہو۔ ورنہ تم تو انکار چاہتی تھی۔''

شمع ہنوز مسکرا رہی تھی۔

''وہ انکار بھی بچگانہ تھا۔ چلو اچھا ہوا آپ نے کان نہ دھرے، ورنہ میری زندگی میں ایسی خوبصورت شامیں کیسے آتیں۔'' شمع کی بات سن کر سعد سرشار ہو گیا۔

اس کے آس پاس کہیں بہت سی سُریلی گھنٹیاں بجی ہوں۔ ویسی ہی گھنٹیاں جو شادی سے پہلے شمع کی آواز سن کر بجا کرتی تھیں۔

''ایک بات بتاؤں، مجھے اگر دنیا کا سب سے مہنگا مشروب دیا جائے اور دوسری طرف آپ کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے دی جائے تو پتا ہے میں کیا پسند کروں گی۔''

''کیا؟'' سعد کی آنکھیں روشن ہوئی تھیں۔ جواب کا اسے اندازہ تھا اور اس جواب نے اسے ساتویں آسمان پر پہنچانا تھا۔

''بتا دوں؟''

''ہاں ہاں بتا دو کیا پسند کرو گی۔'' سعد کے لب پھڑپھڑائے۔

''دنیا کا سب سے مہنگا مشروب۔'' شمع نے کھلکھلاتے ہوئے شرارت سے کہا تھا۔

''بھلا مہنگے مشروب کی پیشکش روز روز تھوڑی ہوتی ہے۔'' شمع نے چائے کا ایک گھونٹ مزید اپنے اندر اتارا تھا۔

روشن آنکھیں بجھ سی گئیں مسکراتے لب بھینچ گئے۔

''خواہشیں مرا نہیں کرتیں، مرے بغیر دفن ہو جاتی ہیں اور اپنی قبر سے وہ کبھی بھی نکل سکتی ہیں۔'' سعد کو اپنے سوچے ہوئے الفاظ ایک بار پھر یاد آئے تھے۔

''اکیلی محبت سے میرا گزارا نہیں۔'' شمع کے الفاظ بھی ذہن میں گھومنے لگے تھے۔

''روپیہ، پیسہ، بنگلہ، گاڑی۔'' سعد کو ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے بڑی شدت سے اس کے کان میں سرگوشی کی ہے۔

سعد کے دل پر جیسے منوں بوجھ پڑ گیا۔ وہ جانے لگا تو شمع کی آواز نے اسے روک لیا۔

''میں نے ڈلیوری کے لیے ملتان جانا ہے، کب ملتان چلیں گے؟''

سعد رک گیا۔ لمحہ بھر میں اس نے فیصلہ لے لیا تھا۔

''تین چار مہینوں تک تمہیں ملتان چھوڑ آؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ باہر جانے لگا۔ شمع کو حیرانی

ہوئی۔

''اور آپ؟'' دروازے کے پاس پہنچ کر سعد نے شمع کی آواز سنی تھی۔

''میری خیر ہے۔'' سعد نے کہا اور دروازہ پار کر گیا تھا۔

❋❋❋

سونیا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی۔ اپنے عکس کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے شب خوابی کا ہلکے سبز رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ بال کھلے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی پھیلی ہوئی آنکھیں، لمبی سی ناک اور بھرے بھرے گال، وہ شروع سے باخبر تھی کہ وہ خوبصورت ہے لیکن آج وہ اپنی خوبصورتی کو سراہنے کے لیے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے نہیں بیٹھی تھی۔ نجانے وہ اپنے عکس میں کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ آج سے پہلے اس نے اپنے آپ کو کبھی اتنا اکیلا محسوس نہیں کیا تھا۔

''کیا ہوا میڈم؟ آپ اس طرح کیوں بیٹھی ہیں؟'' نرس اس کے کمرے میں آئی تھی۔

رات اور دن کے لیے علیحدہ علیحدہ نرسوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ رات والی نرس کو خصوصی تاکید کی گئی تھی کہ وہ سونیا کو وقتاً فوقتاً دیکھتی رہے۔

''کچھ نہیں، اور اب تم پھر چکر مت لگانا۔'' سونیا نے درشت لہجے میں کہا تھا۔

نرس چہرے پر ایک مسکراہٹ لے آئی تھی۔ اسے ان چیزوں کی عادت تھی۔ کینسر کا مرض اسی طرح بد مزاج کر دیتا ہے۔ یہ نرس کا تجربہ تھا جو ٹھیک بھی تھا۔ نرس چلی گئی اور سونیا ایک بار پھر اپنے عکس کو گھورنے لگ گئی۔

ڈاکٹر مسعود نے نہ اسے کوئی امید دلائی تھی اور نہ ہی ناامید کیا تھا۔ البتہ ان کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور ہوتا تھا جو سونیا کو خوف زدہ کرتا تھا۔

''سونیا تمہیں کبھی اکیلے پن کا احساس نہیں ہوا۔ اب جیسے تمہارا کوئی رشتہ دار بھی نہیں جو تمہیں تھوڑا سہارا دے سکے۔'' ڈاکٹر مسعود کے اس فقرے کے کئی معنی نکلتے تھے۔

اچانک ہی اس کی آنکھوں کے سامنے سعد کا وجاہت سے بھرپور سراپا گھوم گیا۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ سونیا نے پلکیں جھپکیں۔ پلکیں گیلی ہوئی تھیں اور بند آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل پر ایک زوردار ہاتھ مار کر اس نے اس پر پڑی ساری کاسمیٹکس کی چیزیں نیچے پھینک دیں۔ ایک ہیئر برش پھر بھی پڑا رہ گیا۔ جسے اس نے اٹھا کر بڑی شدت سے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے پر مارا تھا۔ چھن کی آواز سے شیشہ اس جگہ پر دراڑوں سے پر ہو گیا۔ پھر وہ سٹول سے گرنے کے انداز میں نیچے بیٹھ گئی اور پھر چکنے فرش پر اوندھے منہ لیٹ کر بڑی شدت سے رونا شروع کر دیا۔

نرس نے ایک بار پھر اندر جھانکا۔ سونیا کو دھاڑیں مار کر روتے دیکھا تو اسے ہمدردی ہوئی تھی۔ میڈم کو اس طرح رونے کی ضرورت تھی اس لیے اس نے کوئی مداخلت نہ کی۔ دروازے سے باہر جانے سے پہلے اس کی نظر بلا ارادہ چھت کی طرف گئی جس پر شیشے کا نہایت ہی نفیس اور خوبصورت فانوس لگا ہوا تھا۔ نرس نے آج سے پہلے اتنا خوبصورت فانوس نہیں دیکھا تھا۔ بہت ہی خوبصورت فانوس تھا۔ دروازہ بند کر کے باہر چلی گئی اور سونیا اسی شدت سے روتی رہی۔

ساڑھے چار مہینوں کی کیموتھراپی کے بعد اب پھر سے صورتِ حال بگڑنے لگ گئی تھی۔ کیموتھراپی کا ریسپانس بڑھنے کی بجائے کم ہوتا جا رہا تھا اور یہ صورتِ حال کافی تشویش ناک تھی۔

''سونیا تم ایک سمجھ دار عورت ہو۔ ایک بہت بڑی بزنس آئی کون۔ مجھے امید ہے کہ تم میری بات سمجھ پاؤ گی۔ کیمو نے رسپانس دینا چھوڑ دیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ تم آج کل میں ہاسپٹل شفٹ ہو جاؤ۔ دوسرا یہ کہ اب تمہیں ایک رسک لے لینا چاہیے۔ آپریشن کے سلسلے میں اور یہ رسک لینا ضروری بھی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا۔ کچھ دنوں تک ڈاکٹر لیونسن پاکستان آ رہے ہیں۔ بہت مایہ ناز اونکولوجسٹ ہیں جس سٹیج پر تمہارا کینسر ہے اس سٹیج پر انہوں نے ساٹھ فیصد کامیاب آپریشن کیے ہیں۔ اگر تم بہتر سمجھو تو میں ان سے بات کر لوں تمہارے لیے۔'' ڈاکٹر مسعود نے نرم الفاظ میں اس کو حتی المقدور سمجھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے تھوڑا جھوٹ بھی بولا تھا۔ ڈاکٹر لیونسن نے مذکورہ سٹیج کے کینسر کے چالیس فیصد کامیاب آپریشن کیے تھے لیکن یہ جھوٹ ان کے پروفیشن کا تقاضا تھا۔

''ٹھیک ہے جو آپ بہتر سمجھیں۔'' سونیا نے ڈاکٹر مسعود کو مرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ کل صبح اس نے ہاسپٹل شفٹ ہو جانا تھا۔

❋❋❋

شمع کو چھوڑ کر آئے ہوئے سعد کو دو مہینے ہو چکے تھے۔ اس کا دل بالکل بھی نہیں لگتا تھا۔ شمع ہر وقت یاد آتی رہتی لیکن وہ جبر اور صبر سے کام لے رہا تھا۔ پیسوں کے لیے ملتان میں کام کرنے کا اسے ہر چھوٹے بڑے نے کہا تھا لیکن وہ نہیں مانا تھا۔ اس نے پیسے کمانے تھے اور کراچی میں پیسے کمانے کے زیادہ امکانات نظر آتے تھے۔

صبح سویرے اٹھ کر اس نے گھروں اور دکانوں پر اخبار پہنچانا شروع کر دیا تھا اب سوچ رہا تھا کہ فیکٹری سے کسی ورکشاپ چلا جایا کرے۔ اس طرح کچھ اور پیسے بھی ہاتھ لگ

جائیں گے۔ منزل اسے بہت دور نظر آتی لیکن اس نے ہمت سے کام لینا تھا۔

میڈم کے کینسر کی خبر ہر کسی تک پہنچ چکی تھی۔ سعد کو سن کر افسوس ہوا اور اس نے میڈم کی صحت یابی کے لیے دعا بھی کی تھی۔ اب وہ میڈم کی بے ہودہ باتوں کو بھولتا جا رہا تھا۔

ایک دو دن بعد جب منیجر نے اسے کہا کہ میڈم کی حالت ہاسپٹل میں خراب ہے اور وہ تم سے ملنا چاہتی ہے تو اسے حیرانی تو ہوئی تھی لیکن وہ منیجر کے ساتھ ہاسپٹل جانے کے تیار ہو گیا۔

میڈم کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ بال بھی گر گر کر اتنے کم ہو چکے تھے کہ سر کی جلد نظر آ رہی تھی۔ وہ برسوں کی بیمار نظر آتی تھیں۔ سعد نے ایک نظر انہیں دیکھ کر سر جھکا لیا، دل میں ہمدردی بڑھی تھی اس وقت اس نے میڈم کی صحت یابی کے لئے دل میں دعا بھی مانگی۔

''عابد صاحب، آپ ذرا باہر تشریف لے جایئے۔'' سونیا منیجر سے مخاطب ہوئی تھی۔

''جی میڈم!'' منیجر نے تابعداری سے کہا تھا اور باہر چلا گیا۔

سونیا مشکل سے اٹھ کر بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔ سعد اپنی نیلی یونیفارم میں سر جھکائے کھڑا رہا۔ کمرے میں ان دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

''عابد صاحب بہت اچھے انسان ہیں، مجھے پوری دنیا میں ان پر سب سے زیادہ اعتبار ہے۔ پاپا کے وقت بھی اس فیکٹری کے یہی منیجر تھے۔'' سونیا نے بلاوجہ سعد کے سامنے منیجر کی تعریف کی۔ سعد چپ کھڑا رہا۔

''اس فیکٹری کے علاوہ میری دو اور فیکٹریاں بھی ہیں اور دونوں اس سے زیادہ بڑی ہیں۔''

سونیا کہہ کر چپ ہوئی تو سعد نے نظر اٹھا کر ایک لمحہ میڈم کو دیکھا تھا۔

''میں اس دنیا میں بالکل اکیلی ہوں، کوئی بھی نہیں ہے۔'' وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی وہ اس طرح چپ ہو رہی تھی جیسے اس کے پاس بولنے کے لیے حوصلہ نہ ہو۔

''مجھے اپنے زندہ رہنے کی زیادہ امید نہیں ہے۔ ڈاکٹر بھی ناامید نظر آتے ہیں۔'' وہ پھر چپ کر گئی۔ مگر آنکھوں سے چھلکنے والے آنسوؤں نے خاموش رہنا گوارہ نہ کیا۔

''میں نے اپنی زندگی میں بہت کم خوشی دیکھی ہے، بہت کم۔'' سونیا نے آنسو صاف کیے۔ ''اور میری آخری خوشی یہی ہے کہ تم مجھ سے شادی کر لو۔'' سونیا نے لگی لپٹی رکھے بغیر دل کی بات کہہ دی۔ یہ سن کر اسے جھٹکا لگا۔

''لیکن، لے..... کن میڈم میں شادی شدہ ہوں۔'' سعد کہتے ہوئے ہکلایا تھا۔

''میرے مرنے کے بعد یہ سب فیکٹریاں تمہارے نام ہو جائیں گی۔ تمہارا ڈھیر سارا پیسہ کمانے کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔'' سونیا نے سعد کی بات توجہ سے سنی ہی نہیں تھی۔

سعد کا دل دھڑکا۔

روپیہ، پیسہ، بنگلہ، گاڑی، آسائشات،...... سعد کا سر گھوم گیا۔

''میری آخری خواہش نہیں پوری کرو گے، میں تن تنہا نہیں مرنا چاہتی۔''

سونیا کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے۔

سعد نے نظر اٹھا کر میڈم کو دیکھا، تھوڑی ہمدردی ہوئی، بہت سارا لالچ بھی ہوا۔

''شمع سے کیا کہوں گا، کیا بتاؤں گا؟'' سعد کے ذہن میں سوال ابھرے لیکن اس نے ان کا جواب تلاشنے کی زحمت نہیں کی۔

ایک اقرار سے بہت زیادہ فائدہ ہو جانا تھا، اسے صبح صبح گھروں اور دکانوں پر اخبار پہنچانا یاد آیا، شدید سردی میں وہ اخبار لئے پھرتا تھا ایک اقرار سے آسائشیں آ رہی تھیں۔

''شمع سے کیا کہوں گا؟'' ذہن میں ایک بار پھر سوال ابھرا۔ مگر اس نے دوبارہ کوئی توجہ نہ دی۔

''مجھے تم سے محبت ہے۔'' سونیا پتا نہیں کہہ رہی تھی۔ سعد نے سنا ان سنا کر دیا۔

''سعد تمہیں شمع سے بے حد پیار ہے، تو پھر ایسا نہیں کرنا چاہئے۔'' ضمیر نے اسے پھر سمجھانا چاہا۔

''شمع کے لئے ہی تو کر رہا ہوں۔'' سعد نے یہ سوچ کر ضمیر کو خاموش کر دیا۔

''ٹھیک ہے میڈم، میں شادی کے لیے تیار ہوں۔'' سعد کا لہجہ بے اختیاری لئے ہوئے تھا اور آنسو پونچھتی سونیا مسکرا اٹھی۔

''جی ایم کبھی کبھی تم مجھے الجھے ہوئے لگتے ہو، ایسے لگتا ہے جیسے تم کچھ چھپا رہے ہو۔'' فیصل نے جی ایم کو مخاطب کیا تھا۔ وہ دونوں اس گراسی پلاٹ کے اسی مخصوص بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے جس پر وہ اکثر و بیشتر بیٹھا کرتے تھے۔ اس گراسی پلاٹ کے بائیں سائیڈ پر گلاب کے پھول کے پودے ایک دائرے کی صورت میں لگے ہوئے تھے اور پودوں کے اس دائرے سے کچھ فاصلے پر شیشم اور جامن کے درخت بھی تھے۔

جی ایم مسکرا اٹھا۔

''جیسا سوچو گے ویسا محسوس ہو گا۔ اب میں تمہارے بارے میں ایسا سوچنا شروع کر

دوں تو مجھے بھی تمہارے بارے میں ایسا ہی محسوس ہوگا۔''

''لیکن پھر بھی.....''

''لیکن پھر بھی کیا؟'' جی ایم نے فیصل کی بات کاٹی تو فیصل خاموش ہوگیا۔

''اچھا اس بات کو چھوڑو، تم یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے جن ساتھیوں کے ساتھ میری فولنگ کی تھی، وہ مجھے کبھی تمہارے ساتھ نظر نہیں آئے۔''

''اگلی بار ساتھ لے آؤں کیا؟ بس ویسے ہی میرے ساتھ نہیں ہوتے۔ جب میں تمہیں ملنے آتا ہوں تو انہیں ساتھ نہیں لے کر آتا۔'' جی ایم نے جلدی سے کہا تھا۔

''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ ساتھ لے آؤ۔ بس ویسے ہی پوچھا تھا، مجھے ان میں سے کوئی اکیلا بھی نظر نہیں آیا۔''

''یہیں گھومتے پھرتے رہتے ہیں تم دھیان سے نہیں دیکھتے ہوگے، کوئل کو سوچتے رہتے ہوگے۔''

جی ایم نے کوئل کا نام لیا تو فیصل کا دل بڑی زور سے دھڑکا تھا۔

''کون کوئل؟ کیوں ایسے ہی تنگ کرتے ہو؟'' فیصل سنبھل کر بولا تھا۔

تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ کوئل کو کلاس میں بیٹھ کر اتنا مت گھورا کرو لیکن تم باز نہیں آتے۔ اب تو لڑکے اور لڑکیوں کی نظروں نے بھی محسوس کر لیا ہے۔''

فیصل جی ایم کا منہ دیکھنے لگا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

''مم..... میں نہیں گھورتا۔''

فیصل نے قدرے حواس باختہ انداز میں کہا۔

''مجھے ساری رپورٹ ہوتی ہے، بہانے مت بناؤ'' جی ایم نے الفاظ چبا چبا کر استعمال کیے۔

فیصل مزید کچھ نہ بول سکا۔

''کسی کو پسند کرنا بری بات نہیں ہے۔'' جی ایم نے کہا۔

فیصل چپ چاپ بیٹھا رہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ بھید بھری خاموشی۔ جی ایم فیصل کے بولنے کا انتظار کرتا رہا اور فیصل خاموش رہا، پھر بالآخر فیصل بولا۔

''ٹھیک ہے، لیکن یار ایک بات پوچھنی تھی تم سے۔ اتنا عرصہ ہوگیا ہے ہر بار بھول جاتا ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے؟'' فیصل نے موضوع تبدیل کیا تو جی ایم مسکرایا تھا۔

''میرا نام جی ایم ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن جی ایم بھلا کس طرح ہو سکتا ہے جی ایم کس چیز کا مخفف ہے۔''

جی ایم مسکرا رہا تھا۔

''جی ایم کا مطلب کیا جنٹلمین ہے؟'' فیصل نے اپنے تئیں جی ایم کے نام کا معمہ حل کیا تھا۔

''مذاق اڑاتے ہو؟'' جی ایم کے مسکراتے ہونٹ سکڑ گئے تھے۔

''مذاق! یہ مذاق ہے بھلا، مذاق تو تم خود اپنے آپ کو جی ایم بلا کر اڑاتے ہو۔''

''مجھے اپنا نام اچھا نہیں لگتا۔ اٹھارویں صدی کا نام، دادا ابو نے پتہ نہیں کیا سوچ کر رکھا تھا۔'' جی ایم کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار بھرے تھے۔

''اب اپنا نام بتاؤ گے تو میں مزید کچھ کہوں گا۔''

''میرا نام.....'' جی ایم نے توقف کیا تھا۔

''میرا نام ہے غلام محی الدین۔'' جی ایم نے اپنا نام بتا دیا۔

''غلام محی الدین، جی ایم۔'' فیصل نے نام دہرایا تھا۔

''مطلب کیا ہے اس کا؟ کچھ پتا ہے؟'' فیصل نے پوچھا تھا۔

جی ایم نے سر ہلا دیا۔

''کیا مطلب ہے؟''

''اللہ کے دین کا غلام۔''

''ماشاءاللہ'' فیصل کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

''کتنا پیارا مطلب ہے۔''

''ہاں مطلب تو اچھا ہے لیکن مجھے غلام محی الدین کہلوانا پسند نہیں۔''

''کیوں؟''

''ویسے ہی۔''

''اپنا آپ چھپاتے ہو؟''

''پتا نہیں Just leave this topic''

جی ایم جھنجلایا تھا۔

فیصل نے غلام محی الدین عرف جی ایم کو حیرت سے دیکھا۔ اسے جھنجلانے کی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی۔

"میں ہوتا تو میں غلام محی الدین کہلوانا پسند کرتا۔"

"میں نے پوچھا ہے؟ میں جی ایم کہلوانا پسند کرتا ہوں۔" جی ایم نے کہا تو فیصل کے پاس مزید کچھ کہنے کے لیے نہیں بچا۔ بات پسند پر [illegible] چکی تھی اور فیصل اس بات کو خوب سمجھتا تھا سو وہ چپ کر گیا۔

❁ ❁ ❁

ڈاکٹر لیونسن پاکستان آچکے تھے۔ سونیا کے آپریشن کی تاریخ بھی فکس ہو چکی تھی اس کا ٹریٹمنٹ جاری تھا اور دو دن بعد اس کا آپریشن ہونا تھا۔

سعد، سونیا کے ساتھ ہاسپٹل ہوتا تھا اور ان دونوں کا نکاح ہوئے دو مہینے ہونے کو تھے۔

سونیا اب پُرسکون دکھائی دیتی تھی۔ وہ سونیا سے مسلسل بولتا رہتا، کچھ نہ کچھ ہمدردی کے طور پر، سونیا چپ چاپ سعد کو دیکھتی رہتی اور سنتی رہتی، ڈاکٹر نے اسے بولنے سے منع نہ کیا تھا مگر وہ ممانعت کی حد تک خاموش رہتی۔

سعد شمع کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ مرتے ہوئے بندے کے لیے وہ جبر سے کام لے رہا تھا۔

اسے احساس تھا کہ ممکن ہے کہ سونیا شمع کا ذکر پسند نہ کرے۔

کتنی عجیب تبدیلی تھی کہ سعد شمع کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ سعد کے نزدیک اس تبدیلی کی وجہ ہمدردی تھی اب ہمدردی تھی یا پھر کچھ اور اس کا تعین مشکل تھا۔ شادی کی وجہ البتہ کچھ اور ہی تھی۔

شمع کی یاد ذرا کم ہی آتی تھی۔ موقع ہی نہ ملتا تھا لیکن پھر بھی آج وہ پی سی او جا کر توقیر کو فون کر آیا تھا اسے کہا تھا کہ وہ شمع کو بلا دے۔

توقیر نے پیغام پہنچا دیا۔ شمع تو نہ آسکی البتہ شاداں اور زبیدہ دونوں آئی تھیں۔

"بیٹا۔ آجا شمع تجھے بلاتی ہے۔" شاداں نے کہا تھا۔

"سعد بیٹا شمع تمہیں اکثر یاد کرتی ہے اس کی صحت گری گری رہتی ہے۔ اسے تمہاری ضرورت ہے اس وقت پریشان ہے میری بیٹی۔" زبیدہ کے لہجے میں پریشانی تھی۔

بچے کی پیدائش بس قریب ہی تھی۔ سعد کا دل چاہا کہ اُڑ کر شمع تک پہنچ جائے لیکن اگر وہ شمع کے پاس جاتا تو سونیا کے پاس کون رہتا، سو اس نے دل کی خواہش دبائی اور سونیا کے پاس ٹھہرنا ہی بہتر خیال کیا۔ آخر سونیا قریب الموت تھی، اسے شمع کی نسبت سعد کی قربت کی زیادہ ضرورت تھی اور پھر وہ وقت بھی آگیا کہ سعد آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑا تھا۔ بے تاثر

چہرے کے ساتھ۔

اسے اسی طرح کھڑے ہوئے پانچ گھنٹے ہو چکے تھے۔ وہ ڈاکٹروں کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ دل و دماغ ملتان کے ایک چھوٹے سے گھر میں تھے۔

"شمع کی حالت ٹھیک نہیں، بچہ کسی بھی وقت ہو سکتا ہے، ہم اسے ہسپتال لے جانے کی تیاری کر رہے ہیں، دائی کہتی ہے کہ ہسپتال کا کیس ہے۔" آٹھ گھنٹے پہلے پی سی او سے فون پر بات کی تھی تب شاداں نے اسے بتایا تھا۔ شاداں کے لہجے میں تشویش تھی۔

"تجھے بیوی کے پاس ہونا چاہئے تھا۔" شاداں کے لہجے میں غصہ بھی در آیا تھا۔ سعد ماں کو کوئی جواب نہیں دے سکا۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ وہ بیوی کے پاس ہی تو ہے۔

وہ اب دوبارہ پی سی او جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ویسے وہ ڈاکٹروں کے نکلنے سے پہلے یہاں سے نہیں ہلنا چاہتا تھا، اب اسے ڈاکٹروں پر بھی بہت غصہ آرہا تھا۔ وہ اتنی دیر کیوں لگا رہے تھے۔ صبر جواب دے گیا تو وہ کوریڈور پار کر کے آپریشن ختم ہونے سے پہلے پی سی او جا رہا تھا کہ اسے تنویر بھاگتا ہوا آتا نظر آیا۔

بھاگ کر سعد کے پاس آیا تھا۔ تبھی تو سانس اس قدر پھولا ہوا تھا۔

"سعد بہت بُری خبر لے کر آیا ہوں۔" تنویر کو سمجھ نہیں آرہا تھا پہلے کون سی بات بتائے۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔" تنویر نے کہا تو سعد کے حواس معطل ہونے لگے۔

"کیا ہوا تنویر؟" سعد ہیجانی انداز میں چلایا تھا، خاموش کوریڈور میں سعد کی آواز گونجتی چلی گئی تھی۔

"فیکٹری میں تیرے بھائی کا فون آیا ہے، تیری ماں چولہا جھونکتے آگ سے مرگئی ہے اور تیری پہلی بیوی کے گھر پر ہی بیٹا ہوا ہے۔ تیری بیوی کی حالت بھی ٹھیک نہیں۔ اسے ہسپتال لے کر جا رہے تھے۔" سعد کی آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ اس دوران ڈاکٹرز آپریشن تھیٹر سے نکلے۔ آگے ڈاکٹر لیونسن تھے اور پیچھے ڈاکٹر مسعود۔ وہ پُروقار انداز میں چلتے ہوئے سعد کے پاس آئے۔ ڈاکٹر لیونسن نے مسکراتے ہوئے سعد کا کندھا تھپتھپایا تھا اور انگریزی میں اس کو مبارکباد دی۔

"مبارک ہو سعد، آپریشن کامیاب رہا ہے۔" سعد انگریزی نہیں سمجھتا تھا لیکن ڈاکٹروں کے انداز سے وہ سمجھ گیا کہ خبر ہے۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو نکلے اور گالوں پر پھسلتے چلے گئے۔ پتا نہیں کون سی خبر آنکھوں میں آنسو لے آئی تھی۔

سعد، تنویر اور ڈاکٹروں کو پیچھے چھوڑتا کوریڈور میں بھاگتا چلا گیا اور باہر جانے والے

دروازے سے باہر نکل گیا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس طرح ملتان جائے، ٹرین پر جہاز پر یا بھاگ کر۔

پیچھے کھڑے ڈاکٹروں نے حیرانی سے سعد کو اس طرح بھاگتے دیکھا تو ڈاکٹر لیونسن نے پوچھا۔ ''اسے کیا ہوا ہے؟''

''مجھے معلوم نہیں۔'' ڈاکٹر مسعود نے کندھے اچکائے۔

❀❀❀

فیصل اور جی ایم ایک فاسٹ فوڈ سنٹر میں بیٹھے تھے۔ جی ایم اسے زبردستی لے آیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ فیصل نے جی ایم کی کوئی آفر قبول کی تھی۔

''کون سا برگر کھاؤ گے؟'' جی ایم نے پوچھا۔

''جو دل کرے منگوا لو، جو تمہیں اچھا لگتا ہو، انفیکٹ میں کسی فاسٹ فوڈ پوائنٹ پر پہلی بار آیا ہوں اور میں کسی کار میں بھی آج پہلی بار بیٹھا ہوں۔'' فیصل نے اعتماد سے کہا۔ اسے اس بات پر کوئی شرمندگی نہیں تھی۔

فیصل کی بات سن کر جی ایم نے کسی قسم کے تاثرات نہ دکھائے۔ اسے اس بات کا پہلے سے پتا تھا۔

''شاید تم نے اردگرد نظر نہیں ڈالی، وہ دور ایک لڑکے کے ساتھ بیٹھی لڑکی کومل ہے۔''

فیصل نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس ٹیبل کی طرف دیکھا تھا۔ وہاں واقعی کومل بیٹھی تھی۔ کومل سامنے رخ بیٹھی تھی اور اس لڑکے کی فیصل کی طرف پشت تھی۔ کومل کو ایک لڑکے کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر فیصل کو ناگواری کی ایک لہر نے آ گھیرا۔ اسے بے حد بُرا لگا تھا۔

''ٹینشن کی کوئی بات نہیں ہے، کومل کے ساتھ بیٹھا لڑکا اس کا بھائی ہے آج اس کے بھائی کو جاب ملی ہے اس لئے وہ اپنی بہن کو پارٹی دینے آیا ہے۔ بس دو بہن بھائی ہیں یہ لوگ۔'' جی ایم نے برگر کا لقمہ لیتے ہوئے کہا۔

فیصل نے سکون بھری سانس لی اور اس نے برگر اٹھا لیا۔ ''تمہیں کس طرح پتا ہے؟ ہر بات کا تمہیں کیسے پتا چل جاتا ہے۔'' فیصل نے جی ایم سے پوچھا تھا۔

جی ایم مسکرا دیا۔ ''کیوں کہ میں انسان نہیں ایلین ہوں مجھے ہر بات کا پتہ ہوتا ہے میں مستقبل کے بارے میں بھی بتا سکتا ہوں۔'' جی ایم نے کہا اور پھر اپنی ہی بات پر قہقہہ لگایا فیصل نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔

''بکومت، مجھے ویسے حیرانی ہوتی ہے کہ تم ہر بات کس طرح جان لیتے ہو۔'' فیصل

نے کولڈ ڈرنک کا ایک سِپ لیا تھا۔ اسے برگر پسند آیا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ فاسٹ فوڈ سنٹر سے باہر نکلے اور گاڑی کی طرف بڑھے تو ایک بھکارن بھی ان کی طرف بڑھی تھی۔

''اللہ کے لیے دس بیس دے دو۔ اللہ لمبی عمر دے۔'' بھکارن نے جی ایم کے سامنے ہاتھ پھیلایا تو جی ایم مسکرا اٹھا۔

''تم میرے دیئے گئے دس بیس جا کر اللہ کو دو گی جو اللہ کے لیے بھیک مانگ رہی ہو۔''

بھکارن نے منہ بگاڑ کر جی ایم کو دیکھا۔

''مجھے دو گے تو اللہ اجر دے گا۔''

''تمہیں دے کر میں نے اجر نہیں لینا دفع ہو جاؤ۔'' جی ایم نے درشت آواز میں کہا تھا اور دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

بھکارن نے منہ ہی منہ میں کچھ کہا اور چلی گئی۔

فیصل اس دوران خاموش تماشائی کی طرح کھڑا رہا۔ پھر وہ بھی گاڑی میں بیٹھ گیا اسے جی ایم کا انداز بہت برا لگا تھا۔ منع کرنے کا بھی ایک انداز ہوتا ہے یہ کیا کہ ہتک ہی کیے جاؤ۔ مسکرا کر بھی منع کیا جا سکتا ہے۔

''تم نے ٹھیک نہیں کیا۔'' فیصل نے اپنے لہجے کی ناگواری کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''ٹھیک کیا، یہ لوگ اس سے بھی بُرے رویے کے قابل ہیں، پیشہ ور بھکارن ہے یہ۔''

''یہ جو دو چار ریسٹورنٹ ساتھ ساتھ ہیں، میں روز ہی ان میں سے کسی پر جاتا ہوں، اور یہ بھکارن روز ہی انہی فوڈ سنٹرز سے نکلنے والوں سے بھیک مانگتی ہے اس کی سائیڈ پاکٹ میں سرنج بھی ہے جو یقیناً نشے کے استعمال کے لیے ہے۔ جاتے ہوئے اس نے مجھے نہایت بے ہودہ گالی دی ہے۔'' جی ایم نے گاڑی ریورس کی تھی۔

''تم روز ان فوڈ سنٹرز پر کیا کرنے آتے ہو؟''

''ناچنے۔'' جی ایم نے طنزاً کہا تھا۔ ''ظاہری بات ہے کھانا کھانے آتا ہوں۔''

''کیوں تمہارے گھر کھانا نہیں ہوتا۔''

''میرے گھر میں کھانا ہوتا ہے، میری مدر اکثر و بیشتر خود کک کرتی ہیں۔ وہ ایک بہت اچھی کک ہیں اٹالین ڈشز تو لاجواب بناتی ہیں۔''

''تو پھر یہاں کس لیے؟'' فیصل کو جی ایم کی ہر بات ایک معمہ لگتی تھی۔

"سب بتاؤں گا ویسے بھی ہر بات واضح کرنے کا وقت آ گیا ہے لیکن آج نہیں کچھ دنوں بعد۔"

"کچھ دنوں بعد؟ تم ہر بات میں بندے کو الجھا دیتے ہو۔" فیصل کا لہجہ بھی الجھا ہوا تھا۔

"چپ کر کے بیٹھو، بعد میں انویسٹی گیشن کر لینا، آج نہیں ڈاکٹر صاحب۔" جی ایم نے ہنستے ہوئے کہا تو فیصل بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔

❁❁❁

کمزور شمع چار پائی پر لیٹی ہوئی چھت کو گھورے جا رہی تھی۔ ساتھ والی چار پائی پر سعد اپنے ننھے منے بیٹے کو گود میں لئے بیٹھا تھا۔ اس نے بیٹے کا نام محمد فیصل رکھا تھا۔

"شمع پیاس تو نہیں لگی؟" سعد نے شمع سے پوچھا۔ اسے احساس ہوا کہ شمع نے صبح سے ایک گھونٹ بھی پانی نہیں پیا۔

"نہیں!" شمع نے مدھم آواز میں کہا تھا۔ سعد مزید کچھ نہ بولا۔ بولنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا اس کے پاس۔

"ماں بھی چل بسیں، بہت جلدی تھی انہیں، حادثاتی موت نے ہمارا گھر ہی کیوں دیکھ لیا ہے۔" شمع نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔ اپنے آپ سے یا سعد سے۔ اس بات کو شمع کو بھی نہیں پتا تھا۔ آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔

آج شاداں کو جل کر مرے اور فیصل کو دنیا میں آئے ساتواں دن تھا۔ ہر چیز ویسی کی ویسی سوگوار تھی۔ سعد نہ ماں کا چہرہ آخری بار دیکھ سکا اور نہ ہی اس کے جنازے میں شریک ہو سکا تھا۔ ٹرین میں آتے آتے اسے بہت دیر ہو گئی تھی۔

اکبر، شعیب، مزمل اور صوفیہ سب کے ساتھ لگ کر وہ کتنی دیر روتا رہا تھا۔ اس کی ماں چل بسی تھی۔ وہ اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ شمع موت کے منہ سے ہو آئی تھی۔ وہ اس وقت گھر پر نہیں تھا وجہ کیا تھی؟ وجہ پیسہ تھا پیسہ۔ جو پھر بھی ہاتھ نہیں آیا تھا۔ سونیا جو بچ گئی تھی۔

"میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ کراچی نہیں جاتے لیکن آپ نے نہیں مانی، اماں مر گئی مجھے آپ کی ضرورت تھی لیکن آپ پیسے کمانے کے لئے کراچی میں تھے، بہت برا کیا آپ نے۔" شمع کی آنکھوں سے مزید آنسو نکلے تھے۔ سعد سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ شمع نے آج ساتویں دن جا کر سعد سے کوئی شکوہ کیا تھا۔

اسے ہسپتال سے آئے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ اتنے میں زبیدہ سعد کے لیے چائے

لے کر آ گئی۔ فیصل کو زبیدہ نے گود میں لیا اور سعد کو چائے پکڑائی اور خود بھی سعد کے پاس بیٹھ گئی۔

"زندگی تو اللہ کی امانت ہے، جب چاہے لے لے لیکن انسان کو اپنے پیاروں کے ساتھ وقت گزارنا چاہیئے۔ پتا نہیں کب زندگی دغا دے جائے۔ اب کراچی مت جانا۔ شمع نہیں ہوتی ہے تو میرا دل بہت گھبراتا ہے۔" زبیدہ نے فیصل کو چار پائی کے فریم کے ساتھ دوپٹے سے باندھے گئے جھولے میں ڈالا تھا۔

"تیری ماں بڑی اچھی عورت تھی۔ اللہ اسے جنت نصیب کرے۔ اچانک ہی پتا نہیں چلا اور وہ چل بسی۔"

"ہاں!" سعد نے زیر لب دہرایا۔ دل میں ٹیس سی اٹھی۔ تھوڑی دیر زبیدہ مزید بیٹھی شاداں کی باتیں کرتی رہی۔

زبیدہ کے جانے کے بعد کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

"اب کراچی تو نہیں جائیں گے ناں۔" کچھ دیر بعد شمع کی آواز نے خاموشی کو توڑا۔

"کبھی نہیں جائیں گے۔" سعد کا لہجہ مضبوط تھا۔

اسی وقت اس کی آنکھوں کے سامنے میڈم سونیا کا سراپا گھوم گیا۔ اس کے اندر تک عجیب سا دھواں پھیل گیا۔

"پہلے کیوں نہیں مانی تھی بات؟" شمع نے شکوہ کیا۔

"پہلے......" سعد نے طویل سانس لی۔ "پہلے سوچا تھا کہ جا کر پیسے کما لوں گا اور تمہیں بنگلہ گاڑی اور ڈھیر ساری عیش کی چیزیں مہیا کروں گا۔"

شمع نے شکوہ بھری نگاہوں کے ساتھ اسے دیکھا۔

"میں آپ سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے کچھ نہیں چاہیئے، پہلے میرے دل میں روپے پیسے کی خواہش ہوتی تھی، امیر زندگی کی ہوس تھی۔ اسی لیے شادی سے پہلے ڈرامے کرتی پھرتی تھی لیکن اب مجھے کچھ نہیں چاہیئے، کچھ نہیں، آپ میری بات سمجھتے کیوں نہیں ہیں۔" شمع کے چہرے پر غصے، بیزاری اور افسوس کے ملے جلے تاثرات تھے۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اسے اب کچھ نہیں چاہیئے تھا۔ زندگی کی بے ثباتی اور موت نے اس کی ترجیحات بدل دی تھیں۔

سعد کو پہلی بار احساس ہوا کہ شمع سمجھوتہ نہیں کر رہی۔ اسے اب حقیقتاً کسی شے کی خواہش نہیں۔

سعد نے سر جھکا لیا۔ اب اس نے اپنا گھر محبت سے سجانا تھا۔ جو زندگی اس کے پاس تھی اپنے بہن بھائیوں، بیوی اور بچے کے ساتھ گزارنی تھی۔ اسے باپ کا سہارا بننا تھا۔ ماں کے چلے جانے کے بعد اس کا باپ اکیلا تھا۔

میڈم سونیا کے بارے میں بھی اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ اگر کسی کو معلوم ہو جاتا تو اس کی زندگی میں بے اعتباری اور دکھ نے گھیرا تنگ کر لینا تھا۔ اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔

❀❀❀

فیصل بہت بور ہو رہا تھا کیونکہ ان کی آج کلاسز نہیں ہو رہی تھیں۔ سو بور ہونا بنتا بھی تھا۔ کلاس میں اس کی کسی سے بھی زیادہ بے تکلفی نہیں ہو سکی تھی۔ شروع شروع میں غضنفر کے ساتھ تھوڑی بہت گپ شپ ہوتی تھی لیکن پھر غضنفر کے دوست بھی بنتے گئے۔ پریشان صورت والے غضنفر کے دوست بھی خود اعتمادی سے محروم تھے لیکن پھر بھی ان کا گروپ خوب پھل پھول رہا تھا۔

فیصل کا کتنا دل چاہتا تھا کہ کوئل سے ہی بات چیت کر لے لیکن کلاسز کو سٹارٹ ہوئے چار مہینے ہونے والے تھے اور اس میں ہمت نہیں ہوئی تھی۔

''کوئل''، فیصل نے زیر لب دہرایا تھا۔ ایک خوبصورت لطیف سا احساس ہوا۔

ساتھ والے گراسی پلاٹ میں بہت ساری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی کوئل فیصل کو نظر آ رہی تھی۔ ہینڈ بیگ نما کالج بیگ، اس کی گود میں تھا۔ بیگ میں سے اس نے ہاف لیٹر والی بوتل نکالی اور منہ سے لگا لی۔ اس ہاف لیٹر والی بوتل میں پانی ہوتا تھا۔ اس بات کا فیصل کو کچھ عرصے پہلے پتا چلا تھا۔

کوئل ساتھ والی لڑکی کی کسی بات پر ہنسی تھی۔ دور اکیلا بنچ پر بیٹھا فیصل مسکرا اٹھا۔ ہنستے ہوئے کوئل اور بھی زیادہ خوبصورت لگتی تھی۔

ویسے تو اس نے اب کوئل کو دیکھنا ترک کر دیا تھا۔ بارہا کی شعوری کوششوں سے اور جی ایم کے کئی بار کہنے کی وجہ سے اب وہ کوئل کو گھورا تو نہیں کرتا تھا لیکن وقتاً فوقتاً ایک بھرپور نظر ضرور ڈال لیتا تھا۔

''جی ایم کی بھی کلاس آف ہونے والی ہے۔'' فیصل نے سوچا اور پھر اس نے ذہن پر زور دے کر سوچا کہ جی ایم کس وقت کسی ڈیپارٹمنٹ میں ہوگا۔ جی ایم کا بتایا ٹائم ٹیبل اسے یاد نہ آیا تو وہ اٹھ کر Pathology کے ڈیپارٹمنٹ کی طرف چلا گیا۔ شاید یہاں پر ہو۔

ڈیپارٹمنٹ پہنچ کر اس نے لیکچر تھیٹر کے باہر بیٹھے اٹینڈنٹ سے پوچھا تھا تو اس نے

بتایا کہ بس لیکچر ختم ہونے والا ہے۔ اسی لمحہ پروفیسر صاحب لیکچر تھیٹر کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ اس کے بعد سٹوڈنٹ بھی نکلنے شروع ہو گئے۔ اس نے جی ایم ڈھونڈنا شروع کیا۔ بالآخر اس نے ایک لڑکے کو روک کر پوچھا۔

''ایکسکیوزمی، کیا آپ کو پتا ہے کہ جی ایم آج لیکچر لینے آیا ہے۔''

لڑکا رک گیا۔ اس نے فیصل پر سرتاپیر ایک نظر ڈالی۔

''کیا جی ایم سی کمپنی کا نام ہے؟''

''نہیں، نہیں غلام محی الدین، جی ایم آپ کا کلاس فیلو۔''

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے، ہماری کلاس میں غلام محی الدین یا جی ایم جیسے عجیب ناموں والا کوئی لڑکا نہیں پڑھتا۔'' یہ کہہ کر وہ لڑکا آگے بڑھ گیا۔

''لو جی کیا ہوا۔ پوچھنا بھی ان کے نزدیک گناہ ہے۔'' فیصل نے سوچا تھا۔

لیکچر تھیٹر میں جھانک کر دیکھا تو وہ خالی ہونے والا تھا اِکا دُکا سٹوڈنٹس تھے اور وہ بھی کتابیں سنبھال کر باہر آ رہے تھے۔ اسے کہیں جی ایم نظر نہیں آیا۔

''ہماری کلاس میں تو کوئی غلام محی الدین کا نام کا لڑکا نہیں پڑھتا۔''

''بھائی کوئی جی ایم نام کا افلاطون اس کالج میں ایم بی بی ایس تھرڈ ایئر کا سٹوڈنٹ نہیں ہے۔''

''غلام محی الدین بڑا عجیب نام ہے، کون غلام محی الدین؟''

''جی ایم کیا؟'' فیصل کا دماغ گھومنے لگا۔ آٹھ دس لڑکوں سے پوچھا تھا اس نے، اور سارے کے سارے اس نام سے لاعلم تھے۔

آخر کار اس نے ایک لڑکی سے پوچھا۔ لڑکی سے پوچھتے ہوئے اس کا سوال مختلف ہو چکا تھا۔

''محترمہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی کلاس میں کوئی غلام محی الدین یا جی ایم نام کا لڑکا پڑھتا ہے؟''

''آپ کون؟'' لڑکی نے الٹا سوال کیا تھا۔

فیصل نے بے چارگی سے اپنا نام بتا دیا اور تھوڑا سا تعارف بھی کرا دیا تھا۔

''مجھے اپنی ساری کلاس کے لڑکوں کے نام تو نہیں پتا لیکن اتنا پتا ہے کہ جی ایم یا غلام دین نامی یونیک نام والا لڑکا ہمارا کلاس فیلو نہیں ہے۔''

لڑکی آگے بڑھ گئی اور فیصل بے وقوفوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگ گیا۔

"جی ایم یا غلام محی الدین نام کا کوئی لڑکا اِدھر تھرڈ ایئر کا سٹوڈنٹ نہیں ہے۔" یہ بات فیصل کے دماغ میں گھومنے لگ گئی۔

فیصل نے اپنے بیگ کی سائیڈ پاکٹ سے ایک چٹ نکالی۔ اس چٹ پر جی ایم کا موبائل نمبر لکھا تھا۔ تیز تیز قدموں سے وہ بک شاپ پر گیا جہاں پر پی سی او کی سہولت بھی تھی۔ وہاں کھڑے آدمی کو چٹ پکڑا کر اس نے جی ایم کا نمبر ڈائل کرنے کو کہا۔

یہ بھی نہ سوچا کہ اگر اس نے کال کر لی تو بس پر گھر جانے کے لیے اس کے پاس پیسے کم ہو جائیں گے۔

آدمی نے نمبر ملا کر فیصل کو پکڑا دیا۔ گھنٹی بجی تو جی ایم نے فون اٹھالیا۔

"ہیلو۔"

"ہیلو جی ایم! میں فیصل بات کر رہا ہوں۔ کالج کے پی سی او سے تم کہاں ہو؟"

"میں...... میں Pathology کے لیکچر تھیٹر میں ہوں۔ خیریت؟" جی ایم نے نارمل لہجے میں کہا تھا۔

یہ سن کر فیصل کا دماغ تو جیسے گھوم گیا گھوما۔ پتھالوجی کے لیکچر تھیٹر میں وہ خود اچھی طرح دیکھ آیا تھا کہ وہاں جی ایم نہیں تھا۔

"اچھا میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" فیصل نے حتی المقدور اپنی آواز نارمل رکھی تا کہ جی ایم کو کسی غیر معمولی پن کا احساس نہ ہو۔

"اگر کوئی ایمرجنسی ہے تو ابھی آجاتا ہوں۔ ورنہ ظہر کے وقت مسجد میں ملیں گے۔"

"ایمرجنسی ہے۔ میں ایسے کرتا ہوں کہ پتھالوجی کے ڈیپارٹمنٹ آجاتا ہوں۔ تم بھی لیکچر تھیٹر کے باہر آجاؤ۔"

"نہیں فیصل، تم ٹھہرو، وہیں بک شاپ پر میں آجاتا ہوں۔ پانچ منٹ لگ جائیں گے۔"

"لیکن جی ایم...... ہیلو ہیلو۔" فیصل نے حیران نظروں سے فون کو دیکھا تھا۔ لائن کٹ گئی یا پھر جی ایم نے کاٹی تھی۔

یقیناً جی ایم نے کاٹی تھی۔ بک شاپ والے کو پیسے دے کر وہ جی ایم انتظار کرنے لگا۔ جی ایم دس منٹ بعد گاڑی میں آیا۔

"گاڑی پر Pathology کے ڈیپارٹمنٹ سے آرہے ہو؟" فیصل کے لہجے میں کاٹ تھی۔ جسے جی ایم نے بھی محسوس کیا تھا۔

"نہیں گاڑی پر کس طرح اور کس لیے آیا ہوں تمہیں بتاتا ہوں۔ تم گاڑی میں بیٹھو۔ اسے پارک کر لیں، پھر آرام سے بات کرتے ہیں یا پھر کہیں جانا ہے ابھی تم نے کہا تھا ایمرجنسی ہے۔"

"تم جا کر گاڑی پارک کرو پھر بات کرتے ہیں۔ میں اسی گراسی پلاٹ میں جا رہا ہوں جس میں ہم بیٹھا کرتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد جی ایم بھی فیصل کے ساتھ سیمنٹ کے بنے بنچ پر بیٹھا ہوا تھا۔

"کون ہو تم؟" فیصل کا لہجہ تیکھا تھا۔ جی ایم نے غور سے فیصل کو دیکھا تھا۔

"ایلین ہوں۔" جی ایم نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"بکواس مت کرو، سچ بتاؤ تم کون ہو؟ تم اس میڈیکل کالج میں تھرڈ ایئر کے سٹوڈنٹ نہیں ہو۔ میں نے دس سٹوڈنٹس سے پوچھا ہے۔ دس کے دس جی ایم یا غلام محی الدین نامی لڑکے کو نہیں جانتے۔ اب تم براہ مہربانی بتا دو کہ تم کون ہو۔" فیصل نے ضبط کی کوشش کی لیکن اس کی آواز کافی اونچی تھی۔

"اوہو، تو تمہیں پتا چل گیا ہے، میں ویسے بھی آج کل میں تمہیں سب بتانا چاہتا تھا۔" جی ایم نے طویل سانس لی۔

"میں میڈیکل کا سٹوڈنٹ نہیں ہوں، میں ملتان کا رہنے والا بھی نہیں ہوں، میرے یہاں آنے اور سارے ڈھونگ رچانے کا مقصد تم سے اور تمہاری ماں سے ملنا تھا۔ میں تمہارے اور تمہاری ماں کے حالات جاننے آیا تھا۔ صرف حالات۔ ایڈونچر کے طور پر لیکن تمہاری باتیں مجھے روکتی چلی گئیں یہاں تک کہ پتا بھی نہیں چلا کہ چار مہینے گزر گئے لیکن میں نے اب دو تین دن میں چلے جانا ہے۔ کیونکہ میری چھٹیوں کو ختم ہوئے مہینہ ہو چکا ہے اور میری سٹڈی کا بھی کافی حرج ہو رہا ہے۔"

"کہانیاں مت سناؤ۔ بتاؤ کہ تم کون ہو اور مجھ سے اور میری ماں سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟" فیصل کے لہجے میں غصہ تھا۔

"مما اور ڈیڈی کافی ناراض ہیں۔ میں نے انہیں بتایا ہوا ہے کہ میں ناردن ایریاز میں ہوں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ تم دو دن میں آرہے ہو یا ہم لینے آجائیں۔ اس لیے، دوسرا اب اگر مزید میں نے چھٹیاں کیں تو مجھے سمسٹر کے فائنل پیپرز میں نہیں بیٹھنے دیں گے۔ میری جہاز کی ٹکٹ کنفرم ہو چکی ہے۔ مجھے سی آف کرنے ایئر پورٹ ضرور چلنا۔"

"کون ہو تم؟" فیصل کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ بلا ارادہ ہی اس نے ایک مکا جی ایم کو

مار ڈالا۔ فیصل کا مکا جی ایم کے منہ پر نشان چھوڑ گیا۔ مگر جی ایم مکا پڑنے پر بھی مسکرا دیا۔

''اوہ سوری، مجھے نہیں مارنا چاہئے تھا۔'' فیصل شرمندہ ہوگیا۔

''بھائی جان صبر کیجئے میں بتانے ہی والا ہوں۔'' جی ایم نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''تم بہت اچھے ہو، میں واپس آؤں گا۔ آپ کو اور امی کو لینے۔ اکیلا نہیں آؤں گا۔ پاپا کو لے کر آؤں گا ان شاءاللہ۔ میں تمہیں بہت مس کروں گا۔ شاید تم بھی کرو گے۔ تمہاری وجہ سے مجھ میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔'' جی ایم بولتا گیا اور فیصل چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ جی ایم کیوں نہیں بتا رہا اور وہ اس سے ملنے کیوں آیا تھا۔ وہ اور اس کے پاپا اسے اور امی کو لینے کیوں آئیں گے۔ وہ کچھ بتائے گا تو ہی پتہ چلے گا۔

''مجھ سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔ تمہاری فولنگ کی تھی۔ اس کے لیے سوری۔ ویسے تم معاف نہ کرو تو زیادہ اچھا رہے گا۔ تمہاری فولنگ کا بہت مزہ آیا تھا۔'' جی ایم مسکرا رہا تھا۔

''تم کون ہو؟'' اس بار فیصل نے اپنا لہجہ نرم رکھا تھا شعوری طور پر۔

''میں کون ہوں؟'' جی ایم نے آنکھیں بند کر لیں۔

''میرے والد کا نام بھی سعد اکبر ہے اور فیصل میں تمہارا سوتیلا بھائی ہوں۔'' جی ایم نے آنکھیں کھول دیں اور فیصل کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلتی چلی گئیں۔

❁ ❁ ❁

سعد اپنے چھوٹے بہن بھائی کے ساتھ صحن بیٹھا تھا جب مزمل کی آواز نے اسے متوجہ کیا۔

''بھائی کچھ عورتیں آ رہی ہیں۔'' اس نے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔

سعد نے صحن کی طرف دیکھا تو اسے داخلی دروازے سے سونیا اور اس کے ساتھ دو لڑکیاں نظر آئیں۔

اس کے دل کی دھڑکن لمحہ بھر میں تیز ہوگئی۔ وہ بلا ارادہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اسکارف میں لپٹی سونیا اس کے سامنے کھڑی تھی۔ سعد کو یاد آیا کہ علالت کے دوران سونیا کے بال اچھے خاصے جھڑ گئے تھے اور شاید اسکارف پہننے کا مقصد سر چھپانا تھا۔

''پہچان رہے ہو نا سعد۔'' اس نے قریب آ کر پوچھا۔

''آپ؟'' سعد ششدر تھا۔

''ہاں میں۔'' سونیا ہنسی۔ ''ڈاکٹر بھی حیران ہیں کہ اتنے بڑے آپریشن کے بعد میں اتنی جلدی بہتر کیسے ہوگئی۔ خیر تم کیسے ہو سعد؟'' سونیا نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

سعد کو سمجھ نہ آیا کہ کیا کرے لیکن پھر بھی اس نے میکانکی انداز میں سونیا کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ سونیا نے اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا۔

کچن کے دروازے میں کھڑی شمع نے سعد کو ہاتھ ملاتے دیکھا تو لمحہ بھر کے لیے اسے اپنی بصارت پر شبہ ہوا۔

''بیٹھنے کا نہیں کہو گے۔'' سونیا خود ہی آگے بڑھی اور صوفیہ کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ ساتھ آنے والی لڑکیاں چارپائی کے پیچھے کھڑی ہوگئیں۔

''یہ کون ہے؟'' سونیا نے حیرانی سے اپنی طرف دیکھتی صوفیہ کا گال تکلفاً نرمی سے چھوا تھا۔

''میری بہن۔''

''اوہ گڈ۔''

''اور یہ تمہارا بھائی ہوگا؟'' سونیا نے ایک ادا کے ساتھ مزمل کی طرف اشارہ کیا تھا اور خود اندازہ کرنا چاہا تھا۔

''ہاں۔''

''کھڑے کیوں ہو سعد، بیٹھ جاؤ!'' سونیا کا لہجہ پیار بھرا تھا لیکن وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔

کچن کے دروازے میں کھڑی شمع کو سمجھ نہیں آئی کہ اسے ان عورتوں کی طرف برآمدے میں چلے جانا چاہئے یا پھر اسی طرح دروازے میں کھڑی رہے۔

''یہ کیا ہے؟ اور اس میں کیا ہے؟'' سونیا نے حیرانی اور قدرے دلچسپی سے چارپائی کے ساتھ بندھے دوپٹے کو دیکھا۔ جو جھولے کا کام دے رہا تھا۔ سونیا اسی چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی۔

سعد کے جواب دینے سے پہلے ہی سونیا نے خود جھانک کر چارپائی کے ساتھ بندھے جھولے میں جھانک لیا۔ اس میں ایک بچے کو دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔

''یہ بچہ کون ہے اور اس طرح کپڑے میں کیوں رکھا ہوا ہے؟''

سعد قدرے سنبھلا۔ اس نے کچن کے دروازے میں کھڑی شمع کو بھی دیکھ لیا تھا۔ بات کو سنبھالنے کے لیے اس نے خود کو سنبھالنا ضروری سمجھا۔

''آؤ شمع ادھر آؤ۔'' شمع آہستگی سے چلتی ہوئی آئی۔ سونیا نے قدرے دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔

لمحوں میں وہ معترف ہوگئی کہ شمع اس سے زیادہ خوبصورت ہے لیکن وہ بالکل سادہ حلیے میں تھی۔ آنکھوں کے حلقے بھی اس کی خوبصورتی کو کم کر رہے تھے۔ اگر سونیا اپنے اوپر تھوڑی سی توجہ دیتی تو یقیناً شمع اس کے سامنے بالکل گہنا جاتی۔

''میڈم یہ میری بیوی ہے، شمع اور یہ جھولے میں لیٹا بچہ ہمارا بیٹا ہے محمد فیصل اور شمع یہ کراچی والی فیکٹری جس میں میں کام کرتا تھا۔ اس کی مالکن ہیں۔ ملتان کسی کام سے آئی تھیں۔ امی کی وفات کا معلوم ہوا تو تعزیت کرنے چلی آئیں۔ بہت اچھی خاتون ہیں۔''

سعد نے شمع کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

شمع سونیا کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

شمع سونیا کے سامنے چُپ چاپ بیٹھی رہی۔ اسے سمجھ نہیں آیا کیا بات کرے۔

''سعد، تمہاری وائف تو بہت پیاری ہے۔'' سونیا نے مسکرا کر کچھ ایسی بے تکلفی سے کہا کہ شمع سعد کے منہ کی طرف دیکھنے لگی۔

سعد گڑبڑا گیا۔

''میڈم آپ جس کام کے سلسلے میں ملتان آئی تھیں، وہ ہو گیا؟'' سعد نے سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سعد کی نگاہوں میں پیغام تھا، جسے سونیا خوب سمجھ گئی۔ اگر پیغام نہ بھی ہوتا تب بھی یہی جواب دیتی جو اس نے دیا تھا۔

''ہاں۔''

''تو آپ آج ہی کراچی چلی جائیں گی ناں؟'' الفاظ میں یہ پیغام چھپا تھا کہ آپ یہاں سے چلی جائیں۔

''ہاں۔'' سونیا نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

''اچھا میں چلتی ہوں۔ اللہ تمہاری ماں کو جنت نصیب کرے۔'' سونیا اٹھ کھڑی ہوئی تو سعد نے سکون بھر سانس لیا۔ ویسے اسے حیرانی تو ہوئی تھی کہ سونیا اس کے جھوٹ کا ساتھ کیوں دے رہی ہے۔

سونیا نے پیچھے کھڑی لڑکی سے پرس مانگا۔ لڑکی نے پرس دیا۔ سونیا نے اس میں سے ایک نیلا نوٹ نکالا اور جھک کر سوئے ہوئے فیصل کے اوپر رکھ دیا۔

''کچھ لائی نہیں، اپنے بچے کے لیے کچھ لے لینا۔'' شمع نے میڈم کو سراسیمگی سے نیلا نوٹ رکھتے دیکھا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے، میڈم۔'' شمع بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں نے پوچھا ہے ضرورت ہے یا نہیں اور تم مجھے آئندہ میڈم مت بلانا۔'' سونیا آگے بڑھی تھی۔

''آئندہ'' اس لفظ کی وقعت شمع کی سمجھ سے باہر تھی۔ آگے بڑھ کر سونیا نے شمع کو گلے لگا لیا۔

شمع کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ مہنگے کپڑوں میں ملبوس فیکٹری کی مالکن نے ملگجے کپڑوں والی ایک معمولی ورکر کی بیوی کو گلے لگایا تھا۔ سو حیران ہونا بنتا بھی تھا۔

''سعد میں یہاں ٹیکسی پر آئی ہوں۔ ٹیکسی باہر کھڑی ہے۔ مجھے ایئر پورٹ تک چھوڑ آؤ۔ تم ٹیکسی پر واپس آ جانا۔''

سونیا نے ایک اچٹتی نگاہ پورے گھر پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''او کے اللہ حافظ شمع، اللہ حافظ بچو!'' سونیا نے مسکرا کر حیران صورت لوگوں کو الوداع کہا تھا۔

''شمع میں ابھی تھوڑی دیر میں میڈم کو چھوڑ آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر سعد بھی سونیا کے پیچھے چلا گیا۔

برآمدے میں کھڑی شمع کو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''کیا اتنی امیر مالکن ایک معمولی ورکر کے پاس تعزیت کے لیے بھی آ سکتی ہے۔ وہ بھی اتنی دور؟''

''اس نے مجھے گلے کیوں لگایا؟''

''ہزار روپیہ دینے کا مقصد؟''

''ایئر پورٹ چھوڑ آنے کا مقصد؟ سعد ملازم تھا دوست نہیں! اکیلے پن کا مسئلہ بھی نہیں تھا تو پھر سعد کو لے جانے کا مقصد؟''

شمع سادہ تھی۔ بے وقوف نہیں۔ تمام سوالات اسے حیرانی میں مبتلا کر رہے تھے۔

سونیا نے پیچھے آتے سعد کو مسکرا کر دیکھا تھا۔ اس کے گھر کی گلی بہت زیادہ تنگ تھی۔ اس لیے وہ ٹیکسی اندر نہیں لا سکی تھی۔ گلی سے باہر نکل کر سعد نے دیکھا کہ وہاں دو ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔

''تم دونوں ایئر پورٹ پہنچو میں آ جاتی ہوں۔'' سونیا نے ایک لڑکی سے کہا تھا۔ وہ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئیں۔

دوسری ٹیکسی میں وہ سعد کے ساتھ پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ سعد کو سونیا کے ساتھ

پر اعتراض تو تھا لیکن اس نے پس وپیش سے کام نہ لیا۔

''ملتان کے سب سے اچھے ریسٹورنٹ میں لے چلو۔'' سونیا نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

سعد نے کچھ کہنا تھا لیکن پھر خاموش ہو گیا۔ وہ خود بھی سونیا سے بات کرنا چاہتا تھا اور بات کرنے کے لیے ریسٹورنٹ ہی مناسب جگہ تھی۔ کچھ دیر بعد وہ سب سے اچھے ریسٹورنٹ کی ایک ٹیبل پر بیٹھے تھے۔

سعد کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ویٹر آرڈر لینے آ گیا۔ ''اس ریسٹورنٹ کی پانچ سب سے اچھی ڈشز اور سب سے اچھا مشروب لے آؤ۔'' سونیا نے مینو کارڈ دیکھے بغیر آرڈر دے دیا۔

''سعد پوچھو گے نہیں کہ میں کیسی ہوں؟ تم تو آپریشن کے درمیان ہی مجھے لاوارثوں کی طرح چھوڑ کر چلے گئے۔ میں تمہاری کچھ لگتی ہوں۔''

''کچھ نہیں لگتی آپ میری۔'' سعد کا لہجہ کاٹ دار تھا۔

وہ ملگجے کپڑوں میں ملبوس تھا۔ لباس ریسٹورنٹ سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ وہ عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ سونیا بھی سامنے بیٹھی تھی۔ تھوڑا سا احساسِ کمتری کا بھی شکار تھا۔ وہ اس کی بات سن کر مسکرائی۔

''تمہاری ماں کی بھی اسی دن ڈیتھ ہو گئی جس دن میرا آپریشن ہوا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا اور تمہارے غائب ہونے کی وجہ بھی یقیناً یہی تھی۔''

سعد کچھ نہ بولا۔ چپ بیٹھا رہا۔

''میں آج بہت زیادہ خوش ہوں، ابھی مجھے پوری طرح سے یقین ہی نہیں آ رہا کہ میں بچ گئی ہوں۔ دوسرا تم میرے ساتھ بیٹھے ہو۔ تمہارا ساتھ میرے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔''

سونیا کے لہجے میں التفات تھا۔

سعد نے ایک تیکھی نگاہ سے میڈم کو دیکھا تھا۔ اسے میڈم کا انداز اوچھا لگا لیکن وہ کچھ نہیں بولا۔ سونیا اس پر خوش ہو گئی۔

ریسٹورنٹ کا منیجر انہیں خود پروٹوکول دینے آیا تھا۔ ایسے کسٹمرز بہت کم ہوتے تھے۔ جو اس طرح کے آرڈر دیتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد کھانا آ گیا۔

''کھانا شروع کریں۔'' سونیا نے نیپکن درست کیا۔

''مجھے کچھ نہیں کھانا، شمع نے کھانا تیار کیا ہوا ہے۔''

''گھر جا کر بھی کھا لینا، میں نے منع تھوڑی کیا ہے، لیکن میرے ساتھ بھی کھا لو پلیز۔''

سعد کھانا تو نہیں چاہتا تھا لیکن سامنے پڑی ڈشز بہت لذیذ تھیں، دوسرا ان سے لاجواب خوشبو اُٹھ رہی تھی۔ سو کھانا شروع کرنے میں اسے دیر نہیں لگی، سونیا نے بھی مسکراتے ہوئے کھانا شروع کیا۔

مشروب آیا، مشروب بھی اس نے پیا، سعد نے کبھی اتنا لذیذ مشروب نہیں پیا تھا بلکہ کبھی چند روایتی مشروبوں کے علاوہ کچھ نہیں پیا تھا۔

کھانے کے بعد سونیا نے ہاتھ صاف کرنے کے لیے نیپکن بڑھایا تو اس نے جھینپتے ہوئے ہاتھ صاف کیے۔

''کراچی کب آؤ گے؟'' سونیا نے پُرسکون لہجے میں کہا تھا۔

''کراچی کس لیے؟ میں نے نہیں آنا۔ میں نے یہیں پر کام شروع کر دیا ہے اور میں اپنی فیملی کے ساتھ بھی خوش و مطمئن ہوں۔ کراچی آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

سعد کا لہجہ ٹھوس تھا۔

سونیا کو اسی جواب کی امید تھی۔

''ہمارے درمیان بھی کچھ ہے، اس کا حتمی نتیجہ نکالنے کے لیے تمہیں کراچی آنا پڑے گا؟'' سونیا کی بات مبہم تھی۔

''میں آپ کو یہیں ملتان میں ہی طلاق دے دیتا ہوں، شرعی طور پر طلاق کے لیے جگہ کا تعین نہیں ہوتا۔'' سعد کے لہجے میں برف جیسی ٹھنڈک تھی۔

''تم ایک بار کراچی آؤ تو سہی، پھر طے کر لیں گے۔'' سونیا نے مدھم آواز میں کہا۔

''نہیں!'' سعد کے لہجے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بل آ گیا۔ سعد نے دیکھنے کی کوشش کی اور سونیا نے دکھانے کی کوشش کی، دونوں اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے تھے۔

سعد کا منہ حیرت سے کھل گیا اور سعد کا ردِعمل دیکھ کر سونیا کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

''اضافی پیسے تمہاری ٹپ!''

''اتنی بڑی رقم، ٹپ اُف!'' سعد چکرا کر رہ گیا۔

''دیکھو تم کراچی آؤ گے تو معاملات بہتر طریقے سے طے ہو جائیں گے۔''

''معاملات کیا طے ہوں گے قصہ یہیں ختم کیا جا سکتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے سعد کے سامنے بل کے طور پر دیئے جانے والی کئی نیلے نوٹ گھومے۔ سو آواز میں لرزش خود بخود آ گئی۔

''یہی بات مان لو، ایک بار کراچی آ جاؤ، پھر انکار مت کرو۔''

ایک لمحے کو دل چاہا ہامی بھر دے۔ کراچی جانے کی صورت میں کچھ رقم ہاتھ آ سکتی تھی۔

''نہیں میں کراچی نہیں آ سکتا۔ پیچھے میری بیوی اکیلی ہوتی ہے۔''

''تمہارے والد گھر پر ہوتے ہیں۔ تمہارا دوسرے نمبر والا بھائی بھی بائیس سال کا ہے، شمع کا میکہ بھی ساتھ ہے میں نے تمہارے ساتھی تنویر سے ساری انفارمیشن لی ہوئی ہے سو جھوٹے بہانے مت بناؤ۔''

''لیکن میں کراچی نہیں آنا چاہتا۔'' اس بار سعد کے لہجے میں تھوڑا اکھڑا پن بھی تھا۔

''کبھی کبھار کام مرضی کے خلاف کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہوتا۔ بس تم آ رہے ہو۔''

''میرے پاس رہنے کا بندوبست نہیں۔'' سعد کو پتا بھی نہیں چلا کہ وہ رضا مند ہوتا جا رہا ہے۔

''نو پرابلم تم بس آؤ۔''

''آ کر کرنا کیا ہے؟''

''آ رہے ہو نا۔''

سعد چپ کر گیا۔ کیا کہے؟

''لیکن.....'' لیکن کہنے کے بعد سعد خاموش ہو گیا۔ مزید کچھ کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

''میں تمہارا انتظار کروں گی، چلیں اب۔'' یہ مختصر ملاقات اس کے لائحہ عمل کا حصہ تھی۔

ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے سعد کی جیب میں سونیا نے کچھ پیسے ڈال دیے۔

''یہ کیا ہے؟'' سعد نے مزاحمت کرنا چاہی اور جیب میں ڈالے گئے پیسے نکال کر سونیا کی طرف بڑھا دیے۔ ہزار ہزار کے بہت سے نیلے نوٹ تھے۔ سعد کو وہ نوٹ بہت بھاری محسوس ہوئے تھے۔ واپس کرتے ہوئے اس کا ہاتھ لمحے بھر کو کپکپایا تھا۔

''رکھ لو، کراچی آنے کے لیے تمہارے کام آئیں گے۔''

''میں نے نہیں رکھنے۔'' سعد کی آواز پست تھی۔

''پلیز!'' پتا نہیں اس پلیز میں کیا جادو گھلا تھا کہ سعد نے ہاتھ کھینچ لیا اور پیسے ہاتھ میں بھینچے بیٹھا رہا۔

سونیا نے اسے ڈراپ کیا اور پھر ڈرائیور کو ایئر پورٹ چلنے کا کہا۔

ٹیکسی جھٹکے سے آگے بڑھی تھی تھوڑی دور جا کر سونیا مسکرائی، آخر آج سب کچھ ویسے ہوا تھا جیسے اس نے سوچا تھا۔

❁❁❁

''سعد آپ کیا کہہ رہے ہیں، آپ کراچی جانا چاہتے ہیں کیوں؟'' شمع نے تحیر سے پوچھا۔

''کیونکہ، کیونکہ.....'' سعد کو جھوٹ بولنا مشکل محسوس ہوا تھا۔

''کیونکہ کچھ معاملات نبٹانے ہیں فیکٹری کے۔''

''سعد ایسے کون سے معاملات ہیں جنہیں نبٹانے آپ ملتان سے کراچی جائیں گے۔ ایک ورکر نے کون سے معاملات نبٹانے ہوتے ہیں بھلا؟ مجھے تو جانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔''

''شمع تم سمجھ نہیں سکو گی، واقعی مجھے وہاں جا کر کام کرنا ہے۔''

''وہی تو مجھے بھی پتا چلے کہ ایسا کون سا بہت ضروری کام ہے جو آپ کے سوا کوئی بھی نہیں کر سکتا اور آپ کا جانا ضروری ہے۔'' شمع کا انداز جارحانہ تھا۔

سعد کو سمجھ نہ آئی کہ کیا تاویل دے۔

''شمع تم اتنی تفتیش کیوں کر رہی ہو؟'' سعد قدرے زچ ہوا تھا۔

''تفتیش؟ یہ تفتیش ہے؟''

''تفتیش نہیں تو اور کیا ہے؟''

''چلیں تفتیش ہی سمجھ لیں لیکن آپ بتائیں کہ کون سا ایسا ضروری کام ہے جو آپ نے کرنے جانا ہے؟''

''تمہیں سمجھ نہیں آئے گا۔''

''کیا سمجھ نہیں آئے گا۔ ایسا کون سا کام ہے جو آپ کو سمجھ آ جاتا ہے اور مجھے نہیں آئے گا؟''

''پڑھنے لکھنے کا کام ہے۔''

''پڑھنے لکھنے کا کام آپ کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا؟ اور جہاں تک پڑھنے لکھنے کے سمجھنے کا سوال ہے تو میں تو آپ سے زیادہ پڑھی لکھی ہوں پھر مجھے تو آپ سے زیادہ سمجھ آ جانا چاہیے۔''

''تم مجھے کم پڑھے لکھے ہونے کا طعنہ دے رہی ہو؟''

''طعنہ!! میں طعنہ نہیں دے رہی؟''

''طعنہ نہیں تو اور کیا ہے؟''

''دیکھیں سعد، مجھے ڈر لگتا ہے، آپ کو بھیجتے ہوئے اسی لیے.....'' شمع نے پسپا ہو کر کہا تھا۔

''شمع کچھ نہیں ہوگا۔''

''کچھ نہ بھی ہو لیکن آپ مجھے بتائیے تو سہی کہ آپ کا جانا کیوں ضروری ہے۔ مجھے آپ کی میڈم سے ڈر لگتا ہے۔ انہوں نے پوری فیکٹری کے ورکرز میں سے صرف آپ کی تنخواہ بڑھائی تھی پھر وہ اتنی دور آپ سے ملنے آئیں اور آپ نے ان سے ہاتھ ملایا تھا، ان ساری باتوں کی کوئی تو وجہ ہوگی؟ آپ وجہ بتا سکتے ہیں؟''

''شمع یہ شک کرنے والی بات ہے۔'' سعد کا دل گھبرایا کہ شمع نے سونیا کے ارادوں کو بھانپ لیا تھا۔

''یہ شک نہیں، مجھے خوف ہے۔''

''خوامخواہ کے خوف کا کوئی فائدہ ہے؟ میڈم مجھ جیسے ورکر پر کیوں فریفتہ ہوں گی؟'' سعد نے سنبھلنے کی کوشش کی تھی۔

''چلو یہ بات چھوڑیں۔ آپ نے ان سے ہاتھ کیوں ملایا تھا؟'' شمع الجھتی ہی جا رہی تھی اس سے پہلے کبھی بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ سعد نے یوں بات گھمائی ہو۔

''ہاتھ...... ہاتھ ملانے سے کیا ہوتا ہے۔'' سعد گڑبڑایا تھا۔

''ہاتھ ملانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ چلیں میں بھی کریانے والے توقیر سے جب سودا لینے جایا کروں گی اس سے مصافحہ کیا کروں گی۔ ٹھیک ہے نا؟؟''

''شمع بے وقوف تو نہیں ہو تمہاری بات اور ہے؟''

''میری بات کیوں اور ہے؟ سعد آپ میرے کسی بھی سوال کا مطمئن کرنے والا جواب نہیں دے رہے۔ ایسی صورت میں مَیں شک اور خوف میں مبتلا نہ ہوں تو اور کیا کروں؟''

شمع نے کچھ ایسی بے چارگی سے کہا کہ سعد مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

''میرا اعتبار کرو شمع، مجھے جانا ہے۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد سعد بولا تھا۔

شمع بس اسے دیکھتی رہ گئی اور چپ چاپ اٹھ گئی۔

شمع کے جانے کے بعد سعد شرمندہ شرمندہ بیٹھا رہا۔

''آخر میں خود کیوں جانا چاہتا ہوں؟'' تنگ آ کر اس نے خود سوچا تھا لیکن اسے اپنے آپ سے بھی مطمئن جواب نہیں ملا تھا۔ خود احتسابی مشکل کام ہوتا ہے اور سعد میں خود احتسابی کی صلاحیت نہیں تھی سو اسے جواب نہیں ملا تھا۔

وہ شرمندہ بھی تھا۔ آج سے پہلے اس نے شمع سے کبھی اس قدر اکھڑے لہجے میں بات نہیں کی تھی لیکن شرمندگی کا جذبہ کراچی جانے کی خواہش سے کم تھا۔

''جا کر کیا کروں گا؟'' سعد نے دوسرا سوال اپنے آپ سے کیا تھا، لیکن اس کا بھی اسے اطمینان بخش جواب ملے گا۔

سعد ابھی اس شش و پنج میں تھا کہ شمع ایک بار پھر کمرے میں داخل ہوئی۔ اب کے بار اس نے فیصل کو بھی اٹھایا ہوا تھا۔ ننھا فیصل اب ہر شوخ چیز کی طرف متوجہ ہوتا تھا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا۔

شمع آ کر سعد کے ساتھ بیٹھ گئی اور فیصل کو سعد کی گود میں دیا اور خود ایک ہاتھ سے سعد کے بال سنوارنے لگی۔ چند لمحے اس نے پہلے سے سیٹ بالوں کو سنوارنے کے نام پر بگاڑا۔ آخر اس کا ہاتھ کنگھی تو نہیں تھا۔ پھر اپنا سر سعد کے کندھے پر رکھ دیا۔ آنکھیں موند لیں۔ شمع کا والہانہ پن سعد کو بہت اچھا لگا۔ مگر اس کی شرمندگی میں بھی اضافہ ہو گیا۔

''کتنا عرصہ ہو گیا ہے، ہم نے کبھی میٹھی گفتگو ہی نہیں کی، پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کوئی کراچی وراچی نہیں جانا میں نے۔ شمع سے ایک پل بھی دور نہیں رہوں گا۔'' سعد نے سوچا۔

ابھی سعد کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ شمع مدہم آواز میں بول پڑی۔

''آپ بہت بُرے ہیں سعد، بندے کو کس قدر جذباتی کر دیتے ہیں۔ بات اعتبار پر لے آئے ہیں۔ مجھے آپ پر اس دنیا میں سب سے زیادہ اعتبار ہے۔ سو وجہ جانے بغیر آپ کو کراچی جانے دے رہی ہوں۔ میرا اعتبار کبھی مت توڑیے گا اور اس میڈم صاحبہ سے ذرا دور رہیے گا اور دوبارہ ہاتھ مت ملائیے گا۔''

سعد جواب میں ایک لفظ بھی نہیں بول سکا۔

''میرا اعتبار کبھی مت توڑیے گا۔'' ان الفاظ کو سوچتے ہوئے سعد نے تہیہ کیا کہ وہ سونیا سے اب تعلق توڑ کر آئے گا اور شمع کو اپنی اس نادانی کے بارے میں کبھی نہیں بتائے گا۔

سعد نے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کی تو اسے پتا چلا کہ شمع کی طرف سے اجازت ملنے پر وہ پھر کراچی جانے پر تیار ہو گیا ہے۔

''پاکیزہ کہتی تھی کہ میں مس بیزار ہوں۔ جس کی بیزاری ختم کرنے کے لیے کوئی شہزادہ آئے گا۔ آپ میرے وہی شہزادے ہیں۔'' شمع مسکرائی آواز سعد کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ بھی مسکرا اٹھا۔

''شادی سے پہلے میں بھی بہت نکما تھا۔ اماں بڑی سلجھی ہوئی تھیں۔ انہیں پتا تھا کہ

تمہارے آنے سے میرا نکما پن دور ہو جائے گا، سو تمہیں لے آئیں۔ اِدھر تم آئیں اور اُدھر نکما پن غائب ہو گیا۔''

دونوں نے یکے بعد دیگرے سر اٹھایا اور مسکراتی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تو اسی لمحہ فیصل رو پڑا۔ سعد نے اُفوہ کہہ کر اپنی گود سے پرے کیا۔

''ایک تو صاحبزادے کو اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ اب پھر پیشاب کر دیا۔ باپ کا لحاظ بھی نہیں کرتا۔''

شمع مسکرائی۔

''آپ جب اتنے ہوں گے تو آپ کو بھی صرف یہی کام ہوتا ہوگا۔ اماں ہوتیں تو تصدیق بھی کر دیتیں۔ لائیں فیصل کو مجھے دیں۔'' شمع نے فیصل کو سعد کے ہاتھوں سے لیا اور اسے باہر لے کر چلی دی۔

''اماں آپ نے جانے میں کچھ زیادہ ہی جلدی دکھائی ہے۔'' سعد نے ٹھنڈی سانس بھر کر سوچا تھا۔

''کراچی جانے کے بعد میڈم سے دور ہی رہیے گا بڑی خطرناک لگتی ہیں میں کہے دیتی ہوں۔''

دروازے میں پہنچ کر شمع نے اونچی آواز میں سعد سے کہا اور سعد نے گڑبڑا کر سر ہلا دیا تھا۔

❀❀❀

باہر سے شیشے کے کیبن کے اندر کا منظر کافی واضح دکھائی دیتا تھا اور سعد کو ابھی چند ہی لمحے ہوئے تھے شیشے کے کیبن کے دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے۔

سونیا نے فائل سے سر اٹھایا تو اسے سعد نظر آیا۔ خوشگواریت کے احساس کے ساتھ وہ مسکرا دی اور خود چل کر دروازے کے پاس آ گئی۔ دروازہ کھولا، ہاتھ بڑھا کر سعد کا ہاتھ پکڑا۔ اسے شمع کی تنبیہ یاد آ گئی۔ مگر سعد اپنا ہاتھ نہ چھڑوا سکا۔

''شکر ہے تم آ گئے، میں تو تمہارا انتظار کر کر کے آدھی ہو چکی تھی۔ آؤ بیٹھو، نہیں پہلے گیٹ اپ چینج کر لو، منہ ہاتھ بھی دھو لو، آؤ ادھر آؤ۔''

سونیا ہاتھ پکڑ کر سعد کو شیشے کے کیبن میں موجود ایک دروازے تک لے گئی۔ یہ واش روم تھا۔ دیوار پر لگی کھونٹی پر ایک ہینگر میں گرے پینٹ اور آف وائٹ شرٹ لٹک رہی تھی۔

''منہ ہاتھ دھو کر ڈریس چینج کر لینا۔'' سونیا نے سعد کو کہا تھا۔

''میں نے کپڑے نہیں تبدیل کرنے۔'' سعد نے پست آواز میں کہا تھا۔

''پلیز کر لو، کچھ نہیں ہوتا۔'' سونیا نے اپنا ہاتھ قدرے ترچھا کر کے ایک خاص انداز میں لہرا کر کہا۔

اب اس پلیز کی طاقت تھی یا پھر بے ایمان دل کی بے ایمانی کہ سعد مزید کچھ کہے بنا واش روم میں چلا گیا اور باہر کھڑی سونیا مسکرا دی۔

''واقعی پیسے میں بہت کشش ہوتی ہے میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ سب اتنا آسان ہوگا۔'' سونیا نے مسکراتے ہوئے سوچا تھا۔

سعد کے واش روم سے نکلنے میں لگ بھگ پندرہ منٹ لگے تھے۔ اسے اپنے آپ کو قائل کرنے یا تاویلیں دینے کے لیے اگر ٹائم لگا تھا تو یہ غیر معمولی بات نہیں تھی۔

''زبردست!'' سونیا نے سعد پر توصیفی نگاہ ڈالی۔

سعد کو سمجھ نہ آئی لیکن اتنا پتا چل گیا کہ سونیا نے اس کی تعریف کی ہے سو اس نے سر جھکا لیا۔

''پینٹ شرٹ پہننے کی عادت ہو گی تو ہنڈرڈ پرسنٹ صحیح طرح پہن لے گا۔'' سعد کے انداز میں جو اجڈ پن جھلکتا تھا اس کو محسوس کر کے سونیا نے سوچا تھا۔

سونیا اسے ہاتھ سے پکڑ کر میز کے دوسری طرف دو ایک جیسی پڑی کالی کرسیوں میں سے بڑی کی طرف لے آئی تھی۔

''بیٹھ جاؤ'' سونیا نے کہا تھا۔

سعد نے ایک نظر ارد گرد ڈالی اور پھر ایک نظر سونیا کے چہرے پر ڈالی، جہاں شاید مسکراہٹ چپک گئی تھی۔

سعد حیران ہوا جا رہا تھا۔ اسے اس پروٹوکول کی امید نہیں تھی۔ سونیا اسے اپنی سیٹ پر بٹھا رہی تھی۔

ایک دم جیسے کوئی حصار ختم ہوا تھا اور سویا ہوا سعد جاگ اٹھا۔ اسے اچانک یاد آیا کہ ملتان کی ایک تنگ گلی میں شمع نام کی ایک خوبصورت اور خوب سیرت لڑکی رہتی ہے جو اس کی زندگی ہے، جس سے وہ انتہا درجے کا پیار کرتا ہے، جس کے بغیر وہ جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس شمع کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اس نے سونیا میڈم سے نکاح کیا تھا۔ میڈم مر جائے گی اور پیسہ ہاتھ لگ جائے گا لیکن میڈم تو بچ گئی۔

سعد کے ذہن میں سب باتیں آئیں لیکن جو بات ذہن میں نہ آئی وہ وہی تھی جس کا شمع

کئی بار اظہار کر چکی تھی۔ کہ اب شمع کے دل میں پیسے کی محبت مر چکی ہے لیکن اس کے دل میں
تو پیسے کی محبت اب پیدا ہوئی ہے اور یہ محبت اس قدر جلدی پروان چڑھ رہی تھی کہ خود شمع بھولی
جا رہی تھی۔ حصار سے نکلنے کے باوجود وہ خود احتسابی نہ کر سکا۔ وہ یہ محسوس نہ کر سکا کہ اسے
زندگی میں پہلی بار اس قدر پروٹوکول مل رہا ہے، اور یہ پروٹوکول اسے بے حد اچھا لگ رہا ہے
حد سے زیادہ اچھا۔

''کیا ہوا سعد بیٹھو؟'' پیسے کے زور پر ایک بار پھر پروٹوکول سے حصار قائم کیا گیا تھا۔
''لیکن میں یہاں اس مقصد کے لیے تو نہیں آیا۔'' حصار ابھی اس قدر مضبوط نہیں ہو
سکا تھا کہ ضمیر بھی چپ رہتا۔ سو ضمیر نے سعد کو بولنے پر مجبور کیا۔

''سعد تم شوہر ہو میرے، میری ہر چیز تمہاری ہے تمہیں یہاں ہر حال میں بیٹھنا ہے۔
دیکھو سعد میں شمع کا حق نہیں مار رہی صرف اپنا حق لے رہی ہوں۔ تم شاید اس بات کو بھول
رہے ہو کہ اسلام میں مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہے۔ یعنی دوسری بیوی ہونے کی وجہ سے
تمہیں مجھے اتنا حق تو دینا ہوگا کہ تم میری جگہ پر بیٹھو اب پلیز بیٹھو نا۔'' سونیا نے ٹھہر ٹھہر کر
الفاظ ادا کیے تھے۔

اس کی دلیل سن کر اگلے لمحے کانپتے ہوئے اس کالے رنگ کی کرسی پر بیٹھ گیا۔
اور سونیا کی مسکراہٹ اور بھی گہری ہوگئی۔
پھر سونیا بھی سعد کے ساتھ قدرے چھوٹی کالے رنگ کی کرسی پر بیٹھ گئی۔
بیل بجا کر چپراسی کو بلایا اور اسے منیجر کو بلانے کا حکم دیا۔ وہ حکم ملتے ہی آ گیا۔
''عابد صاحب! سعد کو ویسے تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اب ایک بات کا اضافہ کر لیں کہ
میں اب مسز سعد ہوں۔ اس فیکٹری کی باگ مسٹر سعد اکبر کے ہاتھ ہوگی۔ جیسے ہی مسٹر سعد
فیکٹری بزنس سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے، میری کرسی یہاں سے ہٹ جائے گی۔
آپ قابلِ بھروسہ انسان ہیں۔ امید ہے آپ میری اور میرے خاوند کی پوری طرح مدد کریں
گے۔''

''یس میڈم!'' منیجر نے قدرے توقف سے کہا۔ سونیا کیا کرنے جا رہی تھی یہ اس کے
لیے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔

❀ ❀ ❀

ہلکے سبز رنگ کے شب خوابی کے لباس میں ملبوس سونیا اس وقت ڈریسنگ ٹیبل کے
سامنے کھڑی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کافی دیر کھڑے ہو کر اپنے آپ کو دیکھے جانا اس

کے مشغلوں میں سے ایک تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں ایک جگہ دراڑوں سے پُر تھی۔
یہاں پر اس نے کبھی ہیئر برش مارا تھا

''ہاؤس کیپر سے کہہ کر یہ شیشہ تبدیل کرواتی ہوں۔'' سونیا نے اپنے ریشمی بال جھٹکے
تھے۔

ڈریسنگ ٹیبل کی دراز کھول کر اس میں سے ایک ڈبیا نکالی اور گردن موڑ کر فاتحانہ
نظروں سے سعد کو دیکھا۔ اس وقت وہ خاموش لیٹا ہوا چھت پر لٹکے فانوس کو تکے جا رہا تھا۔
اس وقت وہ برانڈ ڈ بنیان اور امپورٹڈ ٹراؤزر میں ملبوس تھا۔ اسے یقین تھا کہ سعد نے آج تک
کبھی ایسے آرام دہ بستر اور خوبصورت کمرے کو استعمال نہیں کیا ہوگا۔

''سعد ادھر آؤ۔'' سونیا نے مسکراتے ہوئے سعد کو بلایا تھا۔
سعد چپ چاپ سونیا کے قریب جا کر کھڑا ہوا۔
سونیا نے ڈبیا سعد کی طرف بڑھائی۔
''یہ کیا ہے؟؟'' سعد نے پوچھا تھا۔
''کھولو تو سہی۔''

سعد نے ڈبیا کھولی اور اس میں موجود سونے کی چین اور لاکٹ نکالا۔ لاکٹ سانپ کی
طرح بل کھاتے ایس پر مشتمل تھا۔

سعد چین اور لاکٹ کو لیے ہاتھ میں کھڑا تھا۔

''یہ مجھے پہنا دیں۔ برسوں پہلے میں نے لیا تھا۔ سوچا تھا کہ کوئی خاص ہی پہنائے گا۔
ایس کی شکل کا یہ لاکٹ مجھے بے حد پسند ہے اور اتفاق دیکھیں ہم دونوں کا نام بھی ایس سے
شروع ہوتا ہے۔''

سونیا کے آخری فقرے پر سعد کو کافی عرصے پہلے شمع سے کہا گیا جملہ یاد آ گیا۔
''ہم دونوں کا نام ایک ہی حرف سے شروع نہیں ہوتا۔ میرا نام 'س' سے شروع ہوتا ہے
اور تمہارا نام 'ش' سے۔'' سعد نے بُرا سا منہ بنایا تھا۔

شمع ہنس پڑی۔ ''انگریزی کا تو ایک ہی حرف بنتا ہے۔ ''ایس''، شمع نے ہنستے ہوئے کہا
تو سعد نے بھی سوچا اور یہ سوچ کر خوش ہو گیا۔

''کیا ہوا پہنایئے نا۔'' سونیا کی آواز نے یادوں کا تسلسل توڑا۔

''سونیا اور میرا نام تو اردو کا بھی ایک ہی حرف بنتا ہے۔'' یہ سوچتے ہوئے سعد نے
سانپ کی طرح بل کھاتے ایس کو شہادت کی انگلی سے چھو کر محسوس کیا۔ اچانک اسے مور پنکھ

کے ڈیزائن سے ... بہت رکھنے والی چاندی کی انگوٹھی یاد آ گئی۔ وہ انگوٹھی اس نے کبھی شمع کی شہادت کی انگلی میں پہنائی تھی۔

دوسرے لمحے سعد نے وہ چین لاکٹ سونیا کی گردن میں پہنا دیا۔

"سعد میں آپ کے لیے جم کارڈ بنوا رہی ہوں۔ جم جائیں گے تو مزید نکھر جائیں گے۔" سونیا کی نظریں بنیان سے جھلکتی وجاہت پہ تھیں۔

سعد اسے دیکھتا رہ گیا۔

"یہاں ساتھ ہی ایک جم خانہ ہے۔ پاکستان کے سب سے اچھے جم خانوں میں سے ایک ہے آپ کل سے ہی چلے جایئے گا۔"

دراصل وہ سعد کو اس کی اپنی ذات میں گم کر رہی تھی اپنی ذات پر توجہ دینے سے باقی چیزوں پر توجہ خود بخود کم ہو جاتی ہے اور سونیا یہی چاہتی تھی۔

❁❁❁

وہ فیکٹری ہاتھ آ گئی جس کا کبھی وہ ورکر ہوا کرتا تھا۔ عزت مل گئی جس کے لیے ایک عام انسان ساری زندگی تگ و دو کرتا ہے۔ دولت مل گئی جسے کمانے کے سعد مختلف منصوبے بنایا کرتا تھا اور ساتھ میں سونیا جیسی خوبصورت پیار کرنے والی بیوی بھی۔ شمع سے وہ بے حد پیار کرتا تھا لیکن سونیا اسے بے تحاشا چاہتی تھی۔

سعد پر چند دنوں میں یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ کسی کو محبوب بنانے سے کسی کا محبوب بننے میں زیادہ خوبصورتی اور لطف ہے۔ خوبصورتی اور لطف سے تو کوئی بھی نہیں بھاگتا۔ تو سعد کیونکر بھاگتا؟؟

ٹیکسی اس کی گلی کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ وہی گلی جس میں اس نے بچپن میں ہر قسم کا کھیل کھیلا تھا۔ وہی گلی جس میں گزرتے ہوئے وہ دعا کیا کرتا تھا۔ یا اللہ شمع سے سامنا ہو جائے، وہی گلی جس میں سال کے چار مہینے گٹر کا گندا پانی یا بارش کا گدلا پانی کھڑا رہتا تھا۔ وہی گلی جس میں گھر کا کوڑا پھینکنے کا رواج تھا۔ وہی گلی جس کے ایک گھر میں شمع مہینے بھر سے اس کی کراچی سے واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔

"سعد کیا سوچ رہے ہو؟ جاؤ نا۔" سونیا نے سعد کو مخاطب کیا۔

"ہاں، جاتا ہوں، تم بھی ساتھ چلو۔" سونیا اب نہ اس کے لیے میڈم تھی اور نہ ہی وہ اب سونیا کو آپ کہہ کر بلاتا تھا۔ سونیا اب صرف اس پر محبت اور پیسہ لٹانے والی بیوی تھی۔

"نہیں سعد، تم خود جا کر شمع کو اور اپنے باقی گھر والوں کو لے آؤ، میں جاؤں گی تو سب

اپ سیٹ ہوں گے۔ ویسے بھی میری موجودگی میں تم بھی سب کو کچھ بھی صحیح طرح نہ بتا سکو گے اور نہ ہی انہیں قائل کر سکو گے۔" سونیا نے رسان سے کہا تھا۔

"اور تم یہاں ٹیکسی میں بیٹھی رہو گی؟" سعد نے پوچھا تھا۔

"ہاں!"

نہیں تم ٹیکسی میں مت بیٹھی رہو، اندر ساتھ چلو۔"

"اندر تو نہیں جانا میں نے، کام خراب ہو گا، ٹیکسی میں بیٹھے رہنے میں بھلا کیا حرج ہے۔"

"مجھے دیر ہو جائے گی۔"

"کتنی دیر ہو جائے گی۔ دو گھنٹے، چار گھنٹے یا آٹھ گھنٹے میں انتظار کر لوں گی۔ تمہارے لیے تو میں زندگی بھر انتظار کر سکتی ہوں۔" سونیا نے مسکرا کر کہا تھا۔

سعد، سونیا کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"سونیا عبدالرحیم، آپ اس طرح بیٹھی رہیں گی تو عجیب لگے گا۔"

"میرا نام سونیا عبدالرحیم تھا اور اب تو سونیا سعد ہوں۔"

"رحیم تو اللہ کا نام ہے، تمہارے ابو کا نام تو عبدالرحیم لغاری ہے۔" سعد کو کسی کی بات یاد آ گئی تھی سو اس نے کہا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اب دنیا کے ساتھ بھی تو چلنا ہے۔ اس لیے میں تو اپنا نام سونیا رحیم ہی لکھا کرتی تھی۔ اب میں سونیا سعد......"

"لیکن سونیا......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں، کوئی عجیب نہیں لگتا، ویسے بھی ہم اس محلے میں دوبارہ تھوڑی آئیں گے۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ تم شمع اور اپنے بہن بھائیوں کو لے آؤ۔" سونیا نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھا لیا تھا۔

سعد نے نظر بھر کو سونیا کو دیکھا تھا۔ اسے لگا تھا کہ سونیا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس کا ساتھ نہ جانا ہی بہتر ہے۔ سو وہ تنگ و تاریک گلی کی طرف چلا گیا۔

سعد کے جانے کے بعد سونیا نے کالا چشمہ اتارا اور اپنے بیگ سے ایک میگزین نکال کر پڑھنے لگ گئی۔ اسے یقین تھا کہ شمع کبھی بھی سعد کے ساتھ نہیں آئے گی اور سعد کے والد اور بہن بھائیوں کے آنے یا نہ آنے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

وہ باہر ٹیکسی میں بیٹھی سعد کا اس لیے انتظار کر رہی تھی تا کہ وہ ہر بات جلدی میں کرے۔

اگر وہ سب باتیں جلدی میں بتاتا تو شمع کو سنبھلنے کا موقع کم ملتا اور سعد کو اپنی صفائی دینے کا موقع بھی نہ ملتا اور سونیا یہی سب چاہتی تھی۔

''پتا نہیں کیا مسئلہ ہوگیا ہے؟ سعد نے مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا، یا اللہ میرے سعد کو حفظ وامان میں رکھنا۔'' آٹا گوندھتے ہوئے شمع یہی سوچ رہی تھی۔ ''اسی لیے تو میں کراچی جانے کے حق میں نہیں تھی۔'' شمع نے بے زاری سے سوچا۔ یہ سوچیں پچھلے، پندرہ دنوں سے شمع کے ساتھ تھیں۔ سعد کو گئے ہوئے ایک مہینہ نے کو تھا۔ پہلے دس دنوں میں اس نے دو بار توقیر کی دکان پر فون کر کے شمع اور اکبر کو بلوایا تھا اور ان سے بات کی تھی۔

شمع کو اس وقت سعد کا لہجہ عجیب تو لگا تھا لیکن اس سے زیادہ عجیب اور حیران کن بات یہ تھی کہ اب بیس دن ہونے والے تھے اور سعد نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔

''بندہ خط بھی تو بھیج سکتا ہے۔'' شمع نے الجھتے ہوئے سوچا تھا۔

ساگ اور لسی وہ تیار کر چکی تھی اور اس نے روٹی بنانی تھی۔ ''کاش سعد ہوتے، ساگ انہیں کس قدر پسند ہے۔'' وہ ہانڈی کی آگ بجھاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ ''یا اللہ میں کیا کروں؟ سعد سے کسی طرح رابطہ ہوجائے یا پھر وہ خود آجائیں۔'' شمع کا دل چاہا رو دے۔ وہ دل تھام کر اٹھی۔ ''ابو دکان سے، مزمل اور صوفیہ سکول سے آجائیں تو روٹیاں لگاؤں گی ساگ کے ساتھ تو تازہ روٹیاں ہی اچھی لگتی ہیں۔'' یہ سوچتے ہوئے شمع اٹھی۔ بے خیالی میں دروازے کی جانب دیکھا تو سعد کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

''سعد!'' باقی کا فاصلہ اس نے جیسے اڑ کر طے کیا تھا۔

''سعد آپ آئے، رابطہ کیوں نہیں......'' باقی کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ اوپر سے نیچے سعد کا معائنہ کیا۔ وہ پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا۔ سعد مسکراتے ہوئے شمع کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جانے کیوں شمع کو سعد کی مسکراہٹ میں کچھ کمی سی لگی۔

''کیسی ہو شمع؟'' سعد آگے بڑھا تھا۔ شمع بلا ارادہ ایک قدم پیچھے ہوئی۔

''اچھی ہوں، آپ بتائیں کیسے ہیں؟ صحت ٹھیک ہے، رابطہ کیوں نہیں کیا؟ میں اتنا پریشان رہی۔ ایسے کرتے ہیں بھلا؟؟'' وہ الجھ کر رہ گئی۔

''یہ کپڑے کہاں سے آئے؟ افوہ میں بھی پاگل ہوں بعد میں سب بتا دیجیے گا۔ اتنے لمبے سفر سے آئے ہیں، تھک گئے ہوں گے اور میں نے آپ کو کھڑا کیا ہوا ہے۔ آئیں اندر جا کر بیٹھیے۔ پیاس تو نہیں لگی؟'' شمع نے جلدی جلدی سے کہا تھا اور کچن سے باہر جانے لگی۔

سعد بھی اس کے پیچھے ہولیا۔

''شمع، آرام سے، میں تھکا ہوا نہیں ہوں۔''

''چلیں بہانے اور جھوٹ نہیں چلتے، اتنا لمبا سفر ٹرین پر کر کے بندہ تھک ہی جاتا ہے۔''

''شمع میں واقعی تھکا ہوا نہیں ہوں، کیونکہ میں جہاز پر آیا ہوں۔''

شمع نے نظر بھر کر سعد کو دیکھا۔

''جہاز پر؟'' شمع نے تھوک نگلا۔

''اتنے پیسے کہاں سے آئے آپ کے پاس؟'' شمع ٹھٹک گئی۔

''بتاتا ہوں، آرام سے بتاتا ہوں۔'' سعد آگے بڑھ کر برآمدے میں موجود ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ سعد کے بیٹھنے تک شمع صحن میں اس جگہ کھڑی رہی اور پھر آہستہ آہستہ برآمدے میں آئی اور برآمدے کی دیوار کو سہارا دینے والے ستون کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔

''جہاز پر آنے کے لیے آپ کے پاس پیسے کہاں سے آئے؟ اور یہ اتنے مہنگے کپڑے کہاں سے لیے آپ نے؟'' شمع کو یہ باتیں چبھ رہی تھیں اور وہ ان باتوں کا جلد از جلد جواب چاہتی تھی۔

ابھی سعد کچھ بولنے ہی والا تھا کہ صوفیہ بھاگتی ہوئی آگئی۔

''بھیا!'' صوفیہ کے پیچھے مزمل بھی سُست قدموں سے آیا تھا۔ بھائی کو دیکھ کر اس کے قدم تھوڑے تیز ہوئے۔ مسکراتے ہوئے اس نے سعد کو سلام کیا۔ سعد نے اس سے پہلے مصافحہ کیا تھا اور گال چوما تھا۔

''کیسی ہو صوفیہ؟''

''ٹھیک، آپ میرے لیے کیا لائے ہیں؟''

''میں......'' سعد سوچ میں پڑ گیا

''میں اپنی شہزادی کو ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔''

شمع مزید الجھی تھی۔

''ساتھ لے جانے کا مطلب؟'' صوفیہ سے پہلے شمع نے پوچھ لیا۔

''بتاتا ہوں۔'' سعد نے کچھ توقف کے بعد کہا تھا ساتھ میں اس کے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ سونیا باہر گاڑی میں بیٹھی ہے سو اسے اب جلدی بات کر لینی چاہیے۔

''بھابی آج آپ نے ساگ بنایا ہے نا، بھائی کو بہت پسند ہے۔'' مزمل نے جوش سے بتایا۔

''کھانا لاؤں آپ کے لیے ساگ اور لسی؟'' شمع نے پوچھا تھا۔

''نہیں!'' سعد نے جواب دیا تھا۔ اس بار ساگ کا سن کر اس کا دل نہیں للچایا تھا۔ بڑے بڑے ہوٹلوں کے لذیذ کھانے کھا کر ساگ کے لیے اس کی چاہت چند دنوں میں ہی ختم ہوگئی تھی۔

''شمع میں تم لوگوں کو لینے آیا ہوں۔''

''کہاں؟''

''کراچی!''

''مگر کس لیے؟'' شمع کو الجھن نما پریشانی نے گھیرا ہوا تھا۔

''ہم لوگ وہاں جا کر رہیں گے۔'' سعد نے ٹھہر کر جواب دیا تھا۔

''لیکن کیوں؟'' شمع نے ضبط سے پوچھا تھا۔

''وہاں ہمارا بہت اچھا گھر ہے۔''

سعد نے دانستاً کچھ قابلِ قبول الفاظ کا استعمال کیا تھا۔

''ہمارا گھر؟ کہاں سے آیا؟'' شمع نے دھڑکتے دل سے پوچھا تھا۔ اس کی چھٹی حس اسے کسی انہونی کے بارے میں خبر دے رہی تھی۔

''بھیا ہمارا تو اس گھر کے علاوہ کوئی گھر نہیں، ہم لوگ تو کبھی کراچی گئے ہی نہیں تو وہاں گھر کہاں سے آگیا۔'' سعد کی بات تیرہ چودہ سالہ مزمل کے لیے بھی حیران کن تھی۔

فیصل کے رونے کی آواز برآمدے تک آئی۔ شمع ایک سوالیہ سی نظر سعد پر ڈال کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کمرے کی طرف جس میں اس کے جہیز کی مسہری تھی اور جہاں دلہن بن کر سعد کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

شمع نے روتے ہوئے فیصل کو اٹھالیا، شمع کے اٹھاتے ہی وہ چپ کر گیا۔ اس سے پہلے کہ شمع فیصل کو لے کر کچن میں اس کے لیے دودھ لینے جاتی سعد کمرے میں آگیا۔

''کیسا ہے میرا بیٹا؟'' سعد نے نرمی سے فیصل کے گال کو چھوا مگر اسے لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھائے۔ دراصل سعد کو خوف تھا کہ فیصل پیشاب نہ کردے۔

''ایک مہینہ آپ کو فیصل کی یاد نہیں آئی۔'' شمع کے لبوں پر نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ آگیا تھا۔

''کیسی بات کرتی ہو شمع، بیٹے کی یاد نہیں آئے گی بھلا؟'' سعد نے تکلف سے کہا تھا۔

''میں فیصل کے لیے دودھ لے آؤں، ورنہ یہ پھر رونا شروع کردے گا۔ باہر صوفیہ

اور مزمل کو بھی بھوک لگی ہوگی۔'' شمع کو احساس ہوا تھا لیکن سعد کی توجہ اس طرف بالکل بھی نہیں گئی کہ کوئی بھوکا ہے، بار بار اسی طرف جاتی رہی کہ گاڑی میں بیٹھی سونیا انتظار کر رہی ہے۔

''شمع ٹھہرو۔'' سعد نے شمع کو روکا۔

''بہتر ہے کہ صاف لفظوں میں بتادوں۔ پہیلیاں بجھوانا مناسب نہیں۔'' یہ سوچتے ہوئے سعد نے اپنے آپ کو ہمت بندھائی تھی۔

''شمع وہ اصل میں، میں نے......'' سب بتانا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔

شمع منتظر تھی کہ سعد کچھ کہے، سعد نے ایک نظر کمرے پر ڈالی ایک ہی نظر میں وہ پہچان گیا کہ کرسیوں کے کور پاکیزہ کے کاڑھے ہوئے ہیں۔ مسہری پر بچھی ہوئی چادر بھی پاکیزہ کی کاڑھی تھی۔ اردگرد پر نظر دوڑا کر اس کی نظر شمع پر آکے ٹھہر گئی اور زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ سعد اب تک شمع کے لباس کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ ایک نظر سعد نے شمع کے لباس پر ڈالی آف وائٹ کلر کا سوٹ جس کے دامن پر آدھا کاڑھا ہوا پھول تھا۔ اس سوٹ کی کڑھائی بھی پاکیزہ نے کی تھی۔ مکمل پھول کاڑھنے سے پہلے ہی وہ مرگئی تھی۔

ویسے سعد کو یہ ادھوری کڑھائی والا سوٹ کچھ زیادہ پسند نہیں تھا لیکن شمع کے جذبات اس سے وابستہ تھے۔ یہ سوچ کر اس نے کبھی اسے یہ سوٹ پہننے سے منع نہیں کیا تھا۔

''ہاں کیا بتا رہے تھے؟'' شمع نے پوچھا تھا۔

''ہاں ہاں بولیے کیا کہنا ہے آپ نے؟ جو دل میں ہے بتا دیجیے۔ کوئی مسئلہ نہیں؟'' شمع چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ لا کر بولی۔ اس مسکراہٹ کے کھوکھلے پن سے سعد کو بھی واقفیت تھی۔

''میں نے دوسری شادی کرلی ہے۔'' سعد نے ایک پرزور سانس لی تھی۔

شمع نے ایک بے یقین نگاہ سعد پر ڈالی۔ آنکھوں سے دو آنسو نکلے اور گالوں پر پھسلتے چلے گئے تھے۔ شمع چپ چاپ باہر جانے لگی۔

''شمع میری بات سنو۔'' سعد نے پیچھے سے پکارا تھا۔

شمع نے کوئی ردعمل نہ دکھایا۔ فیصل نے بھی رونا شروع کردیا۔ فیصل کو برآمدے میں بیٹھے مزمل کو پکڑایا تو وہ بولا۔

''بھابی جلدی سے روٹی لگا دیجیے۔ بہت بھوک لگی ہے۔'' شمع چپ چاپ کچن کی طرف چلی گئی۔

کچن میں جا کر اس نے ایک چھوٹے سے گلاس میں دودھ ڈالا جا کر مزمل کو دیا۔

''فیصل کو آرام آرام سے دودھ پلانا۔ ابھی چھوٹا ہے نا اسی لیے گلاس سے صحیح طرح نہیں پی سکتا۔''

دوبارہ کچن میں آئی اور ابھی وہ لکڑیوں کو آگ جلانے کی تیاری کر رہی تھی کہ سعد بھی آ گیا۔ ''میں تم سب لوگوں کو لینے آیا ہوں۔'' سعد نے شمع کے ساتھ بڑی چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا

''آپ جائیں، میں نے کہیں نہیں جانا۔'' شمع کی آواز میں کسی قسم کے جذبات نہیں تھے۔

''لیکن شمع......''

''میڈم کے ساتھ آپ خوش رہیں گے۔'' شمع جانتی تھی کہ سونیا کے علاوہ سعد کسی سے شادی نہیں کر سکتا۔

''شمع وہ مرنے والی تھی، اسے کینسر تھا۔ تب میں نے شادی کر لی۔ سوچا پیسہ ہاتھ لگ جائے گا'' سعد نے صفائی پیش کی تھی۔ جانے کیوں وہ اس پل شرمندگی محسوس کرنے لگا تھا۔

''مری تو نہیں نا، تو اب جائیے اسی کے ساتھ زندگی گزاریئے۔''

''شمع میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا تم میری محبت ہو۔'' سعد نے بے چارگی سے کہا تھا شاید پیسے اور پروٹوکول سے تعمیر کیا گیا حصار کمزور پڑ گیا تھا۔

''ایسا نہیں ہے سعد یہ صرف آپ کا وہم ہے آپ میرے بغیر بھی اچھی زندگی گزاریں گے۔'' آگ جل گئی تو شمع نے توا آگ کے اوپر رکھا۔

''شمع وہاں سب کچھ ہے۔ اس لکڑیوں کی آگ سے بھی چھٹکارا مل جائے گا جو میری ماں کو کھا گئی۔''

''جل کر مرنا ہوگا تو وہاں سوئی گیس سے بھی مر جاؤں گی۔ نہیں مرنا ہوگا تو یہ آگ بھی کچھ نہیں کہتی۔'' شمع نے آٹے کا تھال آگے کو سرکایا اور ایک پیڑے جتنا آٹا لے کر روٹی بنانے لگی۔

سعد خاموش ہو گیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح شمع کو قائل کرے۔

''شمع یہ شادی میں نے تمہارے لیے کی ہے۔ تمہاری خواہشات کو پورا کرنے کے لیے بنگلہ، گاڑی، نوکر چاکر اور بے تحاشہ دولت۔''

شمع نے روٹی توے پر ڈالی اور سعد کو ایک نظر دیکھا۔ شمع کی نظروں میں کچھ ایسا تھا کہ سعد گڑبڑا گیا۔

''جھوٹ، کوئی مرد بھلا اپنی بیوی کو روپیہ پیسے دینے کے لیے دوسری شادی کرتا ہے؟''

شمع نے روٹی کی سائیڈ بدلی۔ وہ باتیں اس طرح کر رہی تھی کہ صحیح طرح سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ روٹی پکانا اس کے لیے زیادہ اہم ہے یا سعد کی باتوں کا جواب دینا۔

''یقین مانو۔ میں نے شادی تمہارے لیے کی ہے۔'' سعد کا لہجہ تیز ہوا تھا۔

شمع نے ساتھ پڑا دیسی گھی اٹھایا اور روٹی پر تھوڑا سا ملا پھر روٹی کو توے سے اتار لیا۔

''صوفیہ آؤ روٹی لے جاؤ'' شمع نے آواز لگائی۔ صوفیہ کے آنے تک وہ روٹی پر ساگ بھی رکھ چکی تھی۔

''مزمل اور تم دونوں اکٹھے کھالو، دوسری روٹی دینے میں خود آتی ہوں۔'' صوفیہ چھابی لے کر چلی گئی۔

''دو سال پہلے کی باتیں یاد ہیں۔ مہینہ بھر پہلے کا کہا یاد نہیں۔'' شمع نے دوسری روٹی توے پر ڈالی تھی۔

''وہ بھی یاد ہے۔'' سعد جھنجلایا تھا۔

''یاد ہوتا تو شادی نہ کرتے۔'' شمع کو سعد کے انداز دیکھ کر ایسے لگا کہ وہ خود توے پر بیٹھی ہے۔

''اب تھوڑی جا کر شادی کی ہے۔ شادی تو میں نے چھ مہینے پہلے کی تھی۔ اب تو میں طلاق دینے گیا تھا لیکن اب مجھے لگا کہ طلاق دینا مناسب نہیں۔''

''بہت خوب!'' شمع سعد کو دیکھ کر رہ گئی۔

''چھ مہینے پہلے، بتایا بھی نہیں، اسی لیے میڈم، یہاں پر آئی۔'' شمع کو شدید دکھ ہوا۔

''شمع تم بات سمجھنے کی کوشش کرو، میں نے جب شادی کی تھی تب سونیا کینسر سے مرنے والی تھی، میں نے سوچا......''

''سعد براہ مہربانی چپ بیٹھ سکتے ہیں تو بیٹھیں ورنہ چلے جائیں مجھے جو کچھ سمجھنا تھا سمجھ چکی۔'' شمع کا لہجہ درشت ہو گیا۔

''شمع میری بات سنو۔''

''سننے کو کچھ ہے کیا، سعد آپ چھ مہینے پہلے شادی کر آئے ہیں اور مجھے اب بتا رہے ہیں اور اوپر سے یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ نے شادی بھی مجھے عیش میسر کرنے کے لیے کی اور کیا سنانا باقی ہے۔'' شمع نے روٹی کو توے سے اتارا۔

روٹی جل چکی تھی۔ شمع کی قسمت کی طرح۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا۔

جلی ہوئی روٹی کو ایک سائیڈ پر رکھ کر شمع دوسری روٹی کا پیڑا بنانے لگی۔

''شمع، سونیا باہر گاڑی میں بیٹھی انتظار کر رہی ہے اور تم روٹیاں بنائے جا رہی ہو، میری بات بھی نہیں سنتی، یار اب مان بھی جاؤ ہم چلتے ہیں کھانا کسی اچھے بڑے ہوٹل سے کھا لیں گے۔ تم بس چلنے کی تیاری کرو۔'' سعد نے دانستہ طور پر اپنا لہجہ حتیٰ المقدور نرم رکھا۔

''انتظار'' شمع نے چبا کر لفظ دہرایا اور ہاتھ پر بڑھائی ہوئی روٹی دوبارہ آٹے کے تھال میں پھینکنے کے انداز میں ڈالی۔

''مہینہ بھر میں نے آپ کا انتظار کیا۔ فون نہیں کر سکے اور اس کا لمحوں کا انتظار محسوس ہو رہا ہے۔'' نا چاہتے ہوئے شمع نے شکوہ کیا اور یہ شکوہ سعد کو بڑا کڑوا لگا تھا۔

''اور رہ گئی بات کہیں جانے کی، تو میں اور میرا بیٹا کہیں نہیں جا رہے اور جس کسی کو آپ نے لے کر جانا ہے اور کسی اچھے اور بڑے ہوٹل میں کھانا کھلانا ہے، لے جائیں۔''

شمع پاؤں پٹختے ہوئے کچن سے باہر نکل گئی۔

''دوسری شادی کی ہے شمع تو اس میں بُرا کیا ہے۔ دوسری شادی کی اجازت تو مجھے اسلام نے بھی دی ہے۔'' شمع ٹھٹک کر رک گئی۔

''بالکل اسلام نے آپ کو دوسری شادی کی اجازت دی ہے۔'' سعد کی بات شمع کو چھلنی کر گئی، آنکھیں بھر آئیں۔ شمع کے آنسو دیکھ کر سعد کو پشیمان ہونے لگا۔

کچن سے برآمدے تک کا فاصلہ شمع نے دوڑ کر طے کیا تھا۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے مزمل اور صوفیہ کے ساتھ لیٹے فیصل کو اٹھا لیا۔ مزمل اور صوفیہ دوسری روٹی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

''بھابی روٹی؟'' صوفیہ چھوٹی تھی اس لیے اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس نہیں ہوا تھا لیکن مزمل نے شمع کے آنسو دیکھ لیے۔ وہ کچھ پوچھ نہیں سکا تھا۔ شمع اپنے کمرے میں آئی اور دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی اور فیصل کو سینے سے لگا کر رونے لگ گئی۔ اس کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ اسے ایک پل کو دھوکا ہوا کہ کہیں آنے والا شخص کوئی اور تو نہیں سعد سے ایسی باتوں کی امید تو نہیں تھی لیکن حقیقت یہی تھی کہ آنے والا سعد ہی تھا۔

مرے مرے قدموں سے سعد برآمدے تک آیا اور شکستہ سا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس سے واقعی غلطی ہوئی تھی۔ اسے احساس ہونے لگا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا بھائی؟'' مزمل نے ہمت کر کے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' سعد نے بے دلی سے جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ سعد جا کر شمع کا دروازہ کھٹکھٹاتا، اکبر گھر میں داخل ہوا اور بیٹے کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔

''آ گیا میرا پتر!'' اکبر بڑے جوش سے بیٹے سے ملا۔

''کیسا ہے تُو؟ سفر تو ٹھیک گزرا؟'' اکبر بیٹے کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''جی!'' سعد نے مختصر سا جواب دیا۔

''اور سنا اتنی دیر کیوں لگا دی؟ شمع کہاں ہے؟ کب آیا ہے تُو؟'' اکبر نے ایک ساتھ تین باتیں پوچھی تھیں۔ جن میں سے سعد نے صرف ایک کا جواب دیا تھا۔

''شمع اندر کمرے میں ہے۔''

''خیر تو ہے کمرے کا دروازہ بھی بند ہے۔''

''جی ابو...... ناراض ہے مجھ سے۔'' سعد نے ٹھہر کر جواب دیا تھا۔

''اس کا ناراض ہونا بنتا بھی ہے، اتنی دیر جو لگا دی تُو نے آنے میں اور کوئی اطلاع بھی نہیں دی۔''

''نہیں ابو وہ دیر سے آنے پر ناراض نہیں ہے۔ وہ اصل میں...... اصل میں مَیں نے دوسری شادی کر لی ہے۔'' سعد کا لہجہ دھیما تھا۔

''دوسری شادی......'' اکبر نے بیٹے کو حیران نظروں سے دیکھا۔

''کیوں بیٹا؟ شمع سے خوش نہیں تُو، شمع تو تیری پسند تھی نا۔''

اکبر حیران تھا۔

''بس ابو......'' سعد چپ کر گیا۔ باپ کو شادی کی وجہ بتانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

''پھر بھی تُو نے اچھا نہیں کیا، اوروں کی بیٹی سے زیادتی کی ہمارے خاندان میں کبھی کسی مرد نے دو شادیاں نہیں کی، تجھے کیوں ضرورت پیش آئی...... بیٹا بھی تو ہو چکا تھا پھر؟'' اکبر نے ملال بھری نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ اسے واقعی دکھ ہوا تھا۔ خدمت گزار شمع اسے پسند تھی۔

''شادی کی وجہ بتائے گا؟'' اکبر کے لہجے میں افسوس تھا۔

سعد چپ بیٹھا رہا۔ اکبر نے کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کیا۔ جب سعد نہ بولا تو اکبر کو تاؤ تو آیا، لیکن جوان بیٹے پر غصہ کرنا کچھ ٹھیک نہیں لگا۔

''کون ہے؟ اور کہاں ہے؟''

''کراچی کی ہے ابو اور باہر گاڑی میں بیٹھی ہے۔'' سعد کا سر جھکا ہوا تھا۔

''باہر......اچھاوہ جوٹیکسی میں فیشنی عورت بیٹھی ہے وہ، وہ تو رئیس زادی لگتی ہے۔'' اکبر نے حیران نظروں سے بیٹے سے تصدیق چاہی تھی۔

''جی وہی۔'' سعد کا سر جھکا ہوا تھا۔

''اب؟''

''پہلے تو دوسری کو گھر لے آ، ویسے تو تجھے ایسا کرنا نہیں چاہئے تھا اب کر لیا ہے تو ذمہ داری نبھا، باہر گلی میں بیٹھے رہنا مناسب نہیں۔ جا لے آ اسے۔'' اکبر کی بات سن کر سعد میکانکی انداز میں اٹھا اور باہر چلا گیا۔

''نیک بخت حرکتیں دیکھ لیں اپنے بیٹے کی...... بیٹی والے ہو کر ہم نے دوسروں کی بیٹی سے زیادتی کر لی۔ میں اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔'' اکبر نے اٹھنے سے پہلے شاداں کو یاد کیا۔ اکبر ہمت کر کے اٹھا اور شمع کے کمرے میں جا کر آواز دی۔

''شمع بیٹی باہر آ۔ بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔ اپنے سسر کو آج بھوکا رکھے گی۔'' اکبر نے آج سے پہلے شمع کو اس طرح آواز نہیں دی تھی اور نہ ہی کبھی اپنی ضرورت کے لیے کہا تھا۔ شاداں کے ہوتے ہوئے وہ شاداں کو اور بیٹوں کو کہتا اور شاداں کے بعد صرف بیٹوں کو ہی اپنی ضرورت کے لیے بلاتا۔

آنسو بہاتی شمع نے آنسو صاف کیے اور اپنے ہاتھوں میں مچلتے فیصل کو سنبھالا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

کنڈی کھول کر وہ باہر آئی۔

اکبر نے شمع کی آنکھوں میں آنسوؤں کا تلاطم دیکھا تو اس کے ملال میں اضافہ ہو گیا۔

''چل بیٹی صبر کر۔'' اکبر نے شمع کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس سے زیادہ اکبر کے بس میں نہیں تھا۔

''میں روٹیاں ڈال آتی ہوں۔'' شمع تھوڑا آگے بڑھی۔ دکھ جتنا بڑا ہی سہی لیکن اسے اپنی ذمہ داری کا احساس بھی تھا۔ آخر ایک غریب گھرانے کی مشرقی لڑکی جو ٹھہری۔

''نہیں بیٹا، بھوک ہی مر گئی۔ تُو آ میرے ساتھ بیٹھ۔'' اکبر برآمدے میں پڑی چارپائیوں کی طرف بڑھا۔ جن میں ایک مزمل اور صوفیہ بیٹھے تھے ان کے سامنے چھابی پر تھوڑی سی روٹی پر ساگ پڑا ہوا تھا۔ شمع نے ابھی دو قدم ہی بڑھائے تھے لیکن صوفیہ اور مزمل کو دیکھ کر رہ گئی اسے خیال آیا کہ کم از کم اپنے چھوٹے دیور اور نند کا تو احساس کرے۔ اس نے ان کے لیے روٹیاں پکانے کا ارادہ کیا۔

''ابو آپ تھوڑی دیر فیصل کو پکڑ لیں، میں روٹی پکا لاتی ہوں۔'' شمع نے فیصل اکبر کی گود میں دیا۔

''لیکن بیٹا......'' اکبر کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن شمع کچھ سننے کے لیے رکی نہیں۔

''سعد کہاں ہے؟ چلا تو نہیں گیا؟'' یہ سوچتے ہوئے کچن کی طرف بڑھی۔

ادھر اس نے پہلی روٹی توے پر ڈالی اور ادھر سعد، سونیا کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ سونیا کو اس غریب گھر میں بو سی محسوس ہوتی تھی پہلی بار آنے پر بھی اس نے یہ عجیب بو برداشت کی تھی اور آج بھی برداشت کر رہی تھی۔

شمع نے کچن سے ہی دونوں کو دیکھا تو ایک ٹیس سی دل میں اٹھی۔

تازہ روٹیوں کے لیے اب اس کا صوفیہ یا مزمل کو بلانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اکبر نے قدرے ناپسندیدگی سے سونیا کو دیکھا۔

''یہ تو تجھ سے دس بارہ سال بڑی دِکھتی ہے۔'' اکبر کی آواز میں ناپسندیدگی شامل تھی۔

اکبر کی بات سن کر سونیا مسکرا دی۔ بلاشبہ وہ سعد سے دس بارہ سال بڑی تھی اور ان میں عمروں کا فرق بھی واضح ہوتا تھا لیکن سونیا بڑی نہیں لگتی تھی بلکہ سعد چھوٹا محسوس ہوتا تھا۔

''تو پھر کیا ہوا ابو اسلام میں ایسی شادیوں کی مثالیں موجود ہیں۔'' سعد بولا۔

اکبر نے ایک نظر بیٹے کو دیکھا۔ ملال بھری نظروں سے، اسے لگا کہ سعد واقعی تبدیل ہو چکا ہے۔

سعد نے سونیا کو بیٹھنے کا کہا۔

''بھرجائی سے جا کر کہو سعد مہمان کو لے آیا ہے، روٹیاں زیادہ بنا لے۔'' اکبر نے سرد لہجے میں مزمل سے کہا۔ مزمل اٹھنے لگا تو سعد بول پڑا۔

''ابو رہنے دیں۔ ہم سب باہر سے کھانا کھا لیتے ہیں۔ گاڑی پہ چلتے ہیں کسی ہوٹل۔''

باہر سے ابھی وہ اور سونیا طے کر کے آئے تھے کہ آج سب مل کر کہیں کھانا کھا لیتے ہیں اور پھر کچھ دنوں تک سب کو کراچی لے جائیں گے۔ تا کہ اس دوران سب ذہنی طور پر خود کو کراچی جانے کے لیے قائل کر لیں۔

اکبر نے بیٹے کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔

''ہمارے ہاں عورتوں کی کمائی کسی نے نہیں کھائی۔'' اکبر نے بیٹے کو قہر بھری نظروں سے دیکھ کر جواب دیا۔

سعد مزید کچھ نہ بول سکا لیکن سونیا بول اٹھی۔

"ابو پلیز چلیں، میں آپ کی بہو ہوں کوئی غیر نہیں۔ اس طرح مجھ سے بددل نہ ہوں اور جہاں تک عورت کی کمائی کا تعلق ہے تو یہ کاروبار جو میرے پاس ہے میرے والد کا ہے جسے میں نے اپنے والد کے بعد مجبوراً سنبھالا ہے اس طرح سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔" جیسے سونیا ہر گُر جانتی تھی۔

اس نے اتنے ادب اور مٹھاس سے کہا کہ اکبر مزید کچھ نہ بول سکا۔

"میں شمع کو کہہ کر آتا ہوں۔" سعد کھڑا ہوا تو سونیا بھی ساتھ کھڑی ہوگئی۔

"میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔" سونیا نے کہا۔

"جب تک مجھ سے بات نہیں کرے گی تو بغض کیسے ختم کرے گی۔" سونیا کا جواز سعد کو معقول لگا تھا۔

شمع نے نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا اور پھر سے پیڑہ گول کرنے لگی تھی۔ سعد کے لیے یہ لمحہ بہت کٹھن تھا۔

"شمع سونیا سے تو پہلے مل چکی ہونا۔" سعد کو سمجھ نہیں آیا کہ کیا کہے۔ شمع کے انداز کچھ اس قدر کٹھور پن لیے ہوئے تھے کہ سعد مزید کچھ نہ بول سکا اور شمع نے روٹی بڑھا کر توے پر ڈال دی۔

"آؤ شمع ہم سب لوگ باہر کھانا کھانے جارہے ہیں، تم بھی اب روٹیاں پکانا چھوڑو، باہر کھالیں گے کھانا، مجھے دوست سمجھو۔" سونیا بے تکلفی سے شمع کے پاس پڑی چوکی پر بیٹھی تھی۔

"کتنی اچھی ہے سونیا۔" یہ سعد کی سوچ تھی۔

شمع نے نظر اٹھا کر سونیا کو دیکھا تو سونیا کی مسکراہٹ اسے زہر لگی۔

"میں نے کہیں نہیں جانا، آپ جہاں جارہے ہیں شوق سے جائیے۔" شمع نے لہجہ ہموار رکھنے کی کوشش کی تھی۔

"شمع کچھ نہیں ہوتا، چلی چلو۔" سونیا ہنوز مسکرا رہی تھی۔

"جب میں نے کہا کہ میں نے نہیں جانا تو نہیں جانا۔" شمع سے ممکن نہیں تھا کہ آرام سے جواب دیتی۔ سو بھڑک اٹھی اور سونیا بھی یہی چاہتی تھی۔

"چلو جیسے تمہاری مرضی ہم تمہارے لیے کھانا پیک کروالیں گے۔" سونیا اٹھ کھڑی ہوئی۔

شمع نے روٹی اتاری اور دوسرا پیڑا بنانے لگی۔

"لیکن......" سعد بولنا چاہتا تھا کہ سونیا نے اسے انگلی کے اشارے سے چپ رہنے کو کہا۔

"ابھی شمع غصے میں ہے۔ ابھی اسے اکیلا رہنے دو۔ اللہ چاہے گا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔" سونیا نے جان بوجھ کر سرگوشی اتنی بلند کی تھی کہ شمع بھی سُن لے۔ سعد شش و پنج میں مبتلا، کچن سے باہر جانے لگا۔

"شمع چلو روٹیاں مت پکاؤ۔" باہر جاتے ہوئے سعد نے کہا تھا۔

شمع نے جلتی ہوئی لکڑیوں پر بڑی تیزی سے پانی کے چھینٹے مارے۔ لکڑیوں میں لگی آگ تو بجھ گئی لیکن اس کے تن من میں مزید آگ بھڑک اٹھی۔

سعد کے کہنے پر اکبر نے کپڑے تبدیل کرلیے۔ مزمل اور صوفیہ نے خود ہی کپڑے بدل لیے۔

اکبر نے شمع کے نہ جانے پر اعتراض تو کیا لیکن سونیا کی دلیل اور سعد کے سر ہلانے پر قائل نہ ہونے کے باوجود چپ کرگیا۔

پھر شمع اکیلی بیٹھی رہ گئی اور سونیا سب کو لے اُڑی۔ اچھے اور بڑے ہوٹل میں کھانا کھلانے۔

شمع نے آنسو بہائے، فیصل رویا، اسے بھی چپ نہ کرایا وہ ہی خود چپ کرگیا۔ اپنے آنسو بھی خود شمع نے بیٹھ کر صاف کیے تھے۔ دل کیا ماں کے پاس چلی جائے لیکن ہمت نہ ہوئی۔ اتنے میں شعیب آگیا۔ وہ اپنا کھانا خود کچن سے لے آیا۔ بہت سی روٹیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ بھی بغیر ڈھکی ہوئیں۔

شعیب نے پوچھا تو شمع نے کوئی جواب نہ دیا، چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شعیب حیران تو ہوا لیکن چپ کرگیا۔ اس کی بھابی سے بے تکلفی نہیں تھی سب کھانا کھا آئے خوش خوش۔ کھانا بہت زیادہ اور بہت مزیدار تھا۔ میٹھے میں بھی بہت سی عجیب عجیب لیکن اچھی اچھی ذائقہ دار چیزیں تھیں۔ شمع اور شعیب کے لیے بھی کھانا پیک کروالائے تھے۔

"سعد بھائی نہیں آئے۔ نئی بھابی اکیلی ہوٹل میں تو نہیں رہ سکتی نا۔" مزمل نے جیسے بھابی کا سوال بھانپ کر جواب دیا۔

"اس گھر میں بھی تو ٹھہرا جاسکتا تھا۔ یہاں تو اکیلا پن نہ ہوتا۔" شمع صرف سوچ سکتی تھی۔

"سعد آپ بہت بُرے ہیں۔" پھر سے آنسوؤں کا سیلاب رواں ہوگیا۔

شمع نے نہ دوپہر میں کھانا کھایا، اور نہ رات میں۔ اکبر اور شعیب نے اصرار تو کیا لیکن شمع نے پھر بھی نہ کھایا۔

رات کے وقت بھی باقی گھر والوں نے ہوٹل سے ساتھ لے کر آنے والا کھانا کھایا۔

سونیا نے بہت سارا کھانا پیک کروا دیا تھا۔

''کاش میں آج ورکشاپ سے جلدی آ جاتا تو میں بھی اچھے سے ہوٹل میں جا کر کھانا کھا لیتا۔'' شعیب نے آہ بھر کر سوچا۔

''چلو اب تو سعد نے دوسری شادی کر لی ہے۔ مذہب میں بھی دوسری شادی کو برا نہیں سمجھا گیا، نئی بہو بھی کافی اچھی ہے۔ ویسے کھانا تو بہت مزیدار تھا اور گاڑی میں آگے والی سیٹ پر بیٹھ کر سفر کرنا کتنا اچھا لگتا ہے۔'' رات کو اکبر بھی یہی سوچتا ہوا سو گیا۔

اور شمع کا محنت سے پکایا ہوا ساگ یوں ہی پڑا رہ گیا۔

❁❁❁

سونیا اور سعد نے کہا تو تھا کہ سامان لے کر جانے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن پھر بھی اکبر اور شعیب نے دو بڑی بڑی گٹھریاں بنالی تھیں۔

شمع نے اپنا اور فیصل کا سامان پیک کر لیا تھا۔ کراچی جانے کے لیے نہیں بلکہ عبدالرحمٰن اور زبیدہ کے پاس جانے کے لیے۔

''شمع میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' سعد کا لہجہ منت بھرا تھا۔

''میں مانتی ہوں۔'' شمع کا انداز مصروف سا تھا۔

''تو پھر کراچی کیوں نہیں چلتی ہمارے ساتھ۔ ضد ہے تمہاری۔'' سعد جھلایا تھا۔

''ضد ہی سمجھ لیں۔'' شمع کا جواب سن کر سعد کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔

باہر دروازے سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی سونیا سب سن رہی تھی۔ وہ اندر آئی اور شمع کے ساتھ نرمی سے بات کرنے لگی۔

''شمع تم مجھے سوتن نہ سمجھو، ہم دونوں بہنوں کی طرح رہ سکتی ہیں۔'' سونیا کے لہجے میں مٹھاس تھی۔

''مجھے بہن کی ضرورت نہیں ہے۔'' شمع نے تلخی سے کہا اور ایک سوٹ تہہ کر کے باقی سوٹوں کے ساتھ رکھا۔

''شمع، جذباتی ہو کر فیصلہ مت کرو۔ وہاں ہمارا گھر بہت بڑا ہے۔ عیش سے مل کر رہیں گے۔'' سونیا کا لہجہ پہلے کی طرح نرم تھا۔

''فیصلہ کرنے کے لیے مجھے آپ کے مشورے کی ضرورت نہیں ہے، آپ میرے کمرے سے جا سکتی ہیں۔'' شمع نے درشت لہجہ میں کہا۔

سونیا نے ایک مجبوری نظر شمع پر ڈالی اور ایک نظر سعد کو دیکھا اور باہر جانے لگی۔ سعد کے قریب رک کر دھیمی آواز میں بولی۔

''شمع کو کچھ دن میکے میں رہنے دو۔ وہ غصے میں ہے۔ کنڈیشن ہی کچھ ایسی ہے۔ میں اگر شمع کی جگہ ہوتی تو میں بھی ایسا ہی ردعمل دکھاتی۔''

سعد نے سر ہلا دیا۔

سونیا کمرے سے جاتے ہوئے مسکرا دی۔ سب کچھ ویسے ہو رہا تھا جیسے وہ چاہتی تھی۔

''شمع تمہیں کیا ہو گیا ہے، مہمانوں سے ایسے بات کرتے ہیں تم نے اسے کمرے سے باہر جانے کو کہہ دیا۔ مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔''

''مجھے بھی آپ سے یہ امید نہ تھی۔'' شمع نے تڑخ کر جواب دیا۔

سعد کو بہت برا لگا۔

''ایسا کیا کر دیا ہے جو تمہیں امید نہیں تھی۔ دوسری شادی کرنا کیا گناہ ہے۔'' سعد کی آواز اونچی ہو گئی۔

''گناہ......'' شمع نے استہزائیہ انداز میں دہرایا۔

''یہ بات کرنے کا انداز ہے، سینہ زوری کہتے ہیں اسے، بات تو ایسے کرتے ہیں کہ بس، اعتماد اور اعتبار کا خون کیا ہے آپ نے۔'' شمع بے ربط انداز میں بولتی چلی گئی۔

''میں مانتا ہوں کہ میں نے یہ سب کچھ کیا ہے لیکن اس کے لیے کتنی بار معافی مانگوں'' سعد کا لہجہ کرخت تھا۔

''معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے، میں جا رہی ہوں اپنے گھر۔'' شمع نے سامان اٹھایا۔

''شمع تم کہیں نہیں جاؤ گی۔''

''میں جا رہی ہوں۔''

''میں نے کہا تم اپنے میکے نہیں جاؤ گی۔'' سعد نے شمع کا بازو پکڑا۔

''بازو چھوڑ دیں میرا۔'' شمع نے مزاحمت کی۔

''میں جا رہی ہوں، آپ کون ہیں روکنے والے؟'' شمع نے بازو چھڑوایا۔

سعد کا مضبوط ہاتھ اٹھا اور شمع کے چہرے پر نشان چھوڑتا چلا گیا۔

تھپڑ کھانے کے بعد شمع نے سعد کو بے یقین نظروں سے دیکھا۔ کیا یہ وہی سعد تھا جو شمع سے بے حساب محبت کرتا تھا؟

❁ ❁ ❁

سعد سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مسہری پر ٹانگیں لٹکائے ہوئے اور سونیا کرسی کھینچ کر سعد کے قریب بیٹھ گئی۔

''تمہیں کیا ہو گیا تھا سعد، تم نے اسے مارا کیوں؟'' سونیا کے ماتھے پر بل تھے۔

''بس، پتا نہیں۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔'' سعد نے سر جھکایا ہوا تھا۔ اس کی آواز میں بھی کافی شرمندگی تھی۔

''آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ شمع کا رویہ جارحانہ تھا تو یہ اس کا حق بنتا ہے، میں اس کی جگہ ہوتی یا تم اس کی جگہ ہوتے تب میں اور تم بھی ایسا ہی کرتے۔'' سونیا نے کہا۔

کچھ لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ اس سے پہلے کہ سونیا مزید کچھ کہتی، سعد بول پڑا۔ سر جھکائے ہوئے مدہم آواز میں۔

''میں اس سے بے حد محبت کرتا ہوں، پتا نہیں میں نے ایسا کیوں کر دیا؟'' سونیا کے منہ کا زاویہ بگڑ گیا لیکن فوراً ہی اس نے اپنے چہرے کے تاثرات ٹھیک کر لیے۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' یہ کہنے میں سونیا کو دقت کا سامنا ہوا تھا۔

''اب تم کیا کرو گے، شمع تو ناراض ہو کر چلی گئی۔''

''سونیا، پتا ہے کیا؟ مجھے لگنے لگا ہے کہ میں نے شمع کا بالکل خیال نہیں کیا۔ کبھی اس کی کوئی بات نہیں مانی۔ میرا مطلب ہے میری اور شمع کی شادی کو دو سال ہو چکے ہیں اور ان دو سالوں میں، میں نے شمع کی کوئی بات نہیں مانی۔ اس کے باوجود میں نے زندگی میں کبھی اس سے زیادہ کسی سے بھی اتنا پیار نہیں کیا۔ اب اگر وہ کراچی نہیں جانا چاہتی تو مجھے بھی ضد نہیں کرنی چاہئے۔ خواہ مخواہ کی ضد۔''

سعد کی بات سن کر سونیا کا دماغ گھوم گیا تھا۔ سو جلدی جلدی بولی۔

''وہ تو ٹھیک ہے سعد، تم نے شمع کی کوئی بات نہیں مانی تو آئندہ مان لینا، لیکن سعد کراچی نہ جانا تو سراسر بے وقوفی ہے۔ تم خود سب دیکھ کر آئے ہو، آسائشات کے بنا زندگی گزارنا بے حد مشکل ہے اور پھر تم نے خود بھی بتایا کہ شمع اس چیز کی خواہش بھی کیا کرتی تھی۔ اب اگر وہ انکار کر رہی ہے تو میرے خیال میں اسے قائل کرنا چاہئے، نہ کہ اس کے انکار کو قبول کر لینا چاہئے۔''

''تو پھر قائل کس طرح کیا جائے؟'' سعد کا لہجہ عجیب تھا۔

''یہاں منہ لٹکا کر بیٹھے رہنے سے قائل تو نہیں کیا جا سکتا نا، تم جاؤ اسے مناؤ اور پھر لے آؤ۔ یہی حل ہے۔''

''کس منہ سے جاؤں؟'' سعد کے لہجے میں بے چارگی اور بیزاری دونوں موجود تھیں۔

سونیا نے ایک نظر بغور سعد کو دیکھا اور مکمل سوجھ بوجھ سے بولی تھی۔

''دیکھو سعد، تم پہلے تو خود کو یہ بات اچھی طرح سمجھا لو کہ آپ نے اسے قائل کر کے ہی آنا ہے اور کراچی لے کر جانا ہے۔ اگر شمع نہیں مانتی تو نہ ماننے کی وجہ پوچھیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا۔''

سعد خاموش رہا۔

''ایک اور بار کوشش تو کر کے دیکھو۔''

کچھ دیر سعد یوں ہی خالی ذہن بیٹھا رہا۔ اس سے فیصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔

''اچھا چلو ٹھیک ہے۔'' سعد نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا تھا۔

❁ ❁ ❁

دونوں ٹیکسیاں روانہ ہوئی تھیں وہ ایئر پورٹ کی طرف جا رہی تھیں۔ پچھلی ٹیکسی میں موجود لوگ، ماسوائے ڈرائیور کے، بے حد پُر جوش تھے۔ مزمل اور صوفیہ پیچھے بیٹھے ہوئے تھے جب کہ اکبر آگے بیٹھا ہوا تھا۔

اکبر کے دل میں کہیں کہیں تھوڑا سا ملال تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ ان سے زیادتی سرزد ہو رہی ہے لیکن اس ملال پر جوش حاوی تھا۔ دوسرا سونیا کی بات نے اسے اب قائل بھی کر لیا تھا۔ سو اسے بھی یہی بہتر لگا کہ وہ کچھ دن ٹھہر کر شمع کو لے جائیں گے۔

''ابو آپ دیکھیں نا، شمع سمجھدار ہے اور ابھی غصے میں بھی ہے [illegible] سے سعد نے تھپڑ مار کر کام خراب کر دیا ہے۔ اب اگر شمع نہیں جانا چاہ رہی تو ہمیں زیادہ [illegible] نہیں کرنا چاہئے۔ شمع اگر کچھ دن یہاں رہ لے گی تو ہلکی پھلکی ہو جائے گی۔ آخر اپنے ماں باپ کے ساتھ رہے گی نا اس کا غصہ فطری ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے کہ اگر سعد کچھ دن شمع سے دور رہے تو بہتر ہے۔ شمع کوئی تیکھی ترش بات کر لیتی ہے اور سعد سے وہ برداشت نہ ہو تو پھر [illegible] یہ سب میں سوتن ہونے کے ناطے نہیں کہہ رہی، میں تو بہتری چاہتی ہوں باقی آپ سب کی مرضی۔''

سونیا کی بات سن کر کوئی کچھ نہ بولا۔ جیسے بولنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔

"ہم کراچی جہاز پر جا رہے ہیں یا نہیں؟" چند لمحوں بعد مزمل نے پوچھا تھا۔

شعیب بھی یہی پوچھنا چاہ رہا تھا اور صوفیہ بھی جلد از جلد جہاز کا سفر کرنا چاہتی تھی۔

"تم لوگوں کی مرضی، بلکہ ابو بہتر فیصلہ کریں گے۔" سونیا نے مزمل کو جواب دیا تھا۔

مزمل اور شعیب کی نگاہیں بیک وقت سونیا سے اکبر پر منتقل ہوئی تھیں۔

"تو ہم لوگ بھی کچھ دن بعد شمع کے ساتھ کراچی آ جائیں گے۔" اکبر کا لہجہ لچک لیے ہوئے تھا اور یہ لچک ہی تھی جس نے شعیب کو بولنے کی ہمت دی تھی، ورنہ آج سے پہلے اس نے کبھی بھی اپنے باپ کو کسی بھی قسم کی کوئی تجویز نہیں دی تھی۔

"ابو، اب شمع بھرجائی ناراض ہے، ہمارے گھر تھوڑی وہ رہے گی۔ وہ تو اپنے میکے رہے گی تو پھر ہمارے رہنے کا فائدہ، میں تو کہتا ہوں کہ ہم آج ہی چلے چلتے ہیں۔"

"ہاں ابو۔" مزمل نے بھی شعیب کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ اور اکبر نے کچھ لمحوں بعد مطمئن نہ ہونے کے باوجود سر ہلا دیا۔ مگر سعد چپ رہا تھا۔ اس کے ذہن پر شمع کی گفتگو ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ وہ اسے منانے کے لیے سسرال گیا تھا۔

"سعد میرا سر پہلے ہی بہت دُکھ رہا ہے۔ براہِ مہربانی آپ یہاں سے دفع ہو جائیں۔" شمع نے بیزاری سے لیٹے لیٹے کہا تھا اور اپنے دوپٹے کو پیروں سے لے کر چہرے تک کھینچ کر ڈھانپ لیا تھا۔

"دفع ہو جائیں۔" شمع کے الفاظ سعد کے کانوں میں ایک بار پھر گونجے تھے۔ سعد نے حیرانی سے شمع کو دیکھا جو سر سے لے کر پیروں تک دوپٹہ اوڑھے ایسے پڑی تھی جیسے سعد سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔

سعد کا دل تو چاہا کہ دوپٹہ کھینچ کر ایک اور تھپڑ شمع کو جڑ دے لیکن اس نے کچھ نہ کیا۔ غصے سے وہاں سے چلا آیا۔

"ہم ایک دو دن ٹھہرتے ہیں، میں شمع کو منانے کی کوشش کرتا ہوں۔" سعد نے کہا تھا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اس رات سونیا، سعد کے ساتھ شمع کی جہیز والی مسہری پر سوئی ہوئی تھی۔ اس بے آرام مسہری پر وہ تمام رات بے چین ہوتی رہی تھی۔

اگلے دن سعد کی شمع سے ملاقات بے کار گئی تھی۔ زبیدہ کو بھی سب پتا چل گیا تھا اس نے سعد کو ملال بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ البتہ عبدالرحمان کچھ نہیں بولے تھے۔ سر جھکائے بیٹھے رہے تھے۔

اکبر نے بھی ملاقات کی تھی۔ اپنے سمدھیوں سے، بے کار کی ملاقات۔ جس میں زبیدہ نے چند ایک شکوے کیے تھے اور روئی بھی تھی لیکن اکبر اسے نہیں سمجھا سکتا تھا کہ سعد کی دوسری شادی نے شمع کی زندگی بنائی ہے۔ بگاڑی نہیں ہے۔ اکبر نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ بھی کراچی جا رہا ہے۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے اس نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ بیٹی والے ہیں، انہیں کیا سمجھ آئے گی۔ شمع جب تک خود دو چار دن عیش نہیں کر لیتی، کچھ بھی کہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

اور پھر آج کے دن وہ سب ٹیکسیوں میں سوار ہو کر ائیر پورٹ جا رہے تھے۔ شعیب اگلی ٹیکسی میں فرنٹ سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا اور پچھلی سیٹ پر خاموش سا سعد سونیا کے ساتھ بیٹھا تھا۔

"پریشان مت ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ دنوں تک ہم شمع کو لے جائیں گے۔" ابھی سونیا کا جملہ بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ٹیکسی نے بریک لگائی تھی۔ ائیر پورٹ آ گیا تھا۔ ڈرائیور نے پچھلی ٹیکسی میں موجود بریف کیس اتارے، جب اکبر کسی طور پر اپنے "قیمتی" سامان کو چھوڑ کر کراچی جانے کے لیے راضی نہ ہوا تو سونیا نے کہا کہ چلو پھر آپ شعیب کو بھیج دیں۔ وہ بریف کیس لے آئے۔ اب بھلا جہاز میں گٹھڑیاں لے کر جانا مناسب تو نہیں لگتا تھا۔

❀❀❀

اس بنگلے میں آ کر سب خوش تھے۔ اوپر والے پورشن میں موجود کمرے ان کے لیے مختص کر دیے۔ اکبر، شعیب، مزمل اور صوفیہ سب کے لیے علیحدہ علیحدہ کمرہ تھا، صوفیہ چھوٹی تھی۔ ایک کل وقتی ملازمہ اس کی نگہداشت کے لیے آ گئی جو رات کو صوفیہ کے ہی کمرے میں سوتی تھی۔ شعیب کو ایک فیکٹری میں کام دے دیا گیا۔ جہاں کام کم اور آرام زیادہ کرنا پڑتا تھا۔ مزمل کو پڑھائی میں کافی دلچسپی تھی سو سعد کے ساتھ مشورہ کر کے سونیا اسے کسی اچھے سے بورڈنگ سکول بھیجنے کا سوچ رہی تھی۔ اکبر بھی کام کرنا چاہتا تھا لیکن سونیا نے اسے احساس دلایا کہ اب وہ اس عمر میں کیا کام کریں گے۔ سو وہ لذیذ کھانا کھاتا، ڈش پر مختلف چینلز پر ڈرامے اور فلمیں دیکھتا۔ دیگر زبانوں کے پروگرام وغیرہ اسے سمجھ تو نہیں آتے تھے لیکن وہ پھر بھی اسے کافی دلچسپ محسوس ہوتے تھے۔

"شاداں تجھے جانے کی جلدی تھی۔ اگر آج زندہ ہوتی تو دیکھتی کہ تیرا بیٹا کس قدر قابل ہے۔" کبھی کبھار اکبر کو شاداں بھی یاد آتی۔ ویسے اسے ان آسائشوں میں پتا نہیں کہاں سے

سعد کی قابلیت جھلکتی تھی۔

صوفیہ بھی اب کم کم ماں کو یاد کرتی تھی اور رہ گئی شمع تو وہ باقی سب کو تھوڑی بہت اور سعد کو اچھی خاصی یاد تھی۔ سعد خاموش رہتا تھا۔ تھوڑا اداس بھی رہتا تھا لیکن ہر ذہنی و جسمانی آسائش سے لطف اندوز ہونا، کھانا ڈٹ کر کھانا، جم خانے جاتا، سعد کا سپیشل انسٹرکٹر سعد سے اور سعد انسٹرکٹر سے کافی خوش تھے اور پُرکشش ہوتا جسم سعد کو اچھا لگتا تھا۔ ایک روز اس نے سونیا سے شمع کے بارے میں پوچھا تھا۔

”ہم شمع کو لینے کب جائیں گے؟“ ایسے پوچھا تھا جیسے ساری زندگی سونیا ہی اس کی زندگی کے فیصلے کرتی آئی ہو۔

”جب آپ کو بہتر لگے اور جہاں تک میرا خیال ہے ہفتے بھر تک چلتے ہیں۔“

اکبر نے سعد سے شمع کی بابت پوچھا تھا۔ سعد نے بتایا کہ ہفتے تک لینے جائیں گے اور اکبر بھی قدرے مطمئن ہو گیا۔ سعد کو شمع یاد آتی تھی لیکن اس کی طلب میں شدت نہیں رہی تھی۔ زندگی میں ایسی بڑی بڑی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں لیکن بندے کو پتا بھی نہیں چلتا۔

❁❁❁

اکبر، سعد اور سونیا تینوں شمع کو لینے آئے تھے۔ ملتان کی تنگ گلی کے چار مرلے کے چھوٹے سے گھر میں۔

عبدالرحمٰن گھر پر نہیں تھے، اکبر تھوڑی دیر بیٹھا رہا اور پھر محلے میں اپنے جان پہچان والے دوستوں کو ملنے چلا گیا۔ مالک دکان کو چابی بھی واپس کرنی تھی۔ دکان میں پڑے معمولی سے سامان سے اسے کوئی رغبت نہیں تھی۔

سعد اور شمع ایک کمرے میں تھے اور زبیدہ، سونیا کے ساتھ دوسرے کمرے میں تھی۔ اس گھر میں بھی سونیا کو ویسی ہی غربت محسوس ہوئی تھی جیسے سعد کے گھر تھی۔ سعد کا گھر بڑے صحن والا اور نیا بنا ہوا تھا جب کہ یہ گھر قدرے چھوٹا اور پرانا تھا اور دیواروں پر کی گئی سفیدی تو حد سے زیادہ پرانی تھی۔

سونیا کی شدید خواہش یہی تھی کہ شمع ساتھ ہرگز نہ جائے لیکن اگر شمع ساتھ چلی جاتی ہے تو سونیا نے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا ہے، اس کا ابھی سونیا کو بھی نہیں پتا تھا۔ شمع اس سے کسی صورت برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس کا اسے اچھی طرح اندازہ تھا۔

”طلاق“ جیسی حق تلفی وہ کرنا تو نہیں چاہتی تھی لیکن اسے دوسرا کوئی راستہ بھی نظر بھی آتا تھا۔ ویسے بھی یہ باتیں ابھی بہت آگے کی تھیں۔

سونیا کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھی زبیدہ بالکل چپ تھی۔ کل سے اس کے گھٹنوں میں کافی درد تھا۔ ویسے وہ سونیا سے بہت سخت باتیں کرنا چاہتی تھی۔ زبیدہ کے لئے شمع سے بارہ تیرہ سال بڑی اس کی سوتن ناپسندیدہ ہی تھی۔

زبیدہ جانتی تھی کہ جلی کٹی سنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیا پتا اس کا کیا نتیجہ نکلے، ناراضی اپنی جگہ لیکن زبیدہ چاہتی تھی کہ شمع ان لوگوں کے ساتھ چلی جائے۔ شوہر کا ساتھ ایک مضبوط ساتھ ہوتا ہے جو زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ سعد اور شمع کو علیحدگی مہیا کرنے سے پہلے زبیدہ نے شمع کو کہہ دیا تھا کہ اسے اب ان لوگوں کے ساتھ چلے جانا چاہیے جواباً شمع نے ماں کو شکایتی نظروں سے دیکھا تھا۔

فیصل سویا ہوا تھا۔ دوسرے کمرے میں زبیدہ جس چارپائی پر بیٹھی تھی، اس چارپائی کے ساتھ کپڑے سے بندھے ہوئے جھولے میں وہ لیٹا ہوا تھا۔

”ہمارے بچے کب ہوں گے؟“ سونیا نے سوچا اور ایک اچٹتی نگاہ فیصل پر ڈالی تھی۔

شمع کے علاوہ سعد سے ملحق یہ واحد رشتہ تھا جس سے سونیا کو الجھن ہوتی تھی۔

جیل کی سلاخوں جیسی سلاخوں والی کھڑکی بند تھی اور شمع اس کے ایک کواڑ کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اداس اداس سی شمع، نظریں زمین پر گاڑے ہوئے تھی اور سعد کچھ فاصلے پر چارپائی پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھا تھا۔ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا ہوا تھا اور خاموش سا تھا۔

سعد نے نظر اٹھا کر شمع کو دیکھا۔ حسبِ معمول بال چٹیا کی صورت میں گوندھے ہوئے تھے۔ مالٹے اور گلابی رنگ کی ڈائیوں والا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ مالٹا رنگ شمع کو پسند تھا اور گلابی رنگ سعد کا پسندیدہ رنگ تھا۔ شادی کے بعد سعد نے خصوصی طور پر شمع کے لیے یہ سوٹ بنوایا تھا۔ مالٹے اور گلابی رنگ کی ڈائیوں کو ملتے دیکھ کر سعد کو ایسے لگتا تھا جیسے وہ اور شمع ایک ہو رہے ہیں۔ سعد کے جذبات کو مدِنظر رکھتے ہوئے شمع کو بھی اپنا یہ سوٹ کافی پسند تھا۔

سعد نے شمع کی کلائیوں میں دیکھا جو چوڑیوں سے محروم تھیں۔ شہادت کی انگلی میں مور پنکھ سے مشابہہ ڈیزائن والی انگوٹھی بھی دور سے نظر آ رہی تھی۔ انگوٹھی کو دیکھ کر سعد کو تھوڑی تقویت ملی۔

”اچھا سوٹ پہنا ہوا ہے۔“ بات کہیں سے تو شروع کرنی تھی۔

شمع نے نظر اٹھا کر سعد کو دیکھا۔ سپاٹ سے چہرے پر سپاٹ سی آنکھیں، دوسرے ہی لمحے شمع کمرے سے باہر جانے لگی۔

"شمع کہاں جا رہی ہو؟" شمع دروازہ پار کر رہی تھی جب پیچھے سے سعد نے آواز لگائی تھی۔

"آ رہی ہوں۔" جاتے ہوئے مختصر سا جواب دیا اور سعد سوچنے لگ گیا کہ خیریت، اس طرح کیوں چلی گئی۔

شمع کی واپسی پانچ منٹ بعد ہوئی۔ پانچ منٹ کا انتظار سعد کو عجیب لگا تھا یا بُرا، سعد تعین نہیں کر سکا تھا۔ پانچ منٹ بعد جب شمع آئی تو اس نے لباس تبدیل کیا ہوا تھا۔ پلین نیلا سوٹ۔ سعد نے ایک طویل سانس لی تھی۔

"کپڑے تبدیل کرنے کا مقصد؟" سعد نے پوچھا تھا، سنجیدہ لہجے میں۔

"میرے خیال میں آپ سمجھ چکے ہوں گے۔" شمع کا لہجہ سعد سے بھی زیادہ سنجیدہ تھا۔

"میں پھر بھی تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔" شمع نے ایک نظر سعد کے چہرے پر ڈالی اور نگاہیں پھیر لیں۔

سعد کچھ دیر شمع کے جواب کا انتظار کرتا رہا جب جواب نہ آیا تو سعد پھر بولا۔

"کچھ پوچھا ہے میں نے۔"

"آپ کو اچھا لگ رہا تھا اس لیے اتار آئی ہوں۔" شمع تڑخ کر بولی۔ سعد کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ آ گئی۔

"یعنی اب مجھے جو چیز اچھی لگے گی تم اس سے دور ہو گی۔"

"ہاں۔"

شمع کی ہاں سن کر سعد نے لمحہ بھر سوچا کہ شمع کی انگلی میں موجود چاندی کی انگوٹھی کا تذکرہ کرے لیکن پھر چپ کر گیا۔ سامنے شمع تھی جس نے انگوٹھی بھی اتار دینی تھی اور بعید نہیں کہ اتار پھینکتی۔

"میں صلح کرنے آیا ہوں۔" کچھ پل کے بعد سعد نے صلح جُو انداز میں بات بدلی تھی۔

"میری آپ سے کوئی ناراضی نہیں، صلح ہی صلح ہے۔"

"صلح ایسی ہوتی ہے۔"

"ایسی بھی ہوتی ہے۔"

اب کے بار سعد چپ کر گیا۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ پھر سعد بولا تھا:

"میں نے تمہیں تھپڑ مارا تھا۔ اس کے لیے معافی مانگتا ہوں، مجھے بہت افسوس ہے بس غصے میں......"

"آپ میرے شوہر ہیں، آپ کا حق بنتا ہے مجھے تھپڑ مارنے پر کوئی گلہ نہیں لیکن اس کی وجہ پر گلہ ہے۔"

سعد کچھ نہ بولا۔ "بہر حال اس بات پر میرے دل میں میل نہیں۔" شمع نے جھوٹ بولا تھا جانے کیوں؟

ہر انسان بہت سے ایسے کام کرتا ہے جس کی وجہ سے معلوم نہیں ہوتی۔

"میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" کچھ توقف کے بعد سعد نے کہا تھا۔

"میں نے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔" شمع کا لہجہ دوٹوک تھا۔

"بیوی ہو، زبردستی بھی لے جا سکتا ہوں۔"

"بیوی ہوں، بے جان شے نہیں، مر جاؤں گی آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

شمع کے لہجے میں سختی پہلے سے زیادہ تھی۔

سعد حیران بھی ہوا تھا اور لاجواب بھی۔

"شمع وہاں......" سعد ابھی مزید کچھ بولنا چاہتا تھا کہ شمع نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں جانتی ہوں، وہاں آسائشات ہیں، سہولیات ہیں۔ ہر قسم کے عیش کا سامان ہے، نوکر چاکر ہیں اور گاڑی بنگلہ غرض ہر شے ہے۔ ہر وہ شے جس کی میں کبھی خواہش کیا کرتی تھی لیکن میں پھر بھی نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں؟" سعد بے ساختہ چارپائی سے کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھیں، کھڑے کیوں ہو گئے؟"

"تم بھی آؤ، میرے ساتھ بیٹھو۔"

"ہاں آتی ہوں، آپ بیٹھیں۔ چائے پئیں گے؟"

"تم خود اپنے ہاتھوں سے بناؤ گی؟" سعد نے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

"جی ہاں ہاتھوں سے ہی بناؤں گی، میرے باپ نے نوکرانیاں نہیں رکھی ہوئیں۔"

شمع کا لہجہ عام سا تھا لیکن سعد شرمندہ ہو گیا۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔"

"آپ بیٹھیں تو سہی، میں چائے بنا لاتی ہوں۔" شمع کمرے سے باہر گئی تو سعد بھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

دس منٹ بعد شمع چائے کے دو کپ لے کر آئی۔ ایک کپ سعد کو دیا اور دوسرا کپ خود لے کر سعد کے ساتھ بیٹھ گئی۔

سعد کو اطمینان ہوا تھا۔شمع کے رویے میں لچک محسوس ہو رہی تھی۔

''میڈم کو بھی چائے دے آئی ہوں۔'' شمع نے ایک گھونٹ بھرا اور مسکراتے ہوئے کہا تھا۔سعد نے کسی قسم کے کوئی تاثرات نہ دکھائے۔

چائے پیتے ہوئے سعد نے شمع کا ہاتھ پکڑ لیا۔

شمع نے کوئی مزاحمت نہیں دکھائی ہاں البتہ کچھ دیر بعد نرمی سے ہاتھ چھڑوا لیا۔

''کیسی تھی چائے؟'' چائے پی چکے اور کپ بھی سائیڈز پر رکھے جا چکے تو شمع نے پوچھا تھا۔

''بہت اچھی تھی۔''

''صرف بہت اچھی؟'' شمع مسکرائی تھی۔

''دنیا کی سب سے اچھی چائے۔'' سعد کی بات پر شمع کھلکھلا اٹھی۔

''شکر ہے۔'' سعد نے دل میں سوچا تھا۔ابھی کچھ دیر پہلے شمع کا مزاج کس قدر سخت تھا اور اب کس قدر خوشگوار۔

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ابھی سعد کچھ بولنا ہی چاہ رہا تھا کہ شمع نے نا محسوس انداز میں سعد کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

''قسم نبھانا ایک مشکل کام ہوتا ہے۔'' شمع خاموش ہو گئی۔

سعد نے ایک نظر شمع کے دونوں ہاتھوں میں موجود اپنے ہاتھ کو دیکھا تھا اور پھر شمع کے چہرے کی طرف دیکھا۔شمع کچھ خاص اور اہم بات کہنے والی تھی، سعد کو اندازہ ہوا تھا۔

''میں نے آپ کو بہت پہلے کہا تھا کہ اگر آپ کبھی قسم اٹھائیں تو اسے پورا کیجیے گا، توڑیے گا مت، یاد ہے نا؟''

''ہاں اچھی طرح یاد ہے۔'' سعد نے قدرے توقف سے کہا تھا۔

''تو بس پھر آج بھی ایک قسم اٹھانی ہے۔''

''کس قسم کی باتیں کر رہی ہو، شمع پہیلیاں مت بجھواؤ۔''

''میں جانتی ہوں کہ آپ مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں، ہیں نا!''

سعد کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔

''آپ کی امی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ شادی سے پہلے سوتے میں میرا نام لیا کرتے تھے۔''

کہتے ہوئے شمع مسکرائی تھی۔

''جاگتے میں بھی لیا کرتا تھا۔'' سعد بھی مسکرایا تھا۔

شمع کے ہونٹ سکڑے تھے۔

''میں نے آپ سے کبھی کوئی باقاعدہ فرمائش نہیں کی، ایسے ہی ہے ناں۔''

''ہاں ایسے ہی ہے۔'' چند لمحے سوچ چکنے کے بعد سعد نے جواب دیا تھا۔

''تو آج آپ سے ایک فرمائش کرنی ہے۔'' شمع ہنسی تھی۔عجیب ہنسی تھی۔

''ضرور کرو۔'' سعد کا دل دھڑکا۔

''قسم اٹھانے کی فرمائش۔''

''یہ کیسی فرمائش ہے؟؟''

''آپ کو میرا واسطہ اور میری محبت کا واسطہ اس محبت کا واسطہ جو آپ نے مجھ سے اب تک بے حساب کی ہے کہ آپ میری فرمائش ضرور پوری کریں گے اور میں جو قسم کھانے کا کہہ رہی ہوں، ضرور اٹھائیں گے۔''

سعد شمع کو دیکھ کر رہ گیا۔

''شمع لیکن......''

''شش۔'' ہونٹوں پر انگلی رکھ کے شمع نے سعد کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا تو سعد خاموش ہو گیا۔

''آپ کو میرا واسطہ اور میری محبت کا واسطہ، آپ قسم اٹھا رہے ہیں ناں۔''

سعد نے شکوہ بھری نظروں سے شمع کو دیکھا۔شمع فرمائش کر رہی تھی، واسطے دے رہی تھی۔اپنے واسطے اور محبت کے واسطے۔

سعد کا سر اثبات میں ہلتا چلا گیا۔حالانکہ وہ انکار کرنا چاہتا تھا لیکن انکار کی آپشن تو جیسے تھی ہی نہیں۔

''چلو میں الفاظ دہراتی ہوں، آپ ساتھ ساتھ دہراتے جائیں، ٹھیک ہے ناں۔'' شمع نے اپنے دونوں ہاتھوں میں موجود سعد کو مضبوط ہاتھ دبایا تھا۔نہ جانے وہ کون سی بازی کھیلنے والی تھی۔

''رکنا نہیں ہے۔''

''چلو تیار ہیں ناں۔'' شمع نے سعد کے ہاتھ پر ایک بار پھر دباؤ ڈالا۔

''میں قسم کھاتا ہوں۔'' شمع نے کہا تھا۔

''میں قسم کھاتا ہوں۔'' سعد نے مدھم آواز میں دہرایا تھا۔

کچھ لمحوں کا توقف ہوا تھا۔

''میں قسم کھاتا ہوں کہ میں آئندہ کبھی شمع سے ملنے یا اسے لے جانے کے لیے نہیں آؤں گا، یہاں تک کہ شمع مجھے خود بلائے گی۔''

سعد نے بے یقین نگاہوں سے شمع کو دیکھا تھا۔ ہاتھ کھینچنے کے لیے تردد کیا لیکن شمع نے گرفت مضبوط کر لی۔

''میرا واسطہ، کھائیں قسم۔'' شمع مسکرائی تھی۔

''مگر شمع......''

''میرے واسطے کی کوئی اہمیت نہیں۔'' مسکراتے لب بھنچ گئے۔

''آپ کو میرا اور مجھ سے کی جانے والی محبت کا واسطہ، قسم کے یہ الفاظ دھرائیں، دل اور زبان کو حاضر ناظر جان کر۔''

دو منٹ خاموشی چھائی رہی۔

''جی جی، میرے کان بیتابی سے انتظار کر رہے ہیں۔''

سعد نے شکوہ بھری نظروں سے شمع کو دیکھا، آج سے پہلے سعد کی نگاہوں میں اس قدر شکایت نہیں آئی تھی۔

''جی کہیے۔''

''ہاں کہیں ناں۔'' اگلے کتنے ہی پل شمع نے سعد کو ہمت بندھائی تھی۔

''میں قسم کھاتا ہوں، میں آئندہ کبھی بھی شمع سے ملنے یا اسے لے جانے کے لیے نہیں آؤں گا لیکن اگر شمع بلائے گی تو ضرور آؤں گا۔'' ادھر سعد کہتا گیا اور ادھر شمع کے ہاتھوں کی گرفت، سعد کے ہاتھوں پر کم ہوئی تھی۔ جب سعد خاموش ہوا تو شمع اس کا ہاتھ مکمل طور پر چھوڑ چکی تھی۔

''تم کب بلاؤ گی شمع؟'' سعد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''کب بلاؤ گی، میں انتظار کروں گا۔'' کھوئی محبت جیسے خود بخود گھر لوٹ آئی تھی، اسی لیے آنسو آنکھوں سے نکل کر بہتے چلے گئے تھے۔

اتنے میں سونیا ساتھ والے کمرے سے ہال کمرے میں آئی اور دروازے میں ٹھہر گئی۔

''لو میڈم آ گئی، آنسو پونچھو۔'' شمع نے ہاتھ بڑھا کر خود آنسو پونچھ ڈالے۔

''ہمت کرو۔'' شمع نے سعد کے بالوں کو سہلایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو جا کر، امی کو سلام کرو۔ ٹیکسی باہر کھڑی ہے نا؟''

سعد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مجھے بھی لگ رہا تھا، بلکہ میرا دل کہہ رہا تھا کہ گاڑی باہر کھڑی ہوگی۔''

''چلو جاؤ، وہ دیکھو ابو بھی آ گئے۔'' اکبر صحن پار کر کے برآمدے میں داخل ہو رہا تھا۔ شمع سونیا کے پاس آئی اور سرگوشی سے ذرا اونچی آواز میں بولی تھی۔

''میرے سعد کا خیال رکھنا۔''

''ضبط اور ہمت سے کام لو اور جاؤ امی کو سلام کرو، فیصل کو بھی پیار کر لینا۔'' اور شمع کمرے سے نکل گئی۔

اکبر کے ساتھ وہ برآمدے میں پڑی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''بیٹا تم ہمارے ساتھ چل رہی ہو نا؟'' اکبر نے اس سے کہا۔

''نہیں ابھی تو نہیں جا رہی، پھر کبھی۔'' شمع نے اکبر کو جواب دیا تھا۔

''لیکن کیوں بیٹا، اب کیوں نہیں؟'' اکبر کا لہجہ پُر شفقت تھا۔

''چھوڑیں اس بات کو، آپ ٹھیک ہیں نا، بنگلہ تو اچھا لگا ناں۔'' اور اکبر کو ایسے لگا کہ شمع سے کچھ کہنے یا اسے کچھ بتانے کے لیے اس کے پاس ایک لفظ بھی نہیں۔

❁❁❁

ایک روز عبدالرحمٰن شکستہ سے واپس گھر آئے اور دلگیر انداز میں بولے۔

''گھر بک گیا ہے۔''

''کون سا گھر؟''

''اکبر کا گھر، کراچی بیٹھ کر سودا کیا گیا ہے۔'' عبدالرحمٰن کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔

دو ہفتے بعد اکبر ایک بار پھر شمع کو لینے آیا۔

''میں آپ کی عزت کرتی ہوں، انکار کر کے آپ کی بے عزتی نہیں کرنا چاہتی۔ اس لیے اب دوبارہ مجھے ساتھ لے جانے کا مت کہیے گا۔'' شمع کا لہجہ دوٹوک تھا اور اکبر چپ بیٹھا رہ گیا۔

''اتنی ضد کیوں کر رہی ہو شمع؟'' زبیدہ کا لہجہ بہت سخت تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ شمع چلی جائے۔ اسی لیے تو اندر کمرے میں اس نے شمع سے سخت لہجے میں باز پُرس کی تھی۔

''میں نے کہیں نہیں جانا تو مطلب ہرگز نہیں جانا، اگر آپ کا گھر تنگ پڑ رہا ہے تو یہاں سے بھی چلی جاتی ہوں لیکن کراچی سعد کے پاس تو پھر بھی نہیں جاؤں گی۔'' شمع تو زبیدہ سے بھی زیادہ روکھی ہو چکی تھی۔

''تجھے اپنے بوڑھے ماں باپ پر رحم نہیں آتا۔'' زبیدہ کی آواز بھرائی اور وہ رونے لگی۔ شمع لاتعلق سی بیٹھی رہی تھی جیسے اسے ماں کے آنسوؤں سے کوئی لینا دینا ہی نہ ہو۔

فیصل کسمسایا تھا۔

''بڑا شرارتی ہو گیا ہے۔ گھنٹہ گھنٹہ گود میں لیے جھلاتے رہو، نیند ہی نہیں آتی اسے، اماں آپ نے اس کی عادتیں خراب کی ہیں۔'' شمع نے فیصل کو تھپکتے ہوئے کہا تھا۔ زبیدہ نے ملال بھری نظروں سے بیٹی کو دیکھا جسے اس بات کا کوئی ملال نہیں تھا کہ سعد اور اس کا خاندان اس سے دور ہوتا جا رہا تھا اور اسے تو جیسے پرواہ ہی نہیں تھی۔

''پتا نہیں، اتنی ضدی کیوں ہو گئی ہے؟'' زبیدہ نے سوچا۔

''شمع جو ہوا سو ہو چکا، سعد نے دوسری شادی کر لی تو کوئی گناہ نہیں کیا۔ اب تم اس کے پاس کیوں نہیں جاتی؟'' زبیدہ نے شمع سے اپنے شوہر کے پاس نہ جانے کا سبب پوچھا تو عبدالرحمٰن سر جھکائے شمع کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔ یہی سوال ان کا بھی شمع سے تھا لیکن وہ پوچھ نہیں سکتے تھے۔

''اماں، میں نے آپ سے پہلے بھی کہا ہے، مر جاؤں گی لیکن کراچی نہیں جاؤں گی اور اگر آپ لوگوں کو میں اور میرا بیٹا کھٹکتا ہے تو ٹھیک ہے، میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو شمع، یہ تمہارا اپنا گھر ہے لیکن شوہر پھر بھی شوہر ہوتا ہے۔'' عبدالرحمٰن ہمت کر کے بولے تھے۔

''ابو میں پاگل نہیں ہوں، سمجھ ہے مجھے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، مجھے یقین ہے کہ اگر آپ بھی میری جگہ ہوتے تو یہی کرتے۔'' شمع کا جواب سن کر وہ مزید کچھ نہ بول پایا۔

''ایک بیٹی مر گئی اور دوسری یہ دن دکھا رہی ہے۔'' زبیدہ رونے لگ گئی تھی۔

''ایسی باتوں کا کوئی فائدہ نہیں، صرف خون جلے گا میرا بھی اور آپ کا بھی، اس لیے بہتر ہے کہ ایسا کچھ مت کہیں۔'' فیصل کو اٹھائے ہوئے شمع اٹھ کھڑی ہوئی اور اندر جاتے ہوئے اس نے ماں سے کہا تو زبیدہ کے رونے میں شدت آ گئی تھی۔

❁ ❁ ❁

پاؤں گھسیٹتے ہوئے زبیدہ توقیر کی دکان پر آئی تھی۔ آج کل اس کے جوڑوں میں شدید درد تھا۔ گھٹنے تو برداشت سے زیادہ درد کر رہے تھے۔ توقیر کی دکان پر آ کر زبیدہ نے وہ مڑی تڑی پرچی توقیر کو پکڑائی۔ یہ پرچی زبیدہ نے شمع سے چھپا کر رکھی ہوئی تھی اور اب بھی چھپا کر لے آئی تھی۔

''آپ پریشان تو نہیں رہتیں۔ اللہ کی مرضی کے سامنے ہم سب بے بس ہیں۔ آپ صبر سے کام لیں اللہ عبدالرحمٰن چاچا کو جنت نصیب کرے، چالیس دن ہو گئے ہیں کیا؟'' توقیر نے پرچی پر موجود نمبر دیکھا۔

''نہیں دو دن رہتے ہیں ابھی۔'' زبیدہ نے کہا تھا۔

''میں آپ کے بیٹے جیسا ہوں کسی بھی قسم کا کوئی کام ہو تو مجھے بتا دیجئے گا، میں کر دوں گا۔'' توقیر نے ریسیور اٹھایا تھا۔

''یہ سعد کا نمبر ہے کیا؟''

زبیدہ نے سر ہلا دیا۔ اس سے گھٹنوں میں درد کی وجہ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ اس لیے ساتھ پڑے لکڑی کے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

''سعد نے اچھا تو نہیں کیا، وہ باجی کو ساتھ کیوں نہیں لے کر جا رہا۔'' زبیدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

''یہ لیں گھنٹی جا رہی ہے۔'' توقیر نے ریسیور سٹول پر بیٹھی زبیدہ کو پکڑایا تھا۔ زبیدہ ریسیور کان سے لگائے کسی کے فون اٹھانے کا انتظار کرتی رہی۔

''ہیلو۔'' ایک نسوانی آواز زبیدہ کو سنائی دی تھی۔

''سعد سے بات کرنی ہے، بات ہو سکتی ہے؟''

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر پوچھا گیا تھا۔

''آپ کون ہیں؟''

''میں...... میں ملتان سے بات کر رہی ہوں۔'' زبیدہ نے سنبھل کر اپنا تعارف کروایا تھا۔

''اچھا، اچھا...... تو آپ سر کے آبائی گھر سے بات کر رہی ہیں لیکن محترمہ مجھے افسوس ہے کہ آپ کی سر سے بات نہیں ہو سکتی کیونکہ سر اور میڈم ابھی کچھ دن پہلے امریکہ چلے گئے ہیں۔ وہ مستقل طور پر شفٹ ہونے کے لیے وہاں گھر دیکھیں گے، اگر آپ کہیں تو میں وہاں کا نمبر دے دوں۔''

''امریکہ...... مستقل طور پر؟'' زبیدہ کو بولتے ہوئے اپنے حلق میں کانٹے چبھتے محسوس ہوئے تھے۔

''دے دیں۔'' زبیدہ کا دل چاہا کہ یہیں رو دے لیکن اس نے ضبط کیا تھا۔

''یہ توقیر بیٹا نمبر تو لکھ لو۔'' توقیر نے ایک صفحہ اور پنسل سنبھالی اور ریسیور کان سے

لگایا۔

''خالہ، وہ خاتون کہہ رہی ہے کہ کچھ دیر تک خود فون کر کے نمبر بتا دے گی۔ اس وقت نمبر والی ڈائری نہیں پڑی۔''

''فون بند ہو گیا کیا۔'' توقیر کو ریسیور کریڈل پر رکھتے دیکھ کر زبیدہ بولی تھی۔

''ہاں!''

''بیٹا ایک بار پھر ملا دے نمبر۔''

اور زبیدہ ایک بار پھر فون کان سے لگائی کھڑی تھی۔

''سعد کے والد اکبر صاحب سے بات ہو سکتی ہے۔'' زبیدہ نے درد کرتے گھٹنے پر ہاتھ جمایا تھا۔

''اکبر صاحب کی فیملی کسی اور جگہ شفٹ ہو گئی ہے۔ ہمارے پاس تو ان کا کانٹیکٹ نمبر نہیں ہے لیکن سر سعد کے پاس ہو گا۔ میں کچھ دیر تک آپ کو فون کر کے سر سعد کا نمبر دیتی ہوں، ان سے لے لیجئے گا۔''

زبیدہ نے بے دلی سے ریسیور رکھا تھا۔

''اگر فون آئے تو بیٹا نمبر لکھ لینا، کتنے پیسے بنے؟''

''خالہ پیسے رہنے دیں بس میں نمبر لکھ لوں گا۔ سعد سے بات نہیں ہوئی کیا؟''

''بات تو نہیں ہو سکی اور پیسے بتاؤ کتنے ہوئے، یوں ہمدردیاں کرو گے تو دکانداری کیسے کرو گے؟'' توقیر نے پیسے بتا دیئے اور زبیدہ نے ادا کر دیئے۔ ''نمبر ٹھیک طرح لکھنا امریکہ کا نمبر ہو گا پھر آ کر اسی سے بات کروں گی یہاں سے امریکہ بات ہو جائے گی نا؟'' زبیدہ سٹول سے اٹھی تو گھٹنوں کا درد جاگ اٹھا۔

''امریکہ کا نمبر، خیریت خالہ امریکہ کون رہنے لگ گیا؟ ہاں یہاں سے بات تو ہو جائے گی لیکن پیسے بہت سارے لگ جائیں گے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، نمبر سنبھال کر رکھنا میں شام کو چکر لگاؤں گی۔'' زبیدہ نے توقیر کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔

''لیکن خالہ امریکہ کون ہے اتنی دور اور اسے امیر ملک میں؟'' توقیر کو تجسس ہو رہا تھا۔

اس محلے میں صرف دو گھروں کے کمانے والے افراد بیرون ملک کمانے کے لیے گئے ہوئے تھے اور وہ بھی سعودی عرب میں، امریکہ کا سن کر توقیر کا حیران ہونا فطری تھا۔

''سعد امریکہ میں ہے، اس سے بات کرنی ہے۔'' زبیدہ نے جاتے ہوئے کہا اور

دکان سے باہر نکل آئی تھی۔

''سعد امریکہ میں ہے......'' توقیر جتنا حیران ہوتا کم تھا۔ ابھی زبیدہ سے مزید کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن زبیدہ دکان سے باہر جا چکی تھی۔

''چلو پھر پوچھ لوں گا، جب شام کو آئیں گی۔ ویسے حیرانی والی بات ہے کیا سعد کی دوسری بیوی اتنی امیر ہے کہ اسے امریکہ لے گئی ہے، بھئی سب کے سعد جیسے نصیب تھوڑے ہوتے ہیں۔''

گھر پہنچ کر زبیدہ شمع سے گلے لگ کر بڑی شدت سے روئی۔ شمع اجنبی آنکھیں لیے ماں کو روتے دیکھتی رہی۔

''سعد کو فون کر کے آ رہی ہیں نا۔'' شمع کے لہجہ میں یقین تھا۔ زبیدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس روتی رہی اور پھر اس کے بعد شمع نے مزید کوئی سوال نہ کیا۔ جیسے جانتی ہو سب کچھ۔

❁❁❁

''میرے ابو پتا ہے، بہت مذہبی ہیں۔ عاشق رسول۔ رسول اللہ ﷺ سے تو بے حد محبت کرتے ہیں۔ مدینے کے علاوہ تو ان کا کہیں دل ہی نہیں لگتا۔ سو پچھلے چار سالوں سے وہیں پر ہیں۔'' فیصل کی پچھلی سیٹ پر کوئل اپنی سہیلی کو بتا رہی تھی۔ فیصل نے اپنی توجہ لیکچر کی طرف دینی چاہی لیکن کوئل اور اس کی سہیلی کی کھسر پھسر توجہ کھینچ رہی تھی۔

ویسے بھی آج کے پریکٹیکل کا یہ دوسرا لیکچر تھا اور فیصل پہلی بار نہ صرف اس پریکٹیکل کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا بلکہ خود بھی پرفارم کر چکا تھا۔ ڈیمانسٹریٹر نے انگلی کا اشارہ کر کے کوئل کو چپ ہونے کا کہا تو کھسر پھسر میں تھوڑی کمی آئی۔

ڈیمانسٹریشن ختم ہوئی تو پرفارم کرنے کی باری آئی۔ اس دوران بھی کوئل کی سرگوشیاں جاری رہیں۔ ڈیمانسٹریٹر پہلے ایک بار خود پرفارم کر کے دکھا رہی تھی۔

''پتا ہے ابو کل ہی واپس آئے ہیں، میرا تو آج آنے کا ارادہ بھی نہیں تھا لیکن پھر بھی نہ چاہتے ہوئے آ گئی۔ آ کر غلطی کی۔'' کوئل کی آواز ایک بار پھر فیصل کے کانوں سے ٹکرائی اور وہ مسکرا دیا۔

ان لوگوں کی فورتھ ایئر کی اختتامی کلاسز تھیں۔ پریکٹیکلز پوری کلاس کے ایک ساتھ نہیں ہوا کرتے تھے۔ گروپس کی صورت میں ہوتے تھے۔ پہلے تین سالوں میں فیصل اور کوئل کا گروپ مختلف تھا لیکن اس سال پہلی بار ان کا گروپ ایک ہی بنا تھا اور فیصل کے لئے یہ نعمت غیر مترقبہ تھی۔

اب وہ فرسٹ ایئر کے ابتدائی دنوں کی طرح کوئل کو تاڑا نہیں کرتا تھا لیکن وہ دل و جان سے تسلیم کر چکا تھا کہ وہ کوئل کو پسند کرتا ہے۔

''چلیں اب آپ دو دو سٹوڈنٹس مل جائیں اور پرفارم کریں۔''

دو دو سٹوڈنٹس مل کر پرفارم کرنے لگے۔ لڑکے تھوڑا سائیڈ پر ہو گئے اور لڑکیاں ایک طرف ہو گئیں۔ ان سب میں فیصل واحد فرد تھا جو اکیلا پرفارم کر رہا تھا۔ فیصل نے دور کھڑی کوئل کو دیکھا تھا جو سلوشن ہاتھ میں لیے اپنی اسی سہیلی سے محو گفتگو تھی۔ مسکراہٹ ایک بار پھر فیصل کے لبوں کو چھو گئی۔

''ایکسکیوز می۔'' فیصل کو مخاطب کیا گیا تھا۔

فیصل نے آواز کی طرف دیکھا۔ کوئل اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''اکچوئلی میں سمجھ نہیں پائی پلیز آپ مجھے تھوڑا سا بتا دیں۔'' کوئل نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

فیصل نے دور کھڑی لڑکیوں کی طرف نظر دوڑائی۔ کوئل کی سہیلی دو لڑکیوں کے ساتھ کھڑی تھی اور ان سے سمجھ رہی تھی۔

''جی کیوں نہیں۔'' فیصل نے کہا۔

ان کی کلاس میں چند ایک کے سوا چھوڑ کر لڑکوں اور لڑکیوں میں ایک حد تک ہی بے تکلفی تھی۔ البتہ مل کر پڑھنے میں سٹوڈنٹس کم ہی ہچکچاتے تھے اور کوئل کو اگر کوئی چیز سمجھ نہیں آتی تھی تو وہ فیصل سے پوچھنے میں کوئی عار نہیں محسوس کرتی تھی بلکہ اکثر و بیشتر فیصل سے ہی پوچھا کرتی تھی۔ فیصل کوئل کو سمجھاتا رہا۔ ایک ٹیسٹ ٹیوب کوئل کو بھی پکڑائی۔ بتاتے بتاتے فیصل نے ٹیسٹ ٹیوب کوئل سے مانگی۔

''ہوں...... ادھر دیں۔'' فیصل نے دوسری بار ٹیسٹ ٹیوب مانگی تو کوئل نے ٹیسٹ ٹیوب فیصل کی طرف بڑھا دی۔

''مدینے سے آنے والے اپنے فادر سے گھر جا کر مل لیجیے گا۔ ابھی مینٹلی طور پر آپ یہاں نہیں ہیں۔''

کوئل خجل ہو گئی۔

فیصل نے ایک بار پھر کوئل کو ٹیسٹ ٹیوب پکڑائی اور دوسری ٹیسٹ ٹیوب میں سلوشن ڈالا اور بتانے لگ گیا۔ بتاتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی ٹیسٹ ٹیوب کو دیکھ رہا تھا۔

ٹیسٹ ٹیوب کو دیکھتے دیکھتے فیصل نے نظر اٹھا کر کوئل کو دیکھا۔ بڑے بڑے نینوں والی

کاجل لگی کجراری آنکھوں سے کوئل فیصل کو ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔

فیصل کو اس وقت کوئل بہت زیادہ خوبصورت لگی۔ آناً فاناً اس نے فیصلہ کر لیا۔ وہ دونوں باقی سٹوڈنٹس سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے اس کے کچھ کہنے پر کوئی ہی متوجہ ہوتا۔

''شادی کرو گی مجھ سے۔''

''آں ں ں؟'' کوئل چونکی تھی۔

''شادی کرو گی مجھ سے۔'' فیصل نے ایک بار پھر دہرایا تھا۔

کوئل کی پلکیں لرزی تھیں۔ ہاتھ میں پکڑی ٹیسٹ ٹیوب کو کانپتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے ٹیسٹ ٹیوب اسٹینڈ میں رکھا تھا اور مڑ کر جانے لگی لیکن جاتے جاتے ہوئے مدھم سی آواز میں بولی جو فیصل کو بھی بمشکل سنائی دی تھی۔

''لڑکی کی خاموشی کا مطلب تو سمجھتے ہیں نا آپ۔''

اور فیصل کے ہونٹوں کی مسکراہٹ پھیلتی ہی چلی گئی۔

فیصل خوش خوش سا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اپنی گلی کا موڑ مڑا۔ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا۔ دروازے کے دونوں کواڑ کھلے ہوئے تھے۔ آج سے پہلے کبھی فیصل کو دروازہ یوں کھلا ہوا نہیں ملا تھا۔ فیصل کو انہونی کا احساس ہوا تھا۔ دل بڑی زور سے دھڑکا تھا، مختصر سا صحن اس نے جیسے دو قدم میں ہی پار کیا تھا۔

''اماں۔'' پہلے اس نے ہال کمرے میں جھانکا اور آواز بھی لگائی تھی۔ شمع کمرے میں نہیں تھی۔ باورچی خانے میں دیکھا تھا۔ شمع وہاں پر بھی نہیں تھی۔

ابھی وہ باورچی خانے سے نکلا ہی تھا کہ اسے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی شمع نظر آئی۔

''فیصل آ گئے بیٹا۔'' شمع نے فیصل کو مخاطب کیا تھا۔ پیار بھرے لہجے کے ساتھ۔

''جی اماں! باہر کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ جب میں گھر آیا اسی لیے بس تھوڑا سا......''

''ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان نہیں ہوا کرتے۔ ویسے شاید میں دروازہ بند کرنا بھول گئی ہوں گی۔''

''وہ اصل میں آج سے پہلے کبھی دروازہ یوں کھلا نہیں ملا نا، اس لیے۔''

فیصل کی بات سن کر ماں مسکرائی۔

''بوڑھی ہو گئی ہوں نا، بس اس لیے بھول گئی۔''

فیصل نے نظر بھر کے ماں کو دیکھا تھا۔ ماں کی آنکھوں کو اس نے ہوش سنبھالنے سے

نے کر اب تک یوں ہی اداس دیکھا تھا۔ وہ جب ہنس رہی ہوتی تو فیصل کو یہ اداسی تب بھی محسوس ہوتی تھی۔

"بھوک لگ گئی ہوگی، چل اندر جا کر بیٹھ۔"

یہ کہہ کر ماں کھانا لینے کچن میں چلی گئی اور فیصل اندر ہال کمرے میں۔

سالن تیار تھا جب کہ توا ڈال کر ماں نے روٹیاں پکانے کی تیاری شروع کر دیں۔ اسے خود ساری زندگی تازی توے سے اتری گرم روٹی اچھی لگتی تھی اور یہ پسند فیصل میں بھی منتقل ہوئی تھی۔ سو اس لیے وہ ہمیشہ فیصل کے آنے کے بعد روٹیاں پکاتی تھی اور پھر دونوں ماں بیٹے مل کر کھاتے تھے۔

کھانے سے فارغ ہو کر فیصل نے جیب سے پیسے نکالے اور ماں کی طرف بڑھائے۔

"یہ لیں امی، کچھ پیسے ہیں۔" فیصل جس گھر میں ہوم ٹیوشن کے لیے جاتا تھا وہاں سے اسے آج تنخواہ ملی تھی۔

ماں نے ہاتھ بڑھا کر پیسے لے لیے۔ ماں فیصل کو منع تو کرتی تھی کہ ٹیوشنز مت پڑھایا کرے۔ مفت میں مشقت اٹھاتا ہے۔ یہی ٹائم وہ اپنی پڑھائی کو بھی دے سکتا ہے لیکن فیصل ہمیشہ مسکرا کر کہتا کہ مجھے ٹیوشنز پڑھانا اچھا لگتا ہے۔ اپنا شوق پورا کرنے جاتا ہوں۔ پیسوں کے لیے نہیں۔ یہ ٹیوشن تو میری تفریح ہے لیکن اب پچھلے آٹھ دس مہینوں سے ماں نے فیصل کو ایک بار بھی منع نہیں کیا تھا۔ اب وہ خود بھی اپنے آپ کو بوڑھا محسوس کرنے لگی تھی۔ سلائی کرنے میں دشواری ہوتی تھی نظر بھی کم آتا تھا۔

"اماں وہ......" فیصل کہنے سے ہچکچا رہا تھا۔

"کیا بات ہے فیصل؟ کیا کہنا ہے؟" اس نے فیصل کو بغور دیکھا تھا۔

"بہت خاص بات کرنی ہے آپ سے۔" فیصل کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے کہے اور کیا کہے۔ اس نے ایک گہری سانس لی تھی۔

"جو کہنا ہے کہہ دو ہچکچاؤ مت۔" ماں کو بھی کچھ دنوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ فیصل کچھ کہنا چاہتا ہے اور اس "کچھ" کے بارے میں بھی ماں کو قدرے اندازہ تھا، فیصل نے کچھ دیر کا توقف کیا تھا۔

"امی، کومل اچھی لڑکی ہے۔" فیصل نے اپنا مفہوم سمجھانے کے لیے بس اتنا ہی کہا تھا۔

اور وہ فیصل کو دیکھ کر رہ گئی۔ اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔

"مجھے آپ سے بے حساب محبت ہے۔" برسوں پہلے کسی کی کہی بات اس کے کانوں

میں گونجی تھی۔

"زندگی میں......" وہ کہتے ہوئے رک گئی۔

"پوری زندگی میں کبھی کوئی ایسا لمحہ تو نہیں آئے گا جب تم اسے چھوڑ دو، کسی چیز کو اس پر ترجیح دو گے۔"

اس کے لہجے میں کسی بھی قسم کے جذبات کو محسوس کرنا مشکل تھا۔ فیصل کو اپنی ماں کی آنکھوں کی اداسی معمول سے کچھ بڑھی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" فیصل نے پُرعزم انداز میں کہا تھا۔

"مجھے یقین تو نہیں لیکن بہرحال مجھے تمہاری پسند پر کوئی اعتراض نہیں۔" ماں نے اتنا کہا اور فیصل کے خوش ہونے کے لیے یہ بہت تھا۔

"زیادہ امیر لوگ تو نہیں؟" ماں نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔

"نہیں، نہیں لیکن ہم سے بہتر ہیں۔" فیصل نے دانستہ طور پر کافی بہتر کہنے کی بجائے صرف بہتر کہنے پر اکتفا کیا تھا اور ماں نے مزید کچھ نہ پوچھا۔

سامنے پڑے کھانے کے برتنوں کو اٹھایا اور کھڑے ہو کر فیصل کی پیشانی کو چوما تھا۔

"اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔" یہ کہہ کر وہ برتن لے کر چلی گئی اور فیصل کی خوشی میں اضافہ ہو گیا۔

* * *

"میں نے آئندہ کبھی تمہارے ساتھ یوں نہیں بیٹھنا، ایک تو کچھ مناسب بھی نہیں دوسرا سٹوڈنٹس بھی باتیں بنانے لگ گئے ہیں۔" کومل نے فیصل سے کہا۔ فیصل اور کومل اس وقت لائبریری میں مشترکہ ٹیبل پر بیٹھے تھے۔

لائبریری کافی کشادہ تھی عام فلموں اور ٹی وی پر دکھائی جانے والی لائبریریوں جیسی نہیں تھی جس میں تھوڑا سا بھی بولنے پر لائبریرین چپ رہنے کا اشارہ کرتا۔ سٹوڈنٹس تو یہاں بیٹھ کر گپیں لگایا کرتے تھے اور لائبریرین "شور نہ کرو" کہہ کر دوبارہ اخبار میں گم ہو جاتا یا پھر کسی دوسرے کام میں جو وہ کر رہا ہوتا۔ لائبریری کے باہر ایک بورڈ پر "ضروری ہدایات" لکھی ہوئی تھیں۔ جن میں ایک یہ بھی تھی کہ لائبریری میں کھانا پینا منع ہے لیکن سٹوڈنٹس بڑے مزے سے چپس، چاکلیٹ وغیرہ کھا لیتے تھے۔ لائبریرین اس سلسلے میں منع تو کرتا رہتا لیکن خود بھی دن میں ایک دو بار تو ضرور کھاتا پیتا، سو سٹوڈنٹس بھی کھا لیتے۔ ہاں البتہ گندگی نہیں پھیلاتے تھے اگر چپس یا چاکلیٹ کا ریپر کوئی سٹوڈنٹ ٹیبل پر چھوڑ جاتا تو اگلے ہفتہ دس دن لائبریرین

کسی کو کچھ نہ کھانے دیتا کوئی کھا رہا ہوتا تو اسے سختی سے کہہ دیتا کہ لائبریری سے باہر جا کر کھاؤ۔

باہر بورڈ پر لکھی ضروری ہدایات میں ایک یہ بھی تھی کہ اپنا موبائل فون وائبریشن پر رکھیں لیکن لائبریرین سمیت کسی کا بھی موبائل وائبریشن پر نہ ہوتا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔ میں کچھ دنوں سے یہ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں پایا تھا۔''

''ابو نے اگلے ہفتے پھر سعودی عرب چلے جانا ہے۔ وہ ہر سال صرف دو مہینے ہمیں ملنے کے لیے آتے ہیں اور پھر دوبارہ سعودی عرب، مدینہ چلے جاتے ہیں۔ مدینہ منورہ کے علاوہ کہیں پر ان کا دل نہیں لگتا۔''

''ٹھیک ہے، میں امی سے بات کرلوں گا۔ ہم ان شاء اللہ اسی ہفتے رشتہ لے کر آ جائیں گے لیکن کوئل ہم لوگ تو مالی لحاظ سے تم سے کافی کمزور......''

''پیسے کی کوئی اوقات نہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' کوئل نے فیصل کی بات درمیان میں ہی کاٹ لی۔

کوئل کے منہ سے یہ سن کر فیصل کے اطمینان میں اضافہ ہی ہوا تھا۔

''ویسے ماشاء اللہ تمہارے والد صاحب تو کافی دین دار آدمی ہیں۔'' کچھ وقفے بعد فیصل نے کہا تھا۔

''ہاں یہ تو ہے۔ ابو کے چہرے سے نور جھلکتا ہے۔'' کوئل نے مسکرا کر کہا تھا۔

''اور تمہارا بھائی کیسا ہے؟ پرسنیلٹی تو کافی اچھی ہے کل جب تمہیں لینے آئے تھے تو میں نے دیکھا تھا۔ تم بائیک پر ان کے ساتھ جا رہی تھی۔''

''بس پرسنیلٹی ہی اچھی ہے۔ مزاج ایک دم کھڑوس ہیں۔ تم ملو گے تو خود دیکھ لینا۔'' کوئل نے سر ذرا نیچے کر کے سرگوشی کے سے دھیمے انداز میں کہا تھا جیسے اگر تھوڑا اونچا بولے گی تو کوئی سن لے گا۔

فیصل ہنس پڑا۔

''ویسے میں نے تمہیں تین چار سال پہلے فرسٹ ایئر میں ایک فاسٹ فوڈ سنٹر میں بھی دیکھا تھا۔''

''ہاں ہاں مجھے بھی اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے بھی تمہیں دیکھا تھا۔ تم اپنے کسی دوست کے ساتھ آئے تھے۔''

''دوست نہیں بھائی۔''

''بھائی؟ تمہارا کوئی بھائی بھی ہے؟''

''ہاں، سوتیلا بھائی۔''

''سوتیلا۔ تمہارے فادر نے دو شادیاں کی ہیں کیا؟''

''میرے فادر نے دو شادیاں کی تھیں اور وہ ہمارے ساتھ نہیں رہتے بلکہ میں نے انہیں ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی دیکھا بھی نہیں۔ بس میں اپنے فادر کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتاؤں گا۔ آئندہ کبھی، شادی کے بعد تفصیل سے۔''

''کیوں؟''

''بس کہہ دیا نا۔''

کوئل نے مزید کچھ نہ پوچھا۔

''تم بتاؤ تم نے ابھی کہا کہ تمہیں اچھی طرح یاد ہے کہ تم نے فاسٹ فوڈ سنٹر میں مجھے دیکھا تھا۔ یہ یاد رکھنے والی بات تو نہیں، کیا تم بھی مجھے اس وقت پسند کرتی تھی؟'' فیصل کو اچانک خیال آیا تھا۔

''میں بھی اس بارے میں شادی کے بعد بتاؤں گی، تفصیل سے۔'' کوئل نے بالکل فیصل کے انداز میں کہا تھا۔ اور فیصل بے ساختہ ہنس دیا۔

❁❁❁

سردیوں کے مختصر دن تھے۔ آج فیصل اپنی ماں کے ساتھ کوئل کے گھر باقاعدہ طور پر رشتہ لے کر جا رہے تھے۔ فیصل نے آف وائٹ پینٹ کے ساتھ میرون کلر کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ برآمدے کی دیوار پر لگے سرخ فریم والے چوکور شیشے میں فیصل اپنے آپ کو دیکھ کر برش کر رہا تھا۔

اس چوکور شیشے سے پہلے یہاں پر سبز فریم والا گول شیشہ تھا۔ گول شیشے کے ٹوٹنے کے بعد اس کی جگہ سرخ فریم والے چوکور شیشے نے لے لی تھی۔

''امی کیسا لگ رہا ہوں؟'' فیصل نے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

''شمع تم مجھے دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت لگتی ہو۔'' اس نے فیصل کی بات سنی تو ایک لمحے میں وہ کئی سال پیچھے لوٹ گئی۔ اس آواز کے تعاقب میں جو برسوں سے اس کے ذہن کے نہاں خانوں پر مسلط تھی۔ ہاں وہ سعد کی شمع تھی۔ جو آج اس کے روپ میں اس کے بیٹے کی ماں تھی اور بیٹا جب کبھی کوئی ایسی بات کرتا تو وہ چونک جایا کرتی تھی۔ برسوں پہلے سعد نے بھی اسی لہجے میں کچھ ایسا ہی کہا تھا۔ ان آوازوں کو وہ اکثر سنتی تھی۔ شاید فیصل کے بعد

زندگی گزارنے کا دوسرا سہارا ابھی یہی آوازیں تھیں۔

''تم اس وقت دنیا کے سب سے خوبصورت لڑکے لگ رہے ہو۔'' اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

فیصل کو ماں سے اس پذیرائی کی امید نہیں تھی۔ حیران ہوا تھا۔ اس کے باوجود حسب معمول اسے ماں کی مسکراہٹ اداس سی لگی تھی۔

''چلیں۔''

''ہاں چلو۔''

شمع نے باہر دروازے کو لگانے کے لیے تالا اٹھایا اور فیصل کو پکڑا دیا۔ رکشے پر بیٹھ کر وہ کوئل کے گھر گئے۔

کوئل کے والدین، سکندر ریاض اور کنول سکندر نے فیصل اور شمع کا پُرجوش استقبال کیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کوئل کا بھائی بھی ملنے آ گیا۔ چند لمحے بعد کوئل چائے لے کر آ گئی اور تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد چلی گئی۔

شمع یہاں ویسے کسی کو پسند تو کرنے آئی نہیں تھی، رشتہ لے کر آئی تھی۔ اسے فیصل کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن پھر بھی شمع کو کوئل اور اس کے والدین کافی اچھے لگے تھے۔

شمع نے رشتے کی بات کی۔ سکندر صاحب نے سوچ کر جواب دینے کا کہا ویسے انہیں فیصل پسند تو آیا تھا۔ کوئل کی پسند سے بھی واقف تھے لیکن پھر بھی کچھ چھان بین کرنا چاہتے تھے۔

فیصل کوئل کے والد کو دیکھ کر نہ جانے کیوں عجیب سا محسوس کرنے لگا تھا۔ سکندر صاحب کی داڑھی میں چاندی غلبہ پا رہی تھی اور ان کی شخصیت پر خوب جچتی تھی۔ فیصل کو آواز بھی ایسے لگ رہی تھی جیسے پہلے بھی سنی ہو۔

''جانے میں پہلے کبھی انہیں ملا ہوں یا خواہ مخواہ کا وہم ہے۔'' جاتے وقت تک فیصل نے کئی بار سوچا۔ البتہ جاتے ہوئے وہ مطمئن تھا کہ ان شاء اللہ رشتہ پکا ہو جائے گا۔

غلام محی الدین نے سونے کا چمچہ منہ میں لیے اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ گھر میں ہر سہولت دستیاب تھی۔ ماں جان لٹانے والی، باپ شفقت سے پیش آنے والا، بچپن میں مہنگے سے مہنگا کھلونا توڑا۔ لڑکپن میں پاکستان میں دستیاب سب سے اچھی اور سب سے مہنگی بائیک پر پورا کراچی گھوما، ساتھ ساتھ لڑکیوں سے بھی دوستی کی اور بھرپور انداز میں زندگی بسر کی۔

یہ لڑکپن کا درمیانی عرصہ تھا جب وہ غلام محی الدین سے جی ایم بنا۔ ماریہ، اس کی بہن، اسے نام کے حوالے سے چڑایا کرتی تھی۔ کلاس میں لڑکے اس کو نام کی طرح طرح سے بگاڑا کرتے تھے۔ وہ کلاس کے ٹاپرز میں سے تھا۔ لڑکے دبتے تھے لیکن نام کے حوالے سے پھر بھی وہ طنز، تنقید اور مذاق کا نشانہ بنا رہتا۔

''آخر آپ نے میرا نام اتنا اولڈ کیوں رکھا تھا؟'' وہ چڑ کر کئی بار اپنی ماں اور باپ سے الجھ چکا تھا۔

''ہنی بیٹا میں تو خود اتنے اولڈ نام کے حق میں نہیں تھی۔ یہ تمہارے دادا کی پسند تھی۔'' ماں ایک خاص ادا سے بال جھٹک کر کہتی۔

باپ مسکرا دیتا۔

اس طرح اپنے نام سے بے زار غلام محی الدین نے ایک دن اپنا ذہن چلایا اور اپنا نام مختصر کر لیا۔

''غلام محی الدین نہیں، جی ایم۔'' اس نے لڑکوں کو تصحیح کرتے انداز میں بتایا وہ اس پر بھی مذاق کا نشانہ بنا لیکن پہلے ایک لڑکے نے بلانا شروع کیا، پھر دوسرے نے اور پھر سب نے۔

ماں کو بتایا۔ اسے بھی اچھا لگا۔ وہ بھی جی ایم پکارنے لگی۔ دو سال چھوٹی ماریہ بھی جی

ایم پکارنے لگی۔ البتہ باپ بیشتر غلام محی الدین بلاتا کبھی کبھار جی ایم بھی بلا لیتا۔

جی ایم کو اپنا باپ کبھی کبھار بہت عجیب لگتا تھا بلکہ اسے اپنے دونوں چچا اور پھوپھو بھی عجیب لگتے تھے۔ جیسے کوئی معمہ ہو۔

لڑکپن میں ہی اسے اِدھر اُدھر سے یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ شادی سے پہلے اس کا باپ، اس کی ماں کی فیکٹری میں ایک عام درجے کا ملازم تھا اور پھر ان دونوں میں کسی طرح ہم آہنگی پیدا ہوئی اور پھر شاید محبت اور پھر شادی۔ ویسے سننے کو یہ بھی ملا تھا کہ صرف اس کی ماں کو محبت ہوئی تھی اور پھر اس کی ماں نے پہل کی اور پھر بات آگے بڑھی تھی۔ جی ایم اس قصے میں دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے ایک دوبار اپنے ماں باپ سے اس بارے میں پوچھا تھا۔ اس کی ماں مسکراتے ہوئے کم وبیش یہی بتاتی۔ باپ چُپ ہو جاتا اور کچھ نہ بتاتا۔

زندگی گزارنے کے لیے کیا معیار ہونا چاہیے۔ یہ سوچنے کے لیے جی ایم کے پاس ٹائم نہیں تھا۔ وہ آوارہ پھرتا۔ ٹھٹھے لگا کر دوستوں کے ساتھ ہنستا۔ سگریٹ کے پیکٹ کے پیکٹ پھونک جاتا۔ زندگی گزر رہی تھی اور جی ایم زندگی کو خوب انجوائے کر رہا تھا۔

وہ اکثر سوچتا کہ اس کی ماں کے کوئی قریبی رشتے نہیں ہیں اور باپ کے قریبی رشتے تو ہیں ہی عجیب۔ خصوصاً شعیب چاچو۔ ان کا انداز بے حد والہانہ ہوتا۔ خوب محبت جتاتے تھے اور کافی عرصے سے بار بار اپنی بیٹی کی خوب تعریفیں کرتے تھے۔

''اس لڑکے کے تو نصیب ہی کھل جائیں گے جس کی میری ثمائلہ سے شادی ہوگی۔''

اس تعریف میں جو پیغام چھپا ہوتا وہ جی ایم تک بخوبی پہنچتا لیکن اسے ثمائلہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اُس دن بھی وہ چاچو کی طرف نہیں جانا چاہتا تھا لیکن وہ پھنس ہی کچھ اس طرح سے گیا تھا کہ چاچو کے گھر پہنچ گیا۔

''جی ایم بیٹا، کتنے دنوں سے چکر نہیں لگایا۔ بہت یاد آرہی ہے تمہاری آکر تھوڑی دیر چاچو سے مل لو۔'' فون سے چاچو کی میٹھی آواز آرہی تھی اور جی ایم بے زاری سے فون کو دیکھ رہا تھا۔

''آج چاچو!'' جی ایم کوئی بہانہ سوچ رہا تھا کہ اسے موقع ہی نہ ملا۔

''ہاں آج، کوئی بہانہ نہیں چلے گا تم گھر پر رکو، صائم وہیں تمہارے گھر والی کالونی میں ہے، میں اسے کہتا ہوں۔ پانچ منٹ تک وہ تمہیں پک کر لے گا، گاڑی پر ہے وہ۔''

اور پھر اس سے پہلے کہ وہ گھر سے فرار ہوتا، صائم بھی آگیا اور بیس منٹ بعد وہ چاچو

کے سامنے سر جھکائے بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔

''چاچو کی یاد نہیں آتی؟''

''ایسی بات نہیں ہے چاچو۔'' جی ایم نے دھیمی آواز میں کہا تھا اور ساتھ میں سوچ رہا تھا بھلا کوئی بھتیجا چاچو کو بھی یاد کرتا ہوگا۔ مگر اُدھر چاچو کی باتیں ایک بار پھر سے شروع ہوگئیں۔ اپنی بیماری کی باتیں اور ثمائلہ کی تعریفیں اور انہی باتوں میں چاچو نے کہہ دیا۔

''کتنے سارے سال ہوگئے ہیں ملتان نہیں گیا۔ حالانکہ زندگی کے بیس بائیس سال وہاں پر گزرے ہیں اور اب بیس بائیس سال ہونے کو ہیں جب سے کراچی آیا، ملتان گیا ہی نہیں۔''

''پھر آپ ملتان کیوں نہیں گئے؟'' جی ایم کو چاچو کے ملتان جانے سے کوئی دلچسپی تو نہیں تھی لیکن پھر بھی اس نے رسمی طور پر پوچھ لیا۔

''بس پیسہ ترجیحات بدل دیتا ہے، پتہ ہی نہیں چلتا۔'' چاچو نے تھوڑا اداسی سے کہا تھا۔

جی ایم نے بے زاری سے سنا اور توجہ نہ دی۔

''پتا نہیں شمع بھابی کیسی ہوں گی؟'' چاچو کو بھی بیٹھے بیٹھے کوئی پرانی بھابی یاد آئی تھی۔

''کون شمع بھابی؟'' اب چاچو کے ساتھ بیٹھ کر کوئی بات تو کرنی تھی تاکہ وہ یہ گلہ نہ کرے کہ کہاں کھوئے ہو بات کرنا اچھا نہیں لگ رہا۔

چاچو نے توقف کیا تھا۔

''شمع بھابی، تمہاری سوتیلی امی ہیں، سعد بھائی کی پہلی بیوی۔''

''پہلی بیوی؟'' جی ایم حیران ہوا اور پھر وہ پوچھتا گیا اور شعیب چاچو بتاتے چلے گئے۔ جب جی ایم واپس گھر جا رہا تھا تب ہی اس نے ایڈونچر کا سوچا۔ ویسے بھی اس نے اس بار چھٹیاں گزارنے کے لیے ناردن ایریاز جانا تھا تو کیوں نا ملتان چلا جائے۔ وہاں اپنے سوتیلے بھائی سے ہیلو ہائے بھی کر آئے۔ اس کا ایک کلاس فیلو ملتان سے تھا۔ خصوصاً پڑھنے کے لیے کراچی آیا تھا۔ اس سے رابطہ کیا۔ ایڈریس شعیب چاچو سے لیا۔ ملتان جا کر پہلے فیصل کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور پھر اپنے کلاس فیلو کے بھائی اور دوستوں کے ساتھ مل کر فیصل کی فولنگ بھی کی۔ اس دوران جی ایم نے محسوس کیا تھا کہ ایک کشش تھی جو جی ایم کو فیصل کی طرف کھینچی تھی۔ وہ ملتان صرف دو دن کے لیے آیا تھا۔ پھر اس نے ناردن ایریاز چلے جانا تھا۔ جہاں اس کے باقی دوست چھٹیاں گزارنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ فولنگ کرنے کے بعد وہ فیصل کو بتا دینا چاہتا تھا لیکن پھر وہ رک گیا۔ مزید دو دن کے لیے۔ اگلے

دن اس نے میڈیکل کالج کی مسجد میں فیصل کو بتا دینے کا ارادہ کیا لیکن فیصل نے خود اسے مخاطب کیا اس کی نماز کی تصحیح کے لیے اور پھر جی ایم نہیں بتا سکا۔ بس پھر جی ایم کو کشش نے اس قدر مجبور کیا کہ ہر دم موج مستی کرنے والا جی ایم چار مہینے فیصل کے لیے ملتان میں ایک ہوٹل میں گزارنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ دوست بن گئے۔ جی ایم کو فیصل کی عادات اتنی اچھی لگیں کہ وہ تبدیل ہوتا گیا۔ سگریٹ ترک کر دیا۔ دوسری لغویات بھی ترک کر دیں۔ جب جی ایم نے فیصل کو بتایا تھا کہ وہ دونوں بھائی ہیں تو فیصل حیران ہوا تھا۔ کتنی دیر اسے گلے لگایا تھا۔ جی ایم کو ماں سے بھی ملوایا۔ مگر اس نے جان بوجھ کر نہیں بتایا کہ جی ایم کون ہے، شمع تھوڑی بہت چونکی ضرور تھی۔ جی ایم کی شکل تھوڑی بہت سعد سے مشابہہ تھی خصوصاً آنکھوں کی بناوٹ لیکن فیصل نے جھوٹ بول کر شمع کو مطمئن کر دیا تھا۔

''اچھا بھائی، محبت کا لفظ میرے لیے بے کار تھا، مجھے زندگی میں کبھی کسی سے محبت محسوس نہیں ہوئی حتیٰ کہ مما اور ڈیڈ سے بھی کوئی خاص نہیں لیکن مجھے اب یہ کہتے ہوئے کوئی عار نہیں کہ مجھے تم سے محبت ہے اور تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔'' ایئر پورٹ پر جی ایم نے فیصل کے گلے لگتے ہوئے کہا تھا۔

فیصل مسکراتا رہا۔

''مجھے بھی تم سے محبت ہے۔ میں بھی تمہیں بہت مس کروں گا۔''

''لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب میں ڈیڈ کو لے کر آؤں گا۔''

''زبردستی نہیں لے کر آنا۔ وہ آنا چاہیں تو بے شک لے آنا ورنہ میں اور امی ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔'' فیصل نے کہا۔

''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اب تم سے ملنے ہی اس وقت آؤں گا جب ڈیڈ میرے ساتھ ہوں گے اور وہ اپنی مرضی سے آئیں گے۔'' جی ایم نے مسکراتے ہوئے فیصل کو ایک بار پھر الوداع کہا۔

''کونل کے بارے میں بھی سوچ لینا، اچھی طرح۔'' بیگ لے کر جاتے ہوئے جی ایم لمحے بھر کو رکا تھا اور مڑ کر کہا تھا۔

''چھوٹے ہو تو چھوٹے بن کر رہو، بڑا بننے کی ضرورت نہیں، فی امان اللہ۔'' فیصل نے تیور دکھائے اور ہاتھ ہلا کر الوداع کیا۔ جی ایم نے بھی ہاتھ ہلایا اور پھر فیصل وہاں پر تب تک کھڑا رہا تھا جب تک جی ایم نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا تھا۔

❀❀❀

جی ایم کو یہ بات سونیا کے سامنے نہیں کرنی چاہئے تھی اور یہ اس کی غلطی تھی۔ ملتان سے واپسی کے بعد یہ اس کی گھر میں پہلی صبح تھی اور دن بھی اتوار کا تھا۔ سو سعد اور سونیا بھی گھر پر تھے۔

ناشتے کی ٹیبل پر ہی جی ایم نے سعد سے بات کرنے کا سوچا تھا۔

اس روز عموماً ناشتے کے بعد سعد ٹیبل پر ہی بیٹھ کر تفصیل سے اخبار پڑھتا تھا۔ جب کہ سونیا لان میں چہل قدمی کرتی۔ موڈ بنتا تو پودوں کو پانی بھی دے دیتی۔ ویسے اس لان کی دیکھ بھال کے لیے ایک کل وقتی مالی موجود تھا۔

لیکن اس سنڈے کو سونیا ناشتہ کرنے کے بعد لان کی طرف نہیں گئی۔ کچھ سستی سے بیٹھی رہی۔ جی ایم ناشتے سے فارغ ہوا۔ سعد اس سے پہلے ہی ناشتہ کر چکا تھا اور اب پوری دلچسپی سے اخبار پڑھ رہا تھا۔

جی ایم کو قدرے نامناسب تو لگا، ماں کے سامنے بات کرنا لیکن پھر اس نے اپنی سوچ جھٹک کر بات کرنے کا سوچا۔

''کچھ نہیں ہوتا، مما ویسے بھی کتنی نائس ہیں۔'' بات شروع کرنے سے پہلے جی ایم نے سوچا۔

''ڈیڈ کون سی ایسی خبر ہے جو آپ اتنی دلچسپی سے پڑھے جا رہے ہیں۔''

''بس کوئی خاص نہیں۔'' سعد نے سرسری سا جواب دیا تھا۔

''وہ میں نے آپ سے ایک بات کرنی تھی۔'' جی ایم نے ماں کو دیکھا۔ سونیا کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے ایک توازن کے ساتھ سانس لیے جا رہی تھی۔

''کرو برخوردار کسی نے تمہیں منع تو نہیں کیا ہوا۔''

''بہت خاص بات ہے۔''

''کوئی لڑکی پسند آ گئی ہے کیا؟'' سعد نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ اخبار ہنوز سامنے پڑی تھی۔

''مجھے تو کوئی پسند نہیں آئی لیکن آپ سے پوچھنا تھا کہ آپ کو کبھی کوئی پسند آیا تھا؟'' جی ایم نے ٹھہر ٹھہر کر کہا تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر بولنا اس کی طبیعت میں کچھ عرصہ پہلے شامل نہیں تھا لیکن فیصل کے بولنے کے انداز سے وہ متاثر ہوا تھا اور تبدیلی خود بخود آ گئی تھی۔

سعد نے لمحہ بھر میں نظریں اٹھا کر جی ایم کو دیکھا۔ اسی لمحہ سونیا نے بھی آنکھیں کھولی تھیں اور ایک جھٹکے سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"مجھے..." سعد کی آنکھوں کے سامنے برسوں پرانی شمع کی دھندلی سی تصویر اُمڈ آئی تھی۔ بائیس سال عکس دھندلا کرنے کے لیے بہت ہوتے ہیں۔

سعد نے نظر اٹھا کر سونیا کی طرف دیکھا۔ سونیا اسے ہی گھور رہی تھی۔ یہ سونیا کی خواہش تھی کہ ماضی کے بارے میں بچوں کو نہ بتایا جائے۔

"میری اور تمہارے ڈیڈ کی باتیں اب پرانی ہوگئیں۔ تم اپنی بات کرو، تمہیں کوئی پسند ہے تو ہمیں بتادو۔" سونیا نے مسکراتے ہوئے کہنیاں ٹیبل پر ٹکادیں۔

جی ایم کو ماں کے بولنے کی امید نہیں تھی۔ جی ایم نے ماں کی طرف دیکھا۔ باپ سے دس بارہ سال بڑی ہونے کے باوجود وہ اس کے باپ کے ساتھ بہت خوب لگتی تھی۔ جی ایم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ گھما پھرا کر اس سے بات نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے موزوں الفاظ کا انتخاب کرکے اس نے بات شروع کی۔

"میں نے یہ چار مہینے ناردرن ایریاز میں نہیں گزارے، ملتان میں گزارے ہیں اور میں شمع آنٹی سے بھی ملا ہوں۔"

سعد اور سونیا کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ششدر نظروں سے دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر جی ایم کو۔

"ملتان کیوں گئے تھے؟" سونیا کے تیور بگڑ گئے۔

"آپ شمع آنٹی سے کیوں نہیں ملتے؟" جی ایم کے پاس ماں کو مطمئن کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا البتہ باپ سے پوچھنے کے لیے بہت کچھ تھا۔

"جی ایم میں نے کچھ پوچھا ہے؟" سونیا کے تیور مزید بگڑے تھے۔

"سوری مما میں نے آپ سے بات چھپائی۔ میں تو ایڈونچر کرنے گیا تھا لیکن......" جی ایم اتنا کہہ کر چپ کر گیا۔

سونیا کا دل تو کیا کہ جی ایم کو کھری کھری سنادے۔ اگر اسے پتا چل گیا تھا تو تعلقات بڑھانے کے لیے وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی لیکن غصہ دکھانے کی بجائے سونیا نے کنٹرول کیا اور یہی تو خاص بات تھی سونیا میں۔

"کیسی ہے شمع؟" سونیا نے اپنا لہجہ ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا۔

"اچھی ہیں۔" جی ایم نے باپ کو دیکھا۔

سعد نے سر جھکایا ہوا تھا۔ کتنے عرصے بعد شمع موضوع سخن بن گئی۔ سالوں بعد۔ سعد کا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔

"واقعی وہ ایک اچھی خاتون ہے اور بیٹا، جہاں تک تمہارے ڈیڈ اور میرے ان سے نہ ملنے کی بات ہے تو وہ ہم سے تعلق نہیں رکھنا چاہتیں۔ میں تو خود چاہتی تھی کہ ہم ساتھ رہیں لیکن اب تو بات بہت پرانی ہوگئی ہے، بیس بائیس سال ہوگئے۔ شمع اپنی جگہ خوش ہوگی اور ہم اپنی جگہ خوش زندگی بسر کر رہے ہیں۔" سونیا نے بالوں کو مسکراتے ہوئے جھٹکا دیا تھا۔

جی ایم باپ سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن باپ تو خاموش تھا اور ماں بولے جا رہی تھی۔

"آپ کو شمع آنٹی پر ترس نہیں آیا، بائیس سال ہوگئے ہیں ان کو اکیلے۔" جی ایم نے ایک بار پھر براہِ راست باپ کو مخاطب کیا۔

"خدا سے ڈر نہیں لگتا آپ کو۔" خدا کی باتیں اس نے فیصل سے سیکھی تھیں۔ سونیا نے حیرت سے جی ایم کو دیکھا، اس سوال نے اسے حیران کر دیا تھا۔ کبھی کبھار نماز پڑھنے والا جی ایم خدا سے ڈرنے کی باتیں کر رہا تھا۔

"اسی سے تو ڈر لگتا ہے، اسی لیے تو شمع سے نہیں ملتا میں شمع سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ بیٹا تمہاری عمر کا تھا جب سے مجھے شمع اچھی لگتی تھی لیکن ہر چیز کا ایک تقاضا ہوتا ہے، محبت کے بھی تقاضے ہیں۔ شمع مجھ سے نہیں ملنا چاہتی، تمہیں شاید پتہ نہیں کہ میری دوسری شادی کو اس نے قبول نہیں کیا۔ ایک جائز کام تھا دوسری شادی لیکن...... بہرحال نہ ملنے یا ساتھ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ شمع کو ضرورت نہیں، مجھے تو آج بھی اس سے محبت ہے۔ شمع نے مجھ سے قسم لی تھی...... وعدہ لیا تھا مجھ سے کہ میں اس سے اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک وہ خود نہیں چاہے گی۔ وہ اس قدر انا پرست نکلی ہے کہ بیس سال سے اوپر ہونے کو ہیں ایک بار بھی نہیں اس نے پکارا۔ وہ پکارتی، اشارہ کرتی تو میں اڑتا ہوا چلا جاتا۔ بتاؤ اب میں کیا کرسکتا ہوں۔"

سعد بولتا گیا اور سونیا کی رکی ہوئی سانسیں بحال ہوتی گئیں۔

باپ کی باتیں سن کر جی ایم کو حد درجے افسوس ہوا تھا۔

"آپ اپنے آپ پر ترس کھا سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر جی ایم اٹھ کھڑا ہوا اور کرسی گھسیٹ کر چلا گیا۔

جی ایم کے جانے کے بعد سعد نے ایک کہنی میز پر ٹکائی اور بند آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

"شمع" زیر لب اس نے نام لیا تھا۔

سونیا پُروقار انداز میں چلتی ہوئی آئی اور سعد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا دبایا۔

"ریلیکس سعد!"

"شمع کو کم از کم ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" سعد نے مدھم آواز میں کہا تھا۔

"چھوڑو دفع کرو تم لو یہ جوس پیو۔" سونیا نے پاس پڑے جوس کے جگ میں سے جوس گلاس میں انڈیلا تھا اور سعد کے پاس میز پر رکھا تھا لیکن سعد نے آنکھوں پر سے ہاتھ نہیں ہٹایا تھا۔

صرف ایک بار کی گفتگو سے جی ایم کو پتہ چل گیا تھا کہ سعد کو اب شمع کی ضرورت نہیں۔ وہ شاید خود بھی شمع سے رابطہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی اسی زندگی میں خوش تھے کسی وجہ سے وہ اپنی زندگی میں انتشار لانے کے قائل نہیں تھے لیکن پھر بھی وہ باپ سے ایک بار مزید بات کرنا چاہتا تھا، تفصیل سے اپنی تسلی کے لیے۔

"زبردستی نہیں لے آنا۔ وہ آنا چاہیں تو بے شک لے آنا ورنہ میں اور امی ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔" فیصل کی اس سے ملتی جلتی باتیں بھی جی ایم کو یاد تھیں۔ اگر صورتِ حال ایسی تھی جیسی کہ پہلی گفتگو سے جی ایم پر واضح ہوئی تھی تو وہ خود بھی فیصل اور اس کی ماں کی زندگی میں بھونچال نہیں لانا چاہتا تھا سو کچھ دنوں بعد اس نے پھر سے بات کرنے کی ٹھانی لیکن اس کی نوبت نہ آئی۔ اس سے پہلے ہی اس کی مما نے خم ٹھونک لیے۔

"دیکھو جی ایم تم چھوٹے ہو، بڑوں کے معاملات میں دخل مت دو۔ شمع بے شک نائس لیڈی ہے لیکن ایک تو وہ ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، دوسرا اب تو میں خود بھی اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ اسی لیے اپنے ڈیڈ سے کسی قسم کی ایموشنل بات مت کرنا۔ تمہارے ڈیڈ نے مجھے چنا ہے، اب اگر تم انہیں ڈسٹرب کرو گے اور وہ راضی ہو جاتے ہیں تب بھی انہیں ایک کو چننا ہوگا مجھے یا شمع کو اور اگر تم میرا گھر بکھیر کر کسی اور کو لانا چاہتے ہو تو موسٹ ویلکم۔"

"لیکن مما آپ کو کیا اعتراض ہے شمع آنٹی کے آنے سے۔ اگر ڈیڈ کی دو بیویاں ہیں تو انہیں دونوں بیویوں کو یکساں رائٹس دینے چاہئیں۔"

"یہ رائٹس کی بات تو کہیں اور کرنا میں سب کچھ جانتی ہوں۔ بس میں نہیں رہنا چاہتی تو بس نہیں رہنا چاہتی، شمع خود بھی نہیں رہنا چاہتی۔" سونیا نے جی ایم کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "آئی ہوپ تم بات کو اچھی طرح سمجھ چکے ہو گے۔" سونیا مسکرائی تھی۔ "اور یہ میرا فائنل فیصلہ ہے کہ شمع یا میں، سعد کو ایک کو چننا ہوگا اور یہ مت سوچنا کہ مجھے تمہارے ڈیڈ سے اس قدر محبت ہے کہ میں کمپرومائز کر لوں گی۔" سونیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اور ہاں اس گفتگو کے بارے میں اگر تم اپنے ڈیڈ کو بتا کر مجھے اپنے ڈیڈ کی نظروں میں گرانا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔ آج تک وہ مجھ سے کسی بات پر خفا نہیں ہوئے اور اب اس عمر میں خفا ہوں گے تو مجھے اپنے بیٹے کے فعل پر افسوس ہوگا۔"

جی ایم چپ چاپ ماں کو دیکھتا رہ گیا۔ اس کی ماں کچھ جذباتی طور پر اسے بلیک میل کر رہی تھی۔ ظاہر ہے ایسی باتیں بندے کو خود غرض بناتی ہیں۔

ہر طرف ایک دباؤ سا تھا۔ جی ایم نے اپنے باپ سے دوبارہ بات نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"اللہ ہے نا، سب ٹھیک کرنے کے لیے۔" جب اپنا آپ اور اپنے آپ سے ملحق چیزیں سامنے آ جاتی ہیں جو ہمیں حقیقت سے دور کرتی ہیں اس سے نظریں چرانے پر مجبور کرتی ہیں تو ہم اللہ کو یاد کر کے کہتے ہیں وہ بہتری کرے گا جی ایم نے بھی یہی کیا تھا۔

❁❁❁

یونہی چار پانچ سال مزید گزر گئے اور پتا بھی نہ چلا۔ جی ایم فیصل سے رابطے میں رہا۔ بھائی کی محبت کھینچتی تھی۔ ایک دو بار اس نے باپ کو فیصل کے بارے میں بتانا چاہا لیکن پھر فیصل کی باتوں اور باپ کو اپنے آپ میں گم دیکھ کر اس نے بات کرنے سے گریز کیا۔ بتا بھی دیتا تو جواب میں اگر وہ کہہ دیتے کہ وہ شمع کا سہارا ہے۔ میں اب شمع کے سہارے پر کیوں نظریں جماؤں تب اس کا دل باپ کی طرف سے یقیناً بُرا ہوتا۔ سو وہ چپ رہا اور یہاں تک کہ الیکٹریکل انجینئرنگ کی ڈگری اس کے ہاتھوں میں آ گئی۔ وہ سب کے ساتھ خوشی شیئر کر رہا تھا، اس سے پہلے جی ایم فیصل کو فون کر کے بتاتا، اتفاق سے فیصل کا خود فون آ گیا۔

"یار تُو بھول ہی گیا، شکل ہی دکھا دے۔" فیصل گلہ کر رہا تھا۔

"بس شکل کیا پورا خود کو دکھاؤں گا ایک اچھی خبر ہے۔"

"اچھا تو خبر تو میرے پاس بھی ہے، لیکن تم سناؤ پھر میں بتا دیتا ہوں۔"

"نہیں پہلے تم بتا دو۔"

"تم بتانے والے تھے جی ایم!"

"لیکن اب تم بتا رہے ہو۔" جی ایم نے آرام سے کہا۔

"اچھا بابا بتاتا ہوں ضدی کہیں کے میری شادی ہو رہی ہے۔"

"واہ بھئی واہ مبارک ہو، کوئل سے ہی نا؟"

"ہاں کوئل سے ہی ہو رہی ہے، سو دفعہ پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ رشتہ پکا ہو گیا ہے اور اب شادی کی ڈیٹ بھی کنفرم ہو گئی ہے، اب تم بھی بتاؤ جو تم نے بتانا ہے۔" جی ایم نے بھی بتا دیا کہ وہ مکمل انجینئر بن چکا ہے۔

"میری شادی پر آؤ گے نا؟" فیصل نے اسے مبارک باد دینے کے بعد پوچھا۔ جی ایم

نے شادی کی تاریخ پوچھی۔ فیصل نے ایک مہینے بعد کی تاریخ بتائی۔ تاریخ سن کر جی ایم مایوس ہوا۔ وہ فیصل کی شادی اٹینڈ کرنا چاہتا تھا لیکن کر نہیں سکتا تھا۔

''یار میں کوشش کروں گا۔ اصل میں تم جو ڈیٹ بتا رہے ہو اس سے ایک دن پہلے ہماری بہن ماریہ کی شادی کی ڈیٹ فائنل ہو چکی ہے۔ بلکہ کارڈز بھی چھپ کر آ چکے ہیں۔ میں خود تمہیں تین چار دن تک انوائٹ کرتا۔ اب......''

''کوئی مسئلہ نہیں، تم دل جمعی کے ساتھ ماریہ کی شادی اٹینڈ کرو بلکہ میرے حصہ کی بھی کر لینا۔ کوئل کے والد بہت بیمار ہیں۔ وہ جلدی شادی چاہ رہے ہیں۔ اس لیے میں بھی ڈیٹ آگے پیچھے نہیں کر سکتا۔ خیر بتاؤ اس کی شادی کس کے ساتھ ہو رہی ہے، صائم سے؟'' جی ایم نے اسے کچھ عرصہ پہلے بتایا تھا۔

''نہیں یار، وہ رشتہ ریجیکٹ کر دیا مما نے۔ صائم کی کم ایجوکیشن کی بناء پر۔'' بتاتے ہوئے جی ایم کی آواز خود دھیمی ہو گئی۔ صائم اسے بھی پسند تھا۔

''یہاں کراچی کے بہت بڑے صنعتکار ہیں، کلیم شاہ صاحب ان کا بیٹا ہے، واصف۔ ایم بی اے کیا ہوا ہے نیو یارک سے، یونیورسٹی کا نام تو مجھے نہیں پتا اور وہ اپنی انڈسٹری کی مین برانچ میں مینجمنٹ کا کام سنبھالتا ہے۔''

''چلو ٹھیک، جو ہوا بہتر ہے۔''

سیل فون جیب میں ڈالنے کے بعد جی ایم نے فیصل اور ماریہ دونوں کے خوش رہنے کی دل سے دعا کی۔

❁❁❁

شمع خوش خوش ادھر اُدھر جا رہی تھی۔ چھوٹا سا گھر تھا اور تھوڑے سے مہمان تھے۔ بس یہی محلے والے۔ شمع کو اپنے ان محلے والوں سے بے حد محبت تھی۔ کتنا ان لوگوں نے اس کا خیال رکھا تھا۔ وہ اس وقت توقیر کی بیوی کے ساتھ کھڑی تھی۔

فربہی مائل توقیر کی بیوی سات بچوں کی ماں تھی۔ اس نے شمع کو بے حد پیار دیا تھا۔ جب کبھی شمع بیمار ہوئی اس کی تیمارداری کی۔ فیصل اور شمع کے لیے کھانا پکایا۔ گھر میں کوئی اچھی چیز بناتی تو شمع کو ضرور بھیجتی۔ ایک بار اس نے ٹفن بھر کر گجریلا بھیجا تھا۔ شمع کو پاکیزہ یاد آ گئی۔ خوشبو والا گجریلا پاکیزہ بہت اچھا بناتی تھی۔

''میری بہن پاکیزہ بہت اچھا گجریلا بناتی تھی، مجھے ایسے لگا کہ پاکیزہ کے ہاتھ کا بنا ہوا ہو۔'' برتن واپس کرتے ہوئے شمع کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔

''لو تو میں تمہاری بہن ہی ہوں۔ تم مجھے پاکیزہ ہی سمجھ لو بلکہ تم مجھے ستارہ کی جگہ پاکیزہ ہی بلایا کرو۔'' توقیر کی بیوی نے شمع کو مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا کیا تم نے ٹینٹ کی کرسیاں منگوا لیں، دریوں پر بیٹھنے سے تو کپڑوں کی استری خراب ہوتی ہے۔ کپڑوں کی شو ختم ہو جاتی ہے اور مل بیٹھنے کا مزہ بھی۔'' وہ تیز تیز بولتی جا رہی تھی۔ ''ہائے شمع ساڑھی تو بہت جچ رہی ہے۔ ہائے اللہ نظر نہ لگا دوں۔'' ستارہ نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

شمع مسکرا دی۔ اس نے آج اپنے فیصل کی خاطر ساڑھی باندھی تھی۔ بیٹے نے خود لاڈ پیار اور چاؤ سے خریدی تھی۔

''میری پیاری امی، میری شادی ہے نا میری مرضی چلے گی۔ آپ کے لیے شادی اور ولیمے کا جوڑا میں خود خرید لاؤں گا اور وہ آپ کو ہر حال میں پہننا ہوگا۔'' فیصل نے لاڈ سے کہا تھا اور قسمت سے کہ وہ ایک مالٹے رنگ کی ساڑھی اور ایک گلابی رنگ کی شلوار قمیص لایا تھا۔ پچھلے ستائیس سالوں میں اس نے یہ دو رنگ بالکل نہیں استعمال کیے تھے۔ گلابی رنگ سعد کی پسند تھا اور مالٹا رنگ اس کی اپنی پسند۔ اپنی پسند کا رنگ کیوں نہیں استعمال کیا تھا اس کا شمع کو خود بھی نہیں پتا تھا۔

بیٹے کی خوشی تھی۔ سو اس نے جھجک کر ساڑھی باندھ لی اور سوٹ بھی سلوا لیا اور اب وہ ساڑھی پہنے کھڑی تھی۔ صحن میں کل پچیس کرسیاں تھیں۔ پانچ کرسیاں برآمدے کی دیوار کے ساتھ بھی لگا دی گئی تھیں اور کل مہمان عورتوں کی تعداد بیس تھی۔ عورتوں کے ساتھ بچے بھی تھے۔

''میرے ساتھ کھڑی رہو گی یا آگے بھی مہمانوں کے پاس جاؤ گی۔ مہمان کیا سوچیں گے۔'' ستارہ نے کہا تو شمع ساڑھی کا پلو سنبھالتی (جو مشکل سے سنبھالا جا رہا تھا) آگے بڑھ گئی۔

❁❁❁

بہت بڑا میرج ہال تھا۔ کراچی کا سب سے بڑا میرج ہال۔

سعد بلیک کلر کے تھری پیس میں تھا۔ یہ تھری پیس کراچی کے مشہور اور مہنگے ترین بوتیک سے سلوایا گیا تھا۔ سعد خاص طور پر آج بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آیا تھا۔ ساتھ سونیا کھڑی تھی اس نے چمکتا ہوا سیاہ سوٹ پہنا ہوا تھا اور بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ ہر مہمان کو دیکھ کر کہتے ہوئے وہ بالوں کو لہراتی پچھلے چند سالوں میں بال لہرانے کی عادت نے بال جھٹکنے کی عادت کو ری پلیس کر دیا تھا۔

سعد پچاس سے اوپر کا تھا اور سونیا ساٹھ سے اوپر کی لیکن دونوں ہی اپنی عمر سے بے حد کم محسوس ہوتے تھے۔ آخر اداکاروں اور اداکاراؤں کی طرح انہوں نے اپنے آپ کو مین ٹین رکھنے کی کوشش کی تھی۔

زندگی کا ایک اور مرحلہ آ گیا تھا۔ اپنی بیٹی کی شادی کر رہے تھے اور اس مرحلے کو بھی دونوں بھرپور طریقے سے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

''سعد!'' سونیا نے پکارا۔

''ہوں۔''

''ماریہ کی شادی ہو رہی ہے۔'' سونیا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''اوہ اچھا میں سمجھا ہماری شادی ہو رہی ہے۔'' سعد اپنی بات پر خود ہی ہنس پڑا۔

''اوہ سعد ہماری بیٹی کی شادی ہو رہی ہے۔''

''ڈیئر مجھے پتا ہے تمہاری نشاندہی کا مقصد؟'' سعد نے آرام سے پوچھا تھا۔

''ہم بوڑھے ہو رہے ہیں سعد، ہماری بیٹی کی شادی ہے، ناؤ وی آر اولڈ پرسن۔'' سونیا ہنستی گئی۔

''ڈیئر وائف، پچاس کے بعد بندہ ویسے ہی بوڑھا ہوتا ہے اگر ہم آج تسلیم کرلیں تو بُرا تو نہیں۔''

''بالکل بُرا نہیں، میں اور پیٹیز لے کر آتی ہوں۔''

''اور کتنا کھاؤ گی۔ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے کھائے جا رہی ہو۔ موٹا ہونے کا ارادہ ہے۔''

''مجھے کچھ مت کہو، بس کھانے دو آئی ایم این اولڈ لیڈی اور آج میری بیٹی کی شادی ہے۔ میں جی بھر کر کھاؤں گی اور ہر چیز کھاؤں گی۔'' سونیا مسکراتے ہوئے اس طرف گئی جہاں ٹیبل پر کھانے پینے کی بہت سی چیزیں پڑی تھیں۔

''ٹھہرو، مجھے کہاں اکیلا چھوڑ کر جا رہی ہو۔ میں نے بھی آج بہت کھانا ہے۔ کتنے سال ہو گئے۔ پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔'' سعد بھی مسکراتے ہوئے سونیا کے قدم سے قدم ملانے لگا۔ ماریہ کی شادی کی رات سونیا اور سعد نے ہنس ہنس کر بے تحاشا کھایا اور ایک دوسرے کو بھی کھلایا۔ سب لوگ ان کی محبت پر رشک کر رہے تھے ماں باپ کو خوش دیکھ کر جی ایم کو بھی بہت اچھا لگ رہا تھا لیکن ساتھ میں تین چار بار یہ بھی خیال آیا تھا کہ شمع آنٹی وہاں فیصل کی شادی پر کس طرح خوش ہو رہی ہوں گی۔

❁❁❁

ویسے تو فیصل اس قدر جلدی شادی کا قائل نہیں تھا لیکن حالات ہی کچھ ایسے بنے کہ بس، کوئل کے والد سکندر ریاض کی طبیعت کو خراب ہوئی تو سنبھلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ انہوں نے جلدی شادی پر اصرار کیا تو شمع نے بھی ہامی بھر لی۔ البتہ فیصل بعد میں ماں سے ناراض ہوا تھا کہ سال دو سال رہنے دیتے لیکن بہر حال ہاؤس جاب کے درمیان ہی بخیر و عافیت شادی ہو گئی۔

''سال دو سال لیٹ ہو جاتی تو شاید تمہیں کچھ نہ کچھ سہولیات تو دے سکتا۔'' شادی کے بعد فیصل نے کوئل سے کہا تھا۔

''میں سہولیات کا انتظار کر سکتی ہوں لیکن تمہارا انتظار سوہانِ روح تھا سو جو ہوا اچھا ہوا۔'' کوئل نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تھا۔

''پھر بھی تم سہولیات میں رہنے کی عادی ہو۔ میں نے تمہارے گھر اے سی بھی دیکھا تھا۔''

''اُف فیصل وہ سپلٹ اے سی ابھی ڈیڑھ سال پہلے لگا تھا۔ مانا کہ اب ہمارے حالات تم سے قدرے بہتر ہیں لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تم اسے ایشو بنا کر میرا رومانٹک موڈ خراب کرو۔'' کوئل نے جھنجلا کر کہا تھا۔

فیصل کو اچھا لگا تھا۔

''ان شاء اللہ سال بھر تک بس۔'' فیصل نے سوچا تھا۔

کوئل کے آنے سے شمع کو بھی گھر میں رونق سی لگنے لگی گئی۔ گھر، گھر لگنے لگ گیا۔

''امی میں روٹیاں پکاتی ہوں۔'' کوئل صبح صبح کچن میں آئی اور شمع کو اس نے امی کہہ کر پکارا۔

''نہیں بہو، تم جا کر تیاری کرو، ہسپتال جانے کی۔ میں نے بس ناشتہ تیار کر لیا ہے۔'' شمع نے کہا تھا۔

کوئل نے اصرار کیا لیکن شمع نہ مانی، شمع کوئل کو کوئی کام نہ کرنے دیتی۔ بڑی مشکلوں اور منتوں سے رات کے کھانے کا ذمہ کوئل اپنے سر اٹھانے میں کامیاب ہوئی۔

''تم اپنے ہاسپٹل اور سیکھنے پر توجہ دو ابھی میری ہڈیوں میں دم ہے بعد میں تم سے اور فیصل سے ہی خدمت کروانی ہے۔'' شمع نے بارہا کوئل سے کہا تھا۔

''تم تو بائیک پر اپنے بھائی کے ساتھ کالج آتی تھیں اب بس پر جانا عجیب تو لگتا ہو گا۔'' فیصل نے ایک دن کہا تھا۔

"مجھے تم عجیب لگتے ہو جب ایسی باتیں کرتے ہو۔" کوئل نے کہا۔ اسی طرح ایک دن وارڈ میں جب وہ کام سے فارغ ہوکر بیٹھے تھے تب فیصل نے کوئل سے کہا تھا۔

"تم اتنی خوبصورت کیوں ہو۔"

"اگر خوبصورت نہ ہوتی تو تم مجھ سے شادی کرتے؟"

"اممم...... نہیں۔"

"تمہاری بھی اتنی ڈیشنگ پرسنیلٹی نہ ہوتی تو میں بھی ہرگز شادی نہ کرتی۔"

"اوہ حسن پرست!"

"تو تم کیا ہو؟"

"میں اللہ کا بندہ!"

"وہ تو میں بھی ہوں۔" کوئل نے جھٹ جواب دیا۔

"اچھا چھوڑ اِدھر اُدھر کی، یہ بتاؤ کیا ہے؟" فیصل نے کوئل کے بیگ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"تمہیں اِدھر اُدھر کی باتیں بُری لگتی ہیں۔ میں تم سے بات نہیں کرتی۔"

"میرا مطلب تھا چھوڑو میری اِدھر اُدھر کی باتیں۔" فیصل نے فوراً وضاحت کی تھی۔

"اوہ اچھا پھر ٹھیک ہے۔" کوئل فوراً راضی ہوگئی۔

"آں ہاں...... کیا کہا؟"

"کچھ نہیں، کچھ نہیں، تم بتاؤ یہ کیا ہے؟"

"یہ بیگ ہے۔" کوئل نے اپنے بیگ کو اوپر نیچے کیا تھا۔

"وہ تو محترمہ مجھے بھی پتا ہے، میرا مطلب ہے کہ یہ کالج بیگ ہے یا ہینڈ بیگ؟"

"یہ تو میں نے سوچا نہیں، میں تو دونوں مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہوں، تم جو چاہو سمجھ لو۔"

"ہائے تم نے کبھی سوچا نہیں، فرسٹ ایئر سے ہاؤس جاب تک تم نے اس طرح کے چار بیگ بدلے ہیں۔ بیگ بدلتے رہے اور میں اس نتیجے پر نہ پہنچ سکا کہ یہ ہینڈ بیگ ہے یا کالج بیگ۔" فیصل نے مصنوعی آہ بھری تھی۔

"تو تم فرسٹ ایئر سے مجھ پر غور کیا کرتے تھے۔" کوئل مسکرائی تھی۔

"تمہیں کون توجہ دیکھتا تھا میں تو بیگ کی بات کررہا ہوں۔"

"بات تو ایک ہی ہے۔" کوئل ہنس پڑی۔

"نہیں، نہیں، نہیں۔" فیصل نے پُرزور انداز میں تردید کی تھی لیکن کوئل ہنستی جارہی تھی۔

"نہیں، نہیں، نہیں، ہاں!" نہیں نہیں کرتے جیسے ہی فیصل نے ہاں کی، کوئل کی ہنسی کو خودبخود بریک لگ گئی۔

"آئی لو یو۔" فیصل نے مدہم آواز میں کہا تھا۔

"شٹ اپ فیصل، یہ ٹائم ہے کوئی سن لے گا۔"

"تو پھر ٹائم بتادو ایسی باتوں کا۔"

"شٹ اَپ!" کوئل نے جھینپتے ہوئے کہا اور فیصل قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

❀❀❀

"یہاں تو تم بالکل لڑکا لگ رہی ہو۔" فیصل نے تصویر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ آج ان دونوں کی چھٹی تھی اور کوئل اسے اپنے بچپن کی تصویریں دکھا رہی تھی۔ جس تصویر پر فیصل نے تبصرہ کیا تھا اس میں آٹھ نو سالہ کوئل پینٹ شرٹ پہنے سائیکل چلا رہی تھی۔

"آپ سے کمنٹس نہیں مانگے، چپ چاپ تصویریں دیکھیں۔" کوئل نے البم میں تصویر الٹی تھی۔

"یہ ابو ہیں، یہ امی ہیں ان کے ساتھ میں اور احسان بھائی، یہ ہمارا فیملی فوٹو ہے۔"

فیصل نے تصویر کو غور سے دیکھا۔ سکندر صاحب اب تو کافی کمزور تھے لیکن تصویر میں کافی ہٹے کٹے تھے۔ ان کے چہرے پر داڑھی نے ان کی شخصیت بدل کر رکھ دی تھی لیکن تصویر میں وہ صرف مونچھوں والے تھے۔ فیصل سکندر صاحب کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ "پتہ ہے کوئل میں جب تمہارے فادر کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میں نے انہیں کہیں دیکھا ہے جیسے کوئی پرانی شناسائی ہے۔"

کوئل ہنس پڑی۔

"میری ابو سے شکل ملتی ہیں نا، مجھے دیکھ کر آپ کو ایسے لگا ہوگا۔"

"نہیں کوئل، مجھے لگتا ہے جیسے میں پہلے کبھی ان سے ملا ہوں۔" کوئل نے اس بار فیصل کی بات توجہ سے سنی۔

"فیصل تو پھر شاید کبھی زندگی میں کہیں پالا پڑا ہوگا، آپ کو یاد نہیں تو کبھی یاد آجائے گا۔ نہ بھی یاد آیا تو بھی سب ٹھیک ہے، چلیں آپ اگلی تصویریں دیکھیں۔" کوئل اسے اگلی تصویر دکھانے لگی لیکن فیصل پہلے کی طرح ارتکاز نہیں قائم کرسکا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ بھول رہا ہے۔

تصویریں دیکھ چکے تو کوئل چائے بنالائی۔ ایک کپ ہال کمرے میں موجود شمع کو بھی دے آئی۔ شادی کے موقع پر شمع کے پاس اس وقت جو زیور تھا وہ اس نے کوئل کو پہنا دیا۔ گھر کو رنگ کروانے والی خواہش دل ہی میں رہ گئی تھی۔

ہال کمرہ شمع نے اپنے پاس رکھا تھا اور دوسرا کمرہ کوئل اور فیصل کے لیے مختص کر دیا۔ اب بھی وہ لوہے والی جیل جیسی سلاخوں کے سامنے اسٹول رکھ کر بیٹھا کرتی تھی۔ کبھی کڑھائی کرنے تو کبھی ویسے ہی اور جب کوئل شمع کو چائے دینے آئی تو شمع اسی طرح جیل نما سلاخوں والی کھڑکی کے سامنے بیٹھی کسی سوچ میں غرق تھا۔

''امی ایسے کیوں بیٹھی ہیں، کن سوچوں میں گم ہیں آپ؟'' کوئل کی آواز پر شمع چونکی تھی۔

''کچھ نہیں، بس ویسے ہی بیٹھی تھی۔ شکر ہے تم چائے لے آئی مجھے ویسے بھی چائے پینے کی خواہش ہو رہی تھی۔''

''اگر آپ چائے پینا چاہ رہی تھیں تو مجھے بلا کر کہہ دیتیں، ایک تو آپ غیریت بہت برتتی ہیں۔'' کوئل کے شکوہ پر شمع مسکرا دی۔

''اچھا آئندہ تمہیں کہہ دیا کروں گی۔'' شمع نے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ کوئل باقی دو کپ ایک چھوٹی سی ڈش میں لیے کھڑی تھی۔

''آپ ایسے ہی اکیلی بیٹھی بور ہو رہی ہیں۔ ادھر ہمارے کمرے میں آ جائیں بلکہ میں فیصل کو کہتی ہوں ہم آپ کے پاس اس کمرے میں آ بیٹھتے ہیں۔''

''نہیں، نہیں میں بور تو نہیں ہو رہی۔ تم جاؤ بیٹھو فیصل کے ساتھ بلکہ جب سے تم لوگوں کی شادی ہوئی ہے تم لوگ کہیں گھومنے پھرنے نہیں گئے۔ بڑی مشکلوں سے تو تم لوگوں کو چھٹی میسر ہوئی ہے، کہیں گھوم پھر آؤ۔'' شمع کی بات سیدھی جا کر کوئل کے دل کو لگی۔

''امی یہ تو آپ نے بڑی اچھی بات کی، میں ابھی فیصل سے جا کر کہتی ہوں کہ کہیں گھومنے پھرنے چلتے ہیں۔ آپ بھی تیار ہو جائیں اکٹھے چلتے ہیں۔''

شمع نے نظر اٹھا کر کوئل کو دیکھا۔ وہ بھولی تھی یا بن رہی تھی۔ ان دونوں کے ساتھ اس نے جا کر کیا کرنا تھا۔ لمحہ بھر میں شمع نے تجزیہ کر لیا۔ کوئل نہ بھولی تھی نہ بھولی بن رہی تھی۔ دراصل یہ محبت تھی جو کہہ رہی تھی کہ آپ بھی ساتھ چلیں۔

''نہیں میرا دل نہیں چاہ رہا۔ دل کر رہا ہے سو جاؤں تم لوگ چلے جاؤ میں پھر کبھی ساتھ جاؤں گی۔'' شمع نے خوبصورت انداز میں انکار کیا تھا۔

''چلیں جیسے آپ کی مرضی میں تو چاہ رہی تھی کہ.....''

''تم لوگ جاؤ، میرا دل نہیں چاہتا اور کیا چائے یہیں ٹھنڈی کرنی ہے، فیصل کو ہمیشہ بھاپ اڑاتی چائے پسند ہے۔''

''چلیں ٹھیک۔'' کوئل اپنے کمرے میں آ گئی۔

''فیصل ہم ہنی مون پر کب جا رہے ہیں؟'' لاڈ سے پوچھا تھا۔

''روپیہ نہ پلے، ہار لیں یا چھلے۔'' فیصل نے دوسرا گھونٹ بھرا۔

''اُف۔ ایک تو طنز بھی آپ بہت کرتے ہیں۔ اب ہنی مون کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم ضروری بہت دور دس پندرہ دنوں یا مہینوں کے لیے جائیں۔ ہم یہیں کہیں گھومنے پھرنے بھی تو جا سکتے ہیں اور اسے ہی ہنی مون سمجھ لیں گے۔ جب سے شادی ہوئی ہے آپ مجھے ایک مرتبہ بھی سیر و تفریح کے لیے کہیں نہیں لے کر گئے۔''

''سیدھی بات تو تم بھی نہیں کرتی، اب تمہاری باتوں میں چھپا مطلب جاننے کے لیے مجھے دانشور ہونا چاہیے، ڈاکٹر نہیں۔'' فیصل نے مسکراتے ہوئے ایک بار پھر کپ ہونٹوں سے لگایا تھا۔

اور تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بائیک پر بیٹھے ہنی مون منانے کے لیے جا رہے تھے، بائیک فیصل اپنے محلے کے ایک دوست سے لے آیا تھا۔

''دھیان سے بیٹھنا، اللہ کو بھی یاد کرتی رہنا۔ اپنی بائیک تو ہے نہیں اور اسی لیے میں کوئی اچھا بائیک رائڈر نہیں ہوں۔ ایکسیڈنٹ کی صورت میں ذمہ دار تم خود ہو گی۔''

''ہائے اللہ تو پہلے بتا دیتے۔ آپ کو بائیک ادھار مانگنے پر مجبور تو نہ کرتی۔ رکشے پر چلے جاتے۔'' کوئل کی خوفزدہ آواز فیصل کو سنائی دی اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ بہاؤالدین زکریا کے دربار پر پہنچے، سلام کرنے کی غرض سے رک گئے۔

''شکر ہے خدا کا ایکسیڈنٹ نہیں ہوا جب اپنی بائیک لیں گے تو آپ احسان بھائی سے سیکھیے گا۔ وہ بہت اچھا چلاتے ہیں۔''

''کوئل میں نے صرف تمہیں ڈرانے کے لیے کہا تھا ورنہ میں ٹھیک، ٹھاک چلا لیتا ہوں۔'' فیصل نے ہنس کر کہا۔

''اوہ۔'' کوئل نے سر پر ہاتھ مارا۔

''آپ نے میرے ہنی مون کا سفر کرکرا کر دیا۔ میں آپ کو چھوڑوں گی نہیں۔''

دربار میں فاتحہ خوانی اور دعا مانگنے کے بعد وہ دربار کے احاطے میں بیٹھ گئے۔ کئی

عقیدت مند بھی احاطے میں فاصلوں پر بیٹھے تھے۔ کوئل نے گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا ہالہ بنایا ہوا تھا اور ٹھوڑی گھٹنے پر ٹکا رکھی تھی جب کہ فیصل دربار کے گنبد پر بیٹھے کبوتروں کو دیکھ رہا تھا۔

''پتا ہے فیصل، میں یہاں پہلی بار آئی ہوں۔'' اس سے قبل فیصل اس سے پوچھتا کہ اس نے یہاں دربار پر آنے کی فرمائش کیوں کی وہ خود بول پڑی۔

''اصل میں ہمارے گھر کا ماحول پہلے بہت کھلا ڈُلا تھا۔ ابو بہت زیادہ کھلے ذہن کے تھے لیکن جیسے ہی وہ مذہب کی طرف متوجہ ہوئے تو پہلے تو گھر اور مسجد تک محدود رہے اور پھر سعودی عرب چلے گئے۔ احسان بھائی کو درباروں پر جانا کچھ خاص پسند نہیں تھا تو بس کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ میں ملتان میں رہنے کے باوجود پہلی بار یہاں آئی ہوں، کتنا اچھا ہے یہاں کا ماحول، کتنا سکون ہے۔ اللہ کے پیارے ولی جو دفن ہیں۔''

فیصل کوئل کو دیکھتا رہا۔ ویسے فیصل خود بھی چند بار یہاں آیا تھا۔ ''کچھ لوگ اولیاء سے عقیدت نہیں رکھتے نا۔ جیسے احسان بھائی لیکن مجھے ان سے عقیدت ہے۔''

کوئل نے فیصل سے نہیں پوچھا کہ اسے عقیدت ہے یا نہیں اور فیصل نے بھی خود نہیں بتایا۔

''میں اپنے اس ٹرپ کو خوب انجوائے کر رہی ہوں اور ہم جلد ہی ان شاء اللہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ جائیں گے اور امی کو بھی ساتھ لے جائیں گے، ٹھیک ہے نا۔'' فیصل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

***

جی ایم، جی ایم، جی ایم اور جی ایم۔ یہ نام سن کر اب اسے بُرا لگتا تھا۔ بے معنی سا نام۔ وہ اب چاہتا تھا کہ سب اسے غلام محی الدین بلائیں۔ اللہ کے دین کا غلام، اور اب وہ ایک بار پھر سے تصحیح چاہتا تھا۔ بعض اوقات ماضی میں جو کام ہم اچھا سمجھ کر کرتے ہیں، مستقبل میں وہ خود بُرا لگنے لگ جاتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اب سب اسے درست نام سے پکاریں۔ اس کے لیے اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب ایک بار پھر تصحیح کرے گا۔

''جی ایم نہیں، میرا نام غلام محی الدین ہے، غلام محی الدین اچھا لگتا ہے، اولڈ فیشن ہوا تو کیا ہوا مجھے یہی پسند ہے۔'' غلام محی الدین نے مسکرا کر کتنے ہی لوگوں کی تصحیح کی تھی۔ لوگ ہنسے تھے اور وہ مسکرایا تھا اور اسے یقین تھا کہ ایک بار پھر سب اسے غلام محی الدین بلائیں گے۔

***

ماریہ روتی ہوئی گھر آئی تھی اور جب سے آئی تھی وہ روئے جا رہی تھی۔ سونیا پریشان پریشان سی اسے چُپ کروا رہی تھی اور وہ چُپ ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بالآخر خوب رو لینے کے بعد اس نے جو کچھ ماں کو بتایا تھا وہ سونیا کے پاؤں تلے سے زمین کھسکانے کے لیے کافی تھا۔

''مما واصف نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے اور وہ کہتا ہے کہ اسے میری کوئی ضرورت نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ فضا ان کی پہلی اور آخری محبت ہے اور فضا سوتن کا بار نہیں اٹھا سکتی۔ سو اس نے ایک کا انتخاب کیا اور مجھے.....'' ماریہ نے اٹک اٹک کر بتایا تھا اور رونے لگ گئی تھی۔

بڑی مشکل سے سونیا نے خود کو سنبھالا اور پھر بیٹی کو دلاسہ دینے لگی۔ سعد آیا۔ وہ حیران و پریشان ہوا۔

''واصف کے گھر والوں نے کچھ نہیں کہا؟'' سعد نے پریشانی کے ساتھ بیٹی سے پوچھا تھا۔

''وہ کیا کہتے، واصف بہت زیادہ غصے میں تھا۔ واصف کی امی اور بہنیں تو مجھے روکتی رہیں لیکن جب واصف نے کہہ دیا کہ گھر سے نکل جاؤ تو پھر میں کیا کرتی۔''

ماریہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اب وہ رو نہیں رہی تھی۔

''تمہیں کیسے پتا چلا دوسری شادی کا، میرا مطلب ہے واصف کی پہلی شادی کا؟'' سعد نے دوسرا سوال پوچھا تھا۔

''فضا خود گھر آئی تھی، ویسے واصف کا میرے ساتھ شروع سے رویہ عجیب تھا۔''

''تو پھر تم نے پہلے ہمیں کیوں نہیں بتایا؟'' پوچھنے والی سونیا تھی۔

سعد نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا تھا۔ سعد کے نزدیک اس وقت یہ سوال غیر مناسب تھا۔

''کلیم شاہ صاحب کو پتا ہے کہ واصف نے تمہیں.....'' سعد نے اپنے آپ کو پُرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔

''پتا نہیں، جب واصف نے مجھے گھر سے جانے کا کہا تب وہ گھر پر نہیں تھے۔'' سونیا نے پریشان نظروں سے سعد کو دیکھا تھا۔ جو خود بھی پریشان پریشان سا بیٹھا تھا۔ بیٹی کی پریشانی ان دونوں کو اضطراب میں مبتلا کیے جا رہی تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے انہیں کچوکے لگا رہی تھی۔

***

"امی کپڑے ہاتھ پر مت دھویا کریں بلکہ آپ دھویا ہی مت کریں، میں ہوں نا۔ میں آج ہی اپنے جہیز کی واشنگ مشین نکالتی ہوں۔" کوئل نے شمع سے کہا تھا۔

"واشنگ مشین......" شمع کو کچھ یاد آیا تھا۔

"بیٹی ہاتھ پر کپڑے دھولیا کرو تم بھی۔ واشنگ مشین کی کیا ضرورت ہے؟" شمع جو قمیص دھو رہی تھی اسے دھوتی رہی۔ ساتھ میں باتیں بھی کر رہی تھی۔

"امی ضرورت کیوں نہیں؟ سہولت ہے واشنگ مشین۔ کتنی جلدی کپڑے دھل جاتے ہیں۔ فیصل آئیں گے تو میں انہیں کہوں گی وہ نکال دیں گے۔"

شمع مزید کچھ نہ بولی۔ کوئل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اگر ایک سہولت ہے تو اسے استعمال کرنا چاہیے۔ پاکیزہ تو بے احتیاطی سے مری تھی۔ ننگی تار سے، کیا پتا اگر وسائل ہوتے تو شاید وہ خود بھی کبھی واشنگ مشین خریدنے کا سوچتی سہولت کے لیے۔ آخر سہولت تو سہولت ہی ہوتی ہے۔

فیصل مہینے بھر کا ضروری سودا لینے گیا تھا۔ گھر میں داخل ہوا تو موبائل فون بج اٹھا۔ موبائل فون اس نے ہاؤس جاب کے پہلے مہینے میں لے لیا تھا اور کوئل کے پاس بھی پرانا موبائل فون تھا۔ شادی سے پہلے بھی وہ یہی فون استعمال کیا کرتی تھی۔

"محترمہ آپ کا فون بج رہا ہے، کہا بھی تھا کہ ایک جیسی ٹیون نہیں لگاتے لیکن تم کہاں باز آتی ہو۔" فیصل نے جیب سے فون نکال کر دیکھا۔ اس کے فون پر کال نہیں آ رہی تھی اسی لیے اس نے جھنجلا کر کہا تھا۔

کوئل نے کال ریسیو کی۔ تھوڑی دیر پُرجوش انداز میں بات کی پھر فون فیصل کی طرف بڑھایا۔

"ابو کا فون ہے، آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

فیصل نے فون لیا۔ حال احوال دریافت کیا۔

"میں تمہارے گھر کے پاس ہوں۔ اپنے ایک بہت اچھے دوست کے پاس آیا ہوں۔ بچپن کے دوست ہیں میرے۔ تمہیں ان سے ملوانا چاہتا ہوں۔ آ سکتے ہو؟"

"جی جی ضرور۔"

اور پھر سکندر صاحب فیصل کو پتا سمجھانے لگے۔ فیصل کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"شاید غلط فہمی ہو یا کوئی تبدیلی آ چکی ہو۔" فیصل نے مطلوبہ دکان کی طرف جاتے ہوئے سوچا تھا۔

تہہ خانے والی دکان ابھی تک ویسی ہی تھی۔ البتہ اس کے اوپر ایک اچھا خاصا پلازہ بن چکا تھا۔ فیصل اس طرف ممکن حد تک کم آتا تھا۔ دلخراش یادیں جو اس سے وابستہ تھیں۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے بہت کچھ سوچا تھا۔ سکندر صاحب آفس میں بیٹھے تھے۔

"لیں جی اشرف صاحب آ گیا میرا داماد۔ ماشاء اللہ بڑا ہی ہونہار ہے۔ میری بیٹی کی طرح ڈاکٹر ہے۔" فیصل نے مرے مرے ہاتھوں سے سسر کو سلام کیا تھا۔ اشرف صاحب کھڑے ہو کر ملے تھے۔ گلے لگایا تھا۔

فیصل میکانکی انداز میں گلے ملا۔ بیٹھتے ہوئے فیصل نے ایک بار پھر اپنے سسر کو دیکھا۔ دھندلا پن تھوڑا کم ہوا تھا۔ داڑھی غائب ہوئی تھی۔ جسم تھوڑا صحت مند ہوا اور توند بھی جسامت کی وجہ سے نمایاں ہوئی۔ فیصل کو لمحوں میں سب یاد آ گیا۔

سکندر ریاض۔ فیصل کے سسر۔ کوئل کے والد محترم، یہ وہی شخص تھے جنہوں نے برسوں پہلے فیصل کے ساتھ جنسی زیادتی کی تھی۔ فیصل کو اپنا سر کھولتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

وہ چپ چاپ اٹھا۔ ایک قہر آلود نظر سکندر صاحب پر ڈالی اور باہر جانے لگا۔

"فیصل، فیصل۔" سکندر صاحب نے پکارا۔ فیصل کا دل تو چاہا کہ پلٹ کر آئے اور سکندر صاحب کے منہ پر ایسا مکا مارے کہ دانت باہر آ جائیں لیکن اس نے اپنے اوپر ضبط کیا اور چپ چاپ باہر آ گیا۔

"وہ طبیعت خراب تھی، جب میں فون پر بات کی تھی تو کہہ رہا تھا، لیکن میں نے پھر بھی بلا لیا۔" پھیکے پھیکے سے سکندر صاحب نے جواز دیا اور ان کا جواز جس قدر بودا تھا اس کا انہیں خود بھی اندازہ تھا۔ اشرف صاحب نے بھی کوئی استفسار نہ کیا۔

❁❁❁

رات کافی ہو چکی تھی۔ فیصل ایک کرسی پر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھا تھا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ رات کو لیٹ آیا تھا۔ وہ سخت غصے میں تھا۔ کوئل نے اس سے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر دیئے لیکن فیصل پہلے تو اسے ایک ٹک دیکھتا رہا، پھر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

کوئل اس سے مزید سوال کرتی کہ فیصل نے سب سوالوں کا ایک جواب دیا، زور سے ایک طمانچہ کوئل کے گال پر مارا۔ اتنی زور سے کہ کوئل لڑھک گئی۔

"بکواس بند کرو اپنی۔" تھپڑ مارنے کے بعد فیصل نے کہا تھا۔

کوئل کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو نکلے تھے۔ جنہیں اس نے جلدی جلدی صاف کیا تھا۔

''کیا بات ہے، جس نے فیصل کو پریشان کیا ہوا ہے؟'' اسے فیصل کی فکر تھی۔ ایک تھپڑ کھا کر دوسرے کی ہمت نہیں تھی۔ کھانے کے بارے میں یہ نہیں پوچھا کہ کھانا ہے یا نہیں، بس چپ کر کے ہاٹ پاٹ لا کر سامنے رکھ دیا۔ جسے فیصل نے جھٹکنے کے انداز میں دور کیا تھا۔

''کچھ نہیں کھانا میں نے، لے جاؤ۔'' کومل چُپ چاپ ہاٹ پاٹ اٹھا کر کچن میں رکھ آئی۔

''میں تمہاری شکل ایک منٹ بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ کہیں چلی جاؤ۔'' یہ بات بھی کومل نے تحمل سے برداشت کی اور بیڈ پر ایک کونے میں سکڑ کر بیٹھی گئی اور فیصل کو ڈر ڈر کر دیکھنے لگی۔

''چائے لا دوں۔'' ڈرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''میں نے اب تمہارے منہ سے ایک لفظ بھی سنا تو ایسا ماروں گا کہ اگلی پچھلی باپ دادا کی نسلیں بھی کانپ اٹھیں گی۔''

باپ دادا کی بات ہضم کرنا مشکل تھا لیکن کومل نے ہضم کر لی۔ آنسوؤں کے ساتھ، مشکل اور پریشانی کی گھڑی میں وہ ہر صورت فیصل کی پریشانی دور کرنا چاہتی تھی۔ خود سے بڑھانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ گھنٹہ بھر انتظار کرتی رہی کہ فیصل کچھ بولے گا یا سونے کے لیے بیڈ پر آئے گا لیکن فیصل نے اس گھنٹے میں بس دو بار سگریٹ کا پیکٹ کھولا تھا۔ جس میں سے ایک بار سگریٹ ہاتھ میں لی تھی اور نیچے پھینک دیا تھا۔ دوسری بار ہونٹوں کے درمیان رکھا، لائٹر جلایا تھا اور پھر لائٹر اور سگریٹ دونوں پھینک دیے تھے۔

کومل چپکے سے اٹھی، کچن میں جا کر چائے بنائی۔ دو کپ ہاتھ میں لئے دوبارہ کمرے میں آئی۔ پہلے اپنے لیے کپ بیڈ کی پائنتی پر رکھا۔ پھر ڈرتے ہوئے فیصل کے پاس آئی۔ فیصل کا یہ غضب ناک روپ اس کے لیے بالکل نیا تھا اور پریشان کر دینے والا تھا۔

''چائے۔'' بہت مدھم آواز میں کومل بولی تھی۔

فیصل نے نظریں اٹھا کر کومل کو دیکھا تھا۔ فیصل کی آنکھوں میں قہر ہی قہر تھا کومل سہم گئی۔

فیصل نے چائے کے کپ کو اس زور سے ہاتھ مارا کہ کومل کے کندھے سے ہوتا ہوا پیچھے جا گرا تھا۔ گرم چائے کومل کے چہرے پر گری۔ آدھے سے زیادہ چہرے پر۔

''آہ'' کومل کراہتے ہوئے لڑھکی اور چہرہ چھپا کر بیٹھتی چلی گئی۔

''کتے کی بچی'' فیصل اس کے باپ کو گالیاں دیتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ کمرے سے نکل کر وہ ساتھ والے ہال کمرے میں چلا گیا۔ جہاں شمع سوئی ہوئی تھی۔ فیصل نے پوری کوشش کی تھی کہ کسی قسم کا شور نہ ہو کیونکہ شمع تھوڑے سے شور سے بھی اٹھ جاتی تھی۔ اندر جا کر

وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے بعد اس نے منہ ہی منہ میں سکندر صاحب کو گالیاں دیں۔

ادھر کومل کتنی ہی دیر فرش پر بیٹھی روتی رہی۔ چہرے پر حد سے زیادہ جلن ہو رہی تھی۔ اس کے کانوں میں گالیاں گونج رہی تھیں اور ہر بار اسے پہلے سے زیادہ تکلیف ہو رہی تھی۔

❁❁❁

کلیم شاہ، مسز کلیم اور واصف تینوں آئے ہوئے تھے۔ کلیم شاہ اور ان کی اہلیہ کافی شرمندہ دکھائی دے رہے تھے جب کہ واصف نے سر جھکایا ہوا تھا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں، اپنے نا اہل بیٹے کی حرکت پر، آپ برائے مہربانی اسے معاف کر دیں۔ ہم اپنی بیٹی کو لینے آئے ہیں'' کلیم شاہ نے شرمندہ شرمندہ لہجے میں کہا۔

سونیا نے چبھتی ہوئی نظر ڈالی۔

''واصف شادی شدہ تھا، یہ بات آپ نے ہم سے چھپائی یہ سراسر دھوکہ ہے۔''

''ہمیں تو خود بھی پتا نہیں تھا کہ صاحبزادے نے گل کھلائے ہوئے ہیں۔ آپ یقین جانیں، ہمیں خود بھی اس وقت پتا چلا جب وہ لڑکی گھر آئی تھی۔'' مسز کلیم نے کہا۔

سونیا کو یقین آیا تھا یا نہیں لیکن وہ بولی کچھ نہیں تھی۔

''اس طرح گھر سے نکالنے کا کوئی تک نہیں بنتا'' کچھ وقفے بعد سونیا پھر بولی۔ سعد چپ چاپ بیٹھا تھا اور یہ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ سعد چُپ بیٹھا تھا اور سونیا کو اس پر سخت تاؤ آیا تھا کہ آخر وہ اپنی بیٹی کے لیے بول کیوں نہیں رہا۔

''دیکھیں بہن، یہ لڑکا تو ہے ہی پاگل۔ یہ کون ہوتا ہے میری بیٹی کو گھر سے نکالنے والا۔ آپ کی بیٹی کو میں بیاہ کر لے گیا تھا تو بیٹی بنا کر رکھنے کا وعدہ کیا تھا میں نے۔ آپ بس اسے پہلی اور آخری خطا سمجھ کر معاف کر دیں۔'' کلیم شاہ کے لہجے میں شرمندگی ہی شرمندگی تھی۔

''ماریہ کو بلائیں تو سہی، ہم اسے لیے بغیر نہیں جائیں گے۔'' مسز کلیم بولیں۔

سونیا نے ان کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ ماں باپ سے کچھ فاصلے پر بیٹھا غلام محی الدین مسلسل واصف کو دیکھے جا رہا تھا۔ واصف سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ وہاں خود نہیں آیا بلکہ لایا گیا ہے۔

''اور اس لڑکی کا کیا ہوگا؟'' سونیا نے پوچھا۔

''بتاؤ بھئی واصف؟ تم سے تمہاری ساس کچھ پوچھ رہی ہیں؟'' کلیم شاہ صاحب نے واصف کو گھسیٹا تھا۔

''ہاں..... اسے..... اسے میں طلاق دے دوں گا۔'' واصف کی زبان اس کا ساتھ

نہیں دے رہی تھی۔ سعد، سونیا، غلام محی الدین کے علاوہ کلیم شاہ اور مسز کلیم کو بھی اس بات میں حقیقت نظر نہیں آرہی تھی۔

''تو پھر طلاق دے کر کیوں نہیں آئے؟'' سونیا نے پوچھا۔

''بس کئی پیچیدگیاں تھیں، میں...... میں اسے کچھ عرصے تک طلاق دے دوں گا اور میں ماریہ سے بھی معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ آپ پلیز اسے بلا دیں۔'' جیسے بولنے والے کھلونے کی چابی بھری ہو اور وہ بولنے لگ جائے۔ واصف بھی کچھ اسی طرح سے بول اٹھا تھا۔

''ماریہ کو بلا لاؤ۔'' سعد نے غلام محی الدین کو مخاطب کیا۔ سونیا ابھی مزید کچھ باتیں طے کرنا چاہتی تھی لیکن سعد کی بات سن کر چپ کر گئی۔

''بہتر ہے جب واصف اسے طلاق دے دے تو آپ لے جائیں ابھی ماریہ کو بس مل لیں۔''

سونیا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''لیکن بہن ہماری بیٹی کو جانے دیں۔ اس کے بغیر تو گھر بھی خالی لگتا ہے۔'' کلیم شاہ نے ان کا دل پسیجنے کی کوشش کی۔ اس سے قبل سونیا انکار کرتی۔ سعد بول اٹھا۔

''ہمیں تو کوئی اعتراض نہیں اگر ماریہ خود جانا چاہتی ہے تو ٹھیک ہے آپ لے جائیں، لیکن اگر وہ نہیں جانا چاہتی تو آپ اصرار مت کیجیے گا۔'' زندگی میں پہلی بار سعد کسی معاملے میں بول رہا تھا اور سونیا کو اس سے بالکل اتفاق نہیں تھا لیکن وہ بولی کچھ نہیں اور کچھ دیر بعد ماریہ ان لوگوں کے ساتھ چلی گئی۔ اپنی مرضی سے۔

''آپ نے فیصلہ ماریہ پر کیوں چھوڑا؟ وہ بچی ہے اسے بھلا کیا سمجھ۔'' ان لوگوں کے جانے کے بعد سونیا نے سعد سے شکوہ کیا تھا۔

''سونیا ہمارے بچے اب بڑے ہو چکے ہیں۔ بچے نہیں رہے؟ ماریہ کو سمجھ ہے ہر چیز کی، سب کچھ جانتی ہے کہ اس نے اپنا گھر کس طرح بنانا ہے۔ وہ ہر چیز خوب جانتی ہے۔ اسے ہی فیصلہ کرنے دو۔ ہمیں دخل نہیں دینا چاہیے۔ اللہ بہتری کرے گا۔'' اور سونیا سعد کو بس دیکھ کر رہ گئی۔

ساتھ بیٹھے غلام محی الدین کو لگا تھا جیسے پہلا اس کے باپ نے اپنے ذہن سے سوچا تھا۔ اس کی ماں کے ذہن سے نہیں۔

***

سرخ لوہے کے گیٹ کو فیصل نے پوری قوت سے دھکیلا تو دیوار سے لگنے کی وجہ سے

''ٹھاہ'' کی آواز آئی۔ دروازے سے کچھ دور گملوں میں موجود پودوں کی کاٹ چھانٹ کرتا احسان اٹھ کھڑا ہوا۔

''فیصل بھائی آپ؟؟ کیسے ہیں؟ السلام علیکم!'' احسان چہرے پر مسکراہٹ سجائے آگے بڑھا تھا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔

فیصل کا دل چاہا کہ مصافحہ کرے ہی نہ لیکن اس کی اخلاقیات نے اجازت نہ دی اور جب مصافحے کے لیے ہاتھ ملا دیا تو دل چاہا کہ احسان کا ہاتھ اتنے زور سے مروڑے کہ ہڈیاں ٹوٹ جائیں لیکن اس نے اس پر بھی عمل درآمد نہیں کیا۔

''کہاں ہے تمہارا باپ؟'' فیصل کے الفاظ اور انداز میں جو سختی تھی، احسان نے لمحہ بھر میں محسوس کر لی تھی۔

''وہ اپنے کمرے میں ہیں۔'' احسان نے ٹھہر کر جواب دیا تھا۔

فیصل اس گھر میں اتنی بار آچکا تھا کہ جانتا تھا کہ سکندر ریاض کا کمرہ کون سا ہے۔ وہ کمرے کی طرف مڑ گیا۔

''خیریت! فیصل بھائی۔'' پیچھے سے احسان نے آواز لگائی جسے فیصل نے نظر انداز کر دیا تھا۔

حسان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ فیصل کے پیچھے کمرے میں جائے یا یہیں کھڑا رہے۔ آخر اس نے تھوڑی دیر تک اندر باپ کے کمرے میں جانے کا ارادہ کر لیا اور خود اپنی ماں کو فیصل کے آنے کی اطلاع دینے چل دیا۔

فیصل کو پتہ نہیں تھا کہ وہ سکندر ریاض کے پاس کیا کرنے آیا ہے۔ انہیں مارنے، قتل کرنے، شرمندہ کرنے یا کچھ اور...... اس نے دروازے کے ہنڈل پر سخت قسم کا ہاتھ رکھا تھا۔

لکڑی کا دروازہ تیزی سے چرر کی آواز سے کھلا تھا اور پھر دھماکے سے بند ہوا تھا۔

سکندر ریاض کی فیصل کی طرف پشت تھی اور وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ قہر بھری آنکھیں لیے فیصل ان کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا یا کہتا اس کی نظر سکندر کے سامنے پڑی۔ سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ بڑے سائز کی ایک کتاب تھی جو سکندر ریاض کے سامنے تکیے پر پڑی تھی۔ کتاب کے اوپر سبز رنگ کا غلاف تھا اور سکندر ریاض دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی رکھے اسے پڑھتے جا رہے تھے۔

فیصل انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

آیت پڑھنے کے بعد سکندر ریاض نے اس کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا، وہ مدہم آواز میں

پڑھ رہے تھے لیکن ان کی آواز فیصل تک بخوبی آ رہی تھی۔

''جس دن ہر شخص اپنے اعمال کی نیکی کو موجود پالے گا اور ان کی برائی کو بھی دیکھ لے گا تو آرزو کرے گا کہ اے کاش اس میں اور اس برائی میں دور کی مسافت ہو جاتی اور خدا تمہیں اپنے غضب سے ڈراتا ہے اور خدا اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔''

غصے میں ہونے کے باوجود فیصل نے حرف بہ حرف سنا۔ ترجمہ پڑھنے کے بعد سکندر ریاض نے نظر اٹھا کر آنے والے کو دیکھا تھا۔ فیصل نے ان کی آنکھوں میں نمی محسوس کی تھی۔ فیصل کو دیکھ کر عقیدت سے انہوں نے قرآن مجید کو بند کیا۔ اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگے رحل پر قرآن مجید رکھ دیا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' سکندر ریاض نے کہا اور وہ نا چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گیا۔

ماتھے پر تیوری تھی۔ فیصل نہیں جانتا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔

''میں سورہ آل عمران پڑھ رہا تھا ترجمے کے ساتھ۔ تیسویں آیت تک پڑھی ہے۔ کتنا بدنصیب ہوں میں۔ زندگی میں پہلی بار میں قرآن مجید ترجمے کے ساتھ پڑھ رہا ہوں۔'' سکندر ریاض نے خود بولنا شروع کر دیا۔

''دکل ٹھیک ہے نا۔'' سکندر ریاض نے پوچھا۔ فیصل نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ انہوں نے بھی دوبارہ نہ پوچھا۔

لمحوں کے توقف کے بعد سکندر ریاض بولے تھے۔

''پتا بھی نہیں چلتا بیٹا اور زندگی گزرتی چلی جاتی ہے۔ ابھی کل کی ہی بات ہے میں بھی تمہاری طرح تنومند اور جوان ہوا کرتا تھا لیکن......'' آخر میں وہ ہنس پڑے۔ ''ساری زندگی میں نے گناہوں میں گزاری ہے۔ ایک گناہ کرو تو دل پر ایک سیاہ نقطہ آ جاتا ہے۔ میں نے تو اتنے گناہ کیے ہیں کہ...... پتا نہیں اللہ مجھے معاف کرے گا بھی نہیں......'' فیصل نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا وہ خود ہی بولے جا رہے تھے۔

''رشوت لی، مال حرام جمع کیا۔ حق مارا، بدکاری کی...... ہر گناہ کیا۔'' رونے لگ گئے تھے۔

''میرے گناہ کس طرح مجھ سے دور ہوں گے۔ کس طرح قیامت کے دن میں ان کا جواب دوں گا کس طرح...... مجھے اللہ سے بہت ڈر لگتا ہے۔'' سکندر ریاض ہچکیوں سے رونے لگ گئے۔

''اللہ تو بخشنے والا اور معاف کرنے والا ہے لیکن میرے کام ہی کچھ ایسے ہیں کہ......''

سکندر ریاض روتے جا رہے تھے اور فیصل انہیں دیکھتا جا رہا تھا۔

کبھی کبھی سوچ لمحوں میں بدل جاتی ہے۔ فیصل کی انتقام کی سوچ بھی لمحوں میں بدلی تھی۔

فیصل ہمت کر کے اٹھا تھا۔ معاف کرنا اور دل سے بات نکالنا آسان کام نہیں ہوتا۔

''انکل روئیے مت۔ اللہ بخشنے والا ہے۔ اسے اپنے بندے بہت پیارے ہیں۔ وہ معاف کر دے گا۔ ان شاء اللہ۔'' فیصل نے کچھ بھولنے کی کوشش کرتے ہوئے دلاسہ دیا تھا۔

''حقوق العباد کیسے معاف ہوں گے۔ یا اللہ میں یہ منہ لے کر کہاں جاؤں۔'' سکندر ریاض کے رونے میں شدت آئی تھی۔

فیصل کچھ نہ بولا۔

''تمہاری کبھی حق تلفی کی ہو تو مجھے معاف......'' روتے ہوئے سکندر ریاض کہہ رہے تھے۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں انکل! آپ میرے والد جیسے ہیں کوئی حق تلفی نہیں کی۔ اگر کی بھی ہے تو میں نے معاف کیا۔'' الفاظ فیصل کے منہ سے خود بخود نکلتے گئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے کیا کہا ہے۔

سکندر ریاض روتے جا رہے تھے اور فیصل انہیں دلاسے دے کر چپ کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے ان پر بے تحاشا ترس آیا تھا۔

''میں نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر معاف کیا۔'' فیصل نے دل میں ایک بار پھر دہرایا اور سکندر ریاض کو ایک بار پھر دلاسے دینے لگ گیا تھا۔

❁❁❁

غلام محی الدین اپنے باپ کے ساتھ بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ آج پاکستان اور آسٹریلیا کا میچ تھا۔ سنسنی خیز میچ تھا۔ پاکستان کے جیتنے کے کافی چانسز تھے۔ ایک عرصہ ہو گیا تھا پاکستان، آسٹریلیا سے کوئی میچ نہیں جیتا تھا۔ باپ بیٹے کی شدید خواہش تھی کہ پاکستان میچ جیت جائے۔ پاکستان بیٹنگ کر کے ٹارگٹ دے چکا تھا اور آسٹریلیا کے کھلاڑی سست روی سے کھیل رہے تھے۔ میچ آخری مراحل میں تھا۔

آج سونیا کافی عرصے بعد اپنے کلب میں گئی تھی۔ ماریہ کی پریشانی نے اسے اندر باہر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ماریہ کو گئے ہوئے دو ہفتے ہو چکے تھے۔ ان دو ہفتوں میں ماریہ نے تین چکر لگائے تھے۔ دو واصف کے ساتھ اور ایک اکیلے، وہ مطمئن دکھائی دیتی تھی اور واصف کا

رویہ اور انداز بھی نارمل تھے۔ سو سونیا اور سعد نے بھی سکون کا سانس لیا۔ آخری چکر ماریہ نے تین دن پہلے لگایا تھا۔ بیٹی کا اطمینان دیکھ کر اور اس سے پوچھ کر سونیا نے اپنی تسلی کی تھی اور آج وہ فریش ہونے کے لیے کلب چلی گئی۔ وہاں سے اس نے ایک بوتیک کے افتتاح کے لیے جانا تھا۔

غلام محی الدین اور سعد کی نظریں ٹی وی پر گڑی ہوئی تھیں۔ سچویشن مزید سنسنی خیز ہوتی جارہی تھی۔ کوئی ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔ انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ صوفے کے قریب پہنچ کر اس نے سعد کو مخاطب کیا تھا۔

''ڈیڈ میرا پائن ایپل کھانے کا بے حد دل کر رہا ہے۔ میں جی ایم اور آپ دونوں کے بیڈروم فریجوں میں دیکھ آئی ہوں، نہیں ہیں۔ کچن کے فریج میں بھی نہیں ہیں اور میرا والٹ بھی نہیں مل رہا۔ شاید میں لائی ہی نہیں، آپ ملازمہ کو پیسے دے کر پائن ایپل تو منگوا دیں اسے کہیے گا کہ سلائسز والا ٹن پیک لائے گا۔'' سعد نے حیرانی سے ماریہ کو دیکھا تھا۔ وہ اسی روٹین میں نظر آرہی تھی جس میں وہ شادی سے پہلے ہوتی تھی۔ سعد اور غلام محی الدین حیرت سے کھڑے ہوگئے۔

''ماریہ بیٹا! تم کب آئیں؟'' سعد نے پوچھا تھا۔

''تین چار گھنٹے پہلے۔'' ماریہ نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

''تین چار گھنٹے پہلے۔'' حیرت ہونا فطری بات تھی۔

''تم پھر تم کہاں تھیں؟''

''اپنے کمرے میں۔'' ماریہ کا اطمینان قابلِ دید تھا۔

''واصف کے ساتھ آئی ہو؟'' سعد اور غلام محی الدین کی حیرانی، پریشانی میں بدلتی جارہی تھی۔

''ہمیشہ کے لیے آئی ہوں۔'' ماریہ نے سعد کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا بلکہ اپنی طرف سے سب سے اہم بات بتائی تھی۔

''ہمیشہ کے لیے۔'' سعد کو سوچ کر جھرجھری سی آگئی۔

''لیکن کیوں بیٹا؟'' سعد کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''آپ پائن ایپل تو منگوائیں، پھر بتاتی ہوں، سکون سے۔'' ماریہ نے بڑھ کر باپ کی جیب میں ہاتھ ڈالا، اس میں موجود کرنسی کے چند نوٹوں میں سے ایک پانچ سو کا نوٹ نکالا۔ بچپن سے وہ باپ کی جیب میں بغیر کسی جھجک کے ہاتھ ڈال لیتی تھی۔ البتہ شادی کے بعد اس

نے پہلی دفعہ پیسوں کے لیے سعد کی جیب میں ہاتھ ڈالا تھا۔

''ملکہ، ملکہ!'' ماریہ نے ملازمہ کو آواز دی تھی۔ ملازمہ آئی۔ ماریہ نے اسے پائن ایپل کے دو ٹن پیک لانے کو کہا اور ملازمہ پیسے لے کر چلی گئی۔

''ماریہ..... کچھ بتاؤ تو سہی۔'' بولنے والا غلام محی الدین تھا لیکن جواب سننے والے غلام محی الدین اور سعد دونوں تھے۔

''بتاتی ہوں جی ایم، اوہ سوری غلام محی الدین ایک تمہیں بھی اب غلام محی الدین بلوانے کا شوق پڑ گیا ہے۔ زبان پر بھی نہیں چڑھتا۔'' ماریہ نے بے لاگ تبصرہ کیا تھا۔

پھر آرام سے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''آپ بھی بیٹھ جائیں۔'' ماریہ نے بیٹھتے ہوئے سرعت سے کہا تھا۔

غلام محی الدین جھلا کر بیٹھا۔ سعد کا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔

توقف کے بعد ماریہ نے بولنا شروع کیا تھا۔ ''میرے لیے اس گھر میں بہت جگہ ہے۔ گھر میں جگہ ہونے کی وجہ واصف نہیں بلکہ اس کا خاندان ہے۔ واصف مجھے قبول کر ہی نہیں سکتا۔ اس کے بس میں نہیں۔ دو ہفتے میں نے خوب سوچا ہے اور نتیجہ یہی نکلا ہے کہ مجھے واصف کے ساتھ کبھی نہیں رہنا، سو میں آگئی۔ بس اتنی سی بات ہے۔'' ماریہ کا انداز ایسے تھا جیسے کسی اجنبی کی بات کی جارہی ہو۔

''ماریہ پاگل تو نہیں ہوگئی تم۔'' غلام محی الدین نے تیز آواز میں کہا تھا۔

''پاگل ہوتی تو وہاں واصف کے ساتھ زندگی گزار دیتی جو دن میں اگر دس دفعہ مجھے مخاطب کرتا ہے تو آٹھ دفعہ فضا کہہ کر پکارتا ہے۔ میں کمپرومائز نہیں کرنا چاہتی۔ مما اور ڈیڈ نے سکھایا ہی نہیں اور نہ میں کسی کا حق مار سکتی ہوں۔ گھر والوں کے مجبور کرنے پر یا جائیداد ہاتھ سے نکلنے کے خوف سے اگر واصف مجھے قبول کر رہا ہے تو ایسی صورت میں مجھے وہ قبول نہیں اور میں یہ جذباتی ہو کر نہیں کر رہی۔ ڈیٹس فائنل۔'' ماریہ نے حتمی طور پر کہا تھا۔

سعد اور غلام محی الدین ماریہ کو دیکھ کر رہ گئے۔

''ملکہ آئے تو اسے میرے کمرے میں بھیج دیجیے گا۔'' ماریہ چلی گئی اور باپ بیٹا اسے روک بھی نہ سکے۔ ٹی وی چل رہا تھا لیکن میچ میں کسی کو دلچسپی نہیں رہی تھی۔ غلام محی الدین نے ٹی وی بند کرنے کے لیے ریموٹ اٹھایا تھا۔

ٹی وی بند ہونے سے پہلے سکرین پر جو آخری منظر تھا اس میں تمام آسٹریلوی کھلاڑی خوش ہوتے دکھائے جارہے تھے۔ آخر وہ میچ جیت چکے تھے۔

سعد نے جیب سے سیل فون نکالا۔ سونیا کو ملایا۔

''ہاں سونیا، جلدی گھر آؤ جتنی جلدی ہو سکے۔''

''کیا ہوا ہے؟''

''گھر آؤ گی تو بتا دوں گا، بس تم جلدی آؤ۔''

''کیا ہوا ہے؟''

''گھر آؤ گی تو بتا دوں گا، بس تم جلدی آؤ۔''

فون بند کرنے کے بعد سعد چپ چاپ گہری سوچ میں غرق ہو گیا اسے امید نہیں تھی کہ یہ سب ہو گا۔

''ڈیڈ اگر آپ کو بُرا نہ لگے تو ایک بات کہوں۔'' غلام محی الدین نے کہا تھا۔

''کہو۔''

''مجھے...... بلکہ میرے ذہن میں شمع آنٹی آ رہی ہیں۔'' غلام محی الدین نے جھجکتے ہوئے کہا اور سعد بیٹے کو دیکھ کر رہ گیا۔ وہ بیٹے کو کیا بتاتا کہ خود اس کی آنکھوں کے سامنے بھی شمع کا سراپا آ رہا تھا۔

❁❁❁

''اف اللہ، کیسے جل گیا۔'' شمع نے کوئل کا آدھا جلا ہوا چہرہ دیکھ لیا تھا جسے چھپانے کی کوئل نے حتی المقدور کوشش کی تھی۔

''بس امی رات کو اپنے اور فیصل کے لیے چائے بنا رہی تھی کہ بے احتیاطی سے چائے گر گئی۔''

کوئل نے لہجے کو ہشاش بشاش کرنے کی کوشش کی تھی۔

شمع نے ایک نظر کوئل کے چہرے پر ڈالی تو کوئل مسکراتے ہوئے نظریں چرا گئی۔

''یہ چائے چہرے پر کیسے گر گئی؟ اگر چائے گرنی تھی تو ہاتھ پر، کلائی پر یا پاؤں پر گرتی، چہرے پر کس طرح گر سکتی ہے؟''

''وہ میں...... میں لیٹ کر چائے پی رہی تھی۔'' کوئل نے بہانہ بدل ڈالا۔

شمع نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ''ابھی تم کہہ رہی تھی کہ چائے بناتے ہوئے گری ہے اب کہہ رہی ہو پیتے ہوئے گری ہے۔ ویسے لیٹ کر کوئی چائے نہیں پیتا اور اگر فرض کرو پی بھی لیتا ہے تب بھی گرنے کی صورت میں صرف تھوڑی جلتی لیکن یہ تو ماتھا بھی...... ویسے کوئل جھوٹ مت بولو۔ لیٹ کر اس قدر جلانے والی چائے نہیں پی جا سکتی۔''

کوئل چپ ہو گئی۔ اسے سمجھ نہ آیا کہ شمع کو کیا جواز دے۔

''اُف امی آپ خوامخواہ کیا سوچ رہی ہیں؟ بس گر گئی۔ اب میں کس طرح بتاؤں۔'' کوئل جلدی سے بولی۔

''فیصل نے تم پر کیوں چائے پھینکی؟'' شمع نے سپاٹ لہجے میں پوچھا تھا۔

''امی انہوں نے تو نہیں......''

کوئل نے سر جھکا لیا۔

''کوئل بتاؤ کچھ پوچھ رہی ہوں۔'' شمع کا لہجہ مزید سخت ہو گیا۔

کوئل نے سر اٹھایا۔ شمع کے پیچھے فیصل کھڑا نظر آیا تھا۔

''امی، فیصل آ گئے ہیں۔'' کوئل نے نظریں فیصل پر جما کر کہا تھا۔

شمع مڑی اور چند قدم بھر کر فیصل کے مقابل جا کھڑی ہوئی۔

''تم نے کوئل پر چائے پھینکی۔'' شمع کا لہجہ نہایت سخت تھا۔

فیصل نے سر جھکا لیا۔

کچھ لمحے شمع فیصل کو دیکھتی رہی۔ دل چاہا کہ ایک تھپڑ فیصل کو لگا دے۔

''جوان ہو گئے ہو تو اب جوش چڑھ گیا۔ اپنے باپ کے نقش قدم پر چلو گے۔ تمہیں درندگی کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ جاہل۔ آئندہ مجھ سے بھی بات مت کرنا۔'' شمع یہ کہہ کر رکی نہیں۔ اندر کمرے میں چلی گئی۔ اسے حد سے زیادہ دکھ ہوا تھا۔

لڑائی کی صورت میں مارنا اور بات ہوتی ہے۔ یوں بنا دیکھے اذیت دینا مختلف بات تھی اور فیصل سر جھکائے کھڑا رہا۔ چند لمحے کوئل نے فیصل کو دیکھا تھا۔

پھر اس نے بھی سر جھکا لیا اور نظریں نیچے کیے چارپائی کے بان کو دیکھنے لگی۔

شمع نے آج زندگی میں پہلی بار خود سے فیصل کے سامنے اس کے باپ کا تذکرہ کیا تھا اور وہ بھی طعنہ دیا تھا۔ فیصل شرمندہ شرمندہ سا کوئل کے پاس آیا۔ جو کچھ تھا اسے کوئل سے اس طرح کا رویہ نہیں اختیار کرنا چاہیے تھا۔ برآمدے میں آ کر وہ کوئل کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔

اب فیصل کے رونے کی باری تھی اور وہ رونے لگ گیا۔ اسے خود بھی نہیں پتا تھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ ماں کے سخت الفاظ پر یا کوئی اور وجہ تھی۔ شاید بے شمار وجوہات تھیں جس نے ایک مضبوط اعصاب کے جوان کو رلا دیا تھا۔

''سوری۔'' روتے ہوئے فیصل نے کہا۔ کوئل نے حیران ہو کر فیصل کو دیکھا۔

''کوئی بات نہیں ایسی چھوٹی موٹی باتیں ہو جاتی ہیں۔آپ روئیں مت۔یہ میرے دوپٹے سے آنسو صاف کریں۔'' کوئل نے ہاتھ بڑھا کر خود آنسو صاف کر دیئے۔پھر اس نے اٹھ کر فیصل کو پانی بھی پلایا۔

''چلیں مجھے بعد میں منا لیجئے گا۔پہلے امی کو منالیں وہ سخت ناراض ہیں۔'' کوئل نے کہا تھا۔فیصل اسے دیکھتا رہ گیا، کس قدر صلح جو اور درگزر سے کام لیتی تھی کوئل۔وہ واقعی فیصل کو خدا کا انعام لگی۔اس کا آدھا چہرہ تھوڑا تھوڑا سرخ تھا۔

''درد ہے یہاں۔'' فیصل نے ہاتھ لگا کر پوچھا۔

''آہ۔'' کوئل کراہی تھی۔اسے ابھی بھی تھوڑی تھوڑی جلن ہو رہی تھی۔ہاتھ لگانے سے جلی ہوئی جگہ دکھتی تھی۔

''سوری، بس مجھے کیا ہوا تھا، پتا نہیں۔'' فیصل شرمندہ تھا۔

''میں نے کہا ہے مجھے بعد میں منا لیجئے گا، پہلے اپنی جنت کو تو منالیں۔'' کوئل نے ہلکے پھلکے انداز میں فیصل کو مزید کچھ کہنے سے روکا تھا لیکن فیصل کا ارادہ تھا کہ کوئل کو کم از کم تھوڑی سی وجہ بتا دے۔

''اصل میں کوئل وہ جب......'' بات ہچکچاہٹ والی تھی لیکن فیصل وضاحت دینا چاہتا تھا۔

''جب میں چھوٹا تھا۔دس بارہ سال کا تھا تو ایک آدمی نے میرے ساتھ جنسی زیادتی کی تھی، کل میں اس سے مل کے آیا تھا۔ابھی ابھی اسی سے مل کر آرہا ہوں۔بس اس کو دیکھ کر غصہ آیا تھا۔تو غصہ تم پر نکال دیا۔ایک بار پھر سوری لیکن میں نے اب اس آدمی کو بھی معاف کر دیا ہے۔وہ اب کافی نیک ہیں۔اللہ سے گناہوں کی معافی مانگ رہے تھے تو میں نے بھی معاف کر دیا۔'' کھڑے ہو کر فیصل نے تھوڑا وقفے سے بتایا تھا اور قدم آگے بڑھائے تھے۔

''کوئل وہیں بیٹھی رہ گئی۔اپنی جگہ پر۔

''آہ فیصل تھوڑی جلن ہو رہی ہے۔میں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار آؤں، پھر چلتے ہیں۔'' اس بار کسی احساس نے اس کے دل کو جلا دیا تھا۔

ہلکے سبز رنگ کے بوسیدہ دروازے والے غسل خانے میں جا کر اس نے پانی کا ایک چھینٹا مارا اور پھر دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی۔لمبے سانس لینے لگی تھی۔

فیصل کے ساتھ جس نے زیادتی کی تھی اس سے فیصل ابھی مل کر آرہا تھا۔شمع سے سامنا ہونے سے پہلے وہ اپنے کمرے میں تھی تب احسان کا فون آیا تھا۔اس نے بتایا کہ فیصل ابھی

ابھی غصے میں آیا تھا اور ابو کے کمرے میں غصے سے چلا گیا تھا۔جب وہ اور امی کمرے میں پہنچے تھے تو ابو رو رہے تھے اور فیصل انہیں چپ کروا رہا تھا۔ابو نے رونے کی وجہ نہیں بتائی اور فیصل نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔البتہ گھر سے جاتے ہوئے اس کا رویہ نارمل تھا

کڑی سے کڑی مل جاتی ہے۔بعض اوقات کسی چیز کے بارے میں جاننا بے حد اذیت ناک ہوتا ہے۔اسی اذیت سے بچنے کے لیے واقف حال ہونے کے باوجود شناسائی نہیں دکھائی جاتی۔فیصل نے بھی کوئل کو نہیں بتایا تھا اور کوئل کا بھی اب اس بارے میں کوئی بات کرنے کا ارادہ نہیں تھا کیوں کہ اذیت ناک لاحاصل باتیں کرنے کا بھلا کیا فائدہ؟

❁❁❁

''میں طلاق لے لوں گی مما۔'' ماریہ نے اس قدر اطمینان سے کہا کہ سونیا کو ماریہ کی دماغی حالت پر شبہ ہوا تھا۔

''طلاق یافتہ عورت پر پتا ہے، سوسائٹی کتنی باتیں بناتی ہے، تمہیں کچھ اندازہ ہے۔'' سونیا کا لہجہ تیکھا تھا۔

''مجھے سوسائٹی اور اس کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں، میں نے اپنی زندگی گزارنی ہے مما، آپ سمجھنے کی کوشش۔''

''تو واصف کے ساتھ زندگی گزارو، واصف میں کیا برائی ہے؟''

''واصف میں برائی یہ ہے مما کہ وہ فضا کے ساتھ منسلک ہے۔میرے ہونے یا نہ ہونے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔میں اگر اس گھر میں تھی تو واصف کے ماں باپ کی وجہ سے، واصف کی وجہ سے نہیں۔فضا کو وہ کبھی طلاق نہیں دے گا۔اگر کبھی اس نے طلاق دی بھی تو مجھے دے گا۔اتنی ساری باتوں کے باوجود آپ چاہتی ہیں کہ میں واصف کے گھر جاؤں۔نیور مما۔میرا فیورٹ شو شروع ہونا ہے۔اسی لیے آپ اس ٹاپک کو جلدی ختم کریں۔''

ماریہ نے گھڑی دیکھی۔شو شروع ہونے میں پانچ منٹ رہتے تھے۔

''ماریہ سمجھنے کی کوشش کرو۔عورت کے بس میں سب کچھ ہوتا ہے۔کسی بھی شخص کو بدگمان کرنا مشکل نہیں، تم واصف کو بھی فضا سے بدگمان کر دو۔مرد کی سرشت میں عورت پھر بھروسہ شامل ہے۔واصف تمہاری مان سکتا ہے۔طلاق سے بچو۔واصف میں کوئی برائی نہیں۔''

''ہی از جسٹ پرفیکٹ مین۔'' ماریہ نے ماں کی بات توجہ سے سنی۔وہ بدتمیزی نہیں کرنا چاہتی تھی۔طعنہ بھی نہیں، بینا چاہتی تھی لیکن اسے کوئی دوسرا راستہ بھی نظر نہیں آیا۔

''آپ چاہتی ہیں کہ جس طرح آپ شمع نامی خاتون کو سائیڈ پر کر کے ڈیڈ کو لے اڑیں، میں بھی اسی طرح چالیں چل کر خودغرضی دکھاؤں اور فضا کو بالکل کہیں کا نہ چھوڑوں۔'' ماریہ نے منہ میں موجود چیونگم کو ہاتھ سے کھینچ کر لمبا کیا تھا اور پھر اسے منہ سے نکال کر گولا بنا کر ساتھ پڑی ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

سونیا نے بے یقینی سے بیٹی کو دیکھا۔ اسے یقین نہیں آیا تقدیر اسکی بیٹی کے ہاتھ میں آئینہ تھما دے گی۔

''ماریہ سوچ سمجھ کر بولا کرو۔ تم کچھ نہیں جانتی۔ شمع خود ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی اس لیے میں اور تمہارے ڈیڈ یہاں چلے آئے۔''

''فضا بھی نہیں چاہتی کہ تین لوگ ساتھ رہیں۔ تو پھر میں بھی واصف کو بدگمان کر کے اسے فضا سے علیحدہ کر دوں۔''

''تو حرج کیا ہے، ہر بندہ اپنے بارے میں سوچتا ہے۔''

''مما میں کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتی۔ سوری مما آپ کی طرح ظالم نہیں بن سکتی۔''

بیٹی کی بات سن کر سونیا کا دماغ گھوما تھا۔

''شٹ اپ، جو منہ میں آتا ہے، بولتی جا رہی ہو۔ شمع خود پاگل تھی۔ خود تمہارے ڈیڈ سے نہیں ملنا چاہتی تھی میرا اس میں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔''

''جو کچھ بھی تھا یا ہوا تھا مجھے تو صرف ارد گرد سے سنی باتوں کا پتا ہے، لیکن مما واصف کے ساتھ میں نے نہیں جانا...... میری دوسری شادی بھی ہو سکتی ہے۔''

سونیا نے غصے سے ماریہ کو دیکھا۔

اسے سمجھ نہیں آیا کہ کس طرح سے اس پاگل ذہن کو سمجھائے۔ ماریہ نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی۔ ٹائم ہو چکا تھا اس نے ٹی وی آن کر لیا۔

''امی جان۔ امی جان اب معاف کر دیں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔ غلطی ہو گئی۔ بندہ ہوں۔ بندے سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔'' فیصل شمع کو منا رہا تھا۔ شمع ہال کمرے میں چارپائی پر بیٹھی تھی۔ فیصل کی طرف منہ موڑے ہوئے تھی جب کہ فیصل گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھا تھا۔

''امی معاف کر دیں، ویسے بھی میری غلطی تھی۔'' ساتھ کھڑی کوئل منمنائی تھی۔

''کوئل تم چپ رہو۔ تمہاری غلطی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ منہ پر چائے پھینک دی

جائے۔''

مجھے تو یقین نہیں آرہا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔'' شمع نے تاسف سے کہا تھا۔ ''اس نے منہ پر گرم گرم چائے پھینکوں تو پتا چلے درد کا۔'' شمع بڑبڑائی تھی۔

''میں آپ کا بیٹا ہوں، صرف آپ کا۔ معاف کر دیں پلیز۔'' فیصل نے کانوں کو ہاتھ لگایا تھا۔ شمع نے فیصل کو دیکھا۔ ''تم نے ویسے چائے کیوں پھینکی تھی؟'' شمع نے پوچھا۔

''کیوں پھینکی تھی؟'' فیصل نے تھوک نگلا۔ اب ماں کو کیا بتاتا۔ بتانے کے لیے اس کے پاس ٹھوس بہانہ نہیں تھا۔

''امی چھوڑیں، پلیز میں نے معاف کر دیا ہے تو آپ بھی معاف کر دیں۔'' کوئل جلدی سے بولی۔ شمع نے کوئل کو دیکھا یعنی کوئل بھی نہیں چاہتی تھی کہ وجہ بتائی جائے سو شمع نے دوبارہ وجہ نہیں پوچھی۔

''کوئل تم نے معاف کر دیا ہے؟'' فیصل ابھی سوچ رہا تھا کہ ماں کو کیا بتائے کہ ماں کی آواز کانوں سے ٹکرائی تھی۔ شمع کوئل سے پوچھ رہی تھی۔ فیصل نے شکر ادا کیا کہ اسے وجہ بتانے کے لیے کسی قسم کا کوئی جھوٹ نہیں بولنا پڑا۔

''جی، امی میں نے معاف کر دیا ہے۔'' کوئل بولی۔

''تو آؤ ادھر میرے پاس آؤ دونوں۔'' دونوں شمع کے قریب چارپائی پر بیٹھے تھے۔

''ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم دونوں نے زندگی اکٹھے گزارنی ہے۔'' کہتے ہوئے شمع کا دل چاہا تھا کہ رو دے لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔ کوئل اور فیصل ایک دوسرے کی طرف متوجہ تھے۔

''جی امی! آپ کی بات ہمارے ذہن پر جیسے نقش ہو گئی ہے۔''، '' فیصل نے سامنے چارپائی پر بیٹھی کوئل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ بالکل عام سے انداز میں۔

''آئی لو یو'' فیصل کہہ رہا تھا۔

کوئل نے فیصل کو گھورا تھا۔

شمع مسکرا دی۔

''آپ چاہتی ہیں کہ جس طرح آپ شمع نامی خاتون کو سائیڈ پر کر کے ڈیڈ کو لے اڑیں۔ میں بھی اسی طرح چالیں چل کر خودغرضی دکھاؤں۔ سوری مما میں آپ کی طرح ظالم نہیں بن سکتی۔''

سونیا کے دماغ میں یہ باتیں گھوم رہی تھیں۔ تبھی تو سعد کے دوبار بلانے پر بھی متوجہ نہیں ہوئی تھی۔

''سونیا۔'' سعد نے تیسری بار بلایا تھا۔

''ہاں۔'' سونیا جیسے چونکی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' سعد کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

''کچھ نہیں بس ماریہ کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ اب اس پاگل کو کس طرح سمجھاؤں۔'' سونیا نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

سعد نے سونیا کو نظر بھر دیکھا تھا۔ سر ہاتھوں میں گرائے وہ اداس سی بیٹھی تھی۔ آج بھی سونیا بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔

''کرنے دو سونیا، جو وہ کرنا چاہتی ہے۔ وہ صحیح فیصلہ کر رہی ہے۔'' سعد کی آواز مدہم تھی۔

پل بھر میں سونیا نے سر اٹھا کر سعد کو دیکھا تھا۔ سعد ہمیشہ تقلید کیا کرتا تھا اس کی لیکن اب بہت کچھ تبدیل ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

''طلاق کا لیبل لگوا لیں۔'' سونیا نے استہزائیہ لہجے میں کہا تھا۔

''زندگی خراب کرنے سے طلاق لینا بہتر ہے۔ ویسے بھی وہ کہہ تو رہی ہے کہ دوسری شادی کر لے گی۔ یہ بات تو ٹھیک ہے۔''

''آپ لوگوں کی منطق ہی نرالی ہے، اب میں کیا کہوں۔''

''ہماری سوچ میں خرابی نہیں ہے میڈم۔'' کچھ وقفے کے بعد سعد نے کہا۔

سونیا کو لگا جیسے اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ پل بھر میں اس نے سر اٹھا کر سعد کو دیکھا تھا۔

''کیا کہا تم نے مجھے ابھی کیا کہہ کر بلایا؟'' سونیا کو جیسے بے یقینی سی تھی۔

''میڈم میں...... میں شمع سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں جو بات مجھے کوئی نہ سمجھا سکا وہ بات میرے بچوں نے مجھے سمجھا دی۔ میں نے غلط کیا بہت غلط۔'' سعد کا لہجہ مدہم ہوتا گیا۔

سونیا کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ اسے لگا تھا کہ وہ یک دم پھر سے سعد کے لیے میڈم بن گئی ہے۔ ''میں نے تمہیں کبھی منع کیا ہے ملنے سے۔ جب چاہو مل آؤ۔ بلکہ لے آؤ۔'' آج سونیا کا دل کوئی سیاست کھیلنے کو نہیں چاہا تھا۔

''میڈم ہر بات زبان سے نہیں منع کی جاتی۔'' سعد کا لہجہ دھیما تھا لیکن سونیا نے پھر بھی سن لیا تھا۔

''واقعی ہر بات زبان سے نہیں منع کی جاتی۔'' سونیا نے دل ہی دل میں تائید کی تھی۔

''میڈم مت بلاؤ مجھے، مجھے کچھ ہوتا ہے۔'' سونیا کے لہجے میں التجا اتر آئی تھی۔

زندگی میں ایک لمحہ ایسا ضرور آتا ہے کہ ہم جتنے بھی خود پسند اور غرور میں مبتلا ہوں ہم کسی سے التجا کرتے ہیں اور ہم اس التجا کو غرور و خود پسندی کے منافی بھی سمجھتے یا شاید التجا آتی ہی اس لیے ہے کہ خود پسندی اور غرور کو کہیں دور لے جائے۔ ''ماریہ کہتی ہے کہ میں ظالم ہوں، وہ کہتی ہے کہ میں نے تمہیں شمع سے چھینا ہے، جھوٹ بولتی ہے نا۔''

سونیا سعد کے جواب کا انتظار کرتی رہی۔ سعد نے جواب دینے میں کافی دیر لگائی تھی

''اپنے دل سے پوچھو وہ کیا کہتا ہے۔ دل سے بہتر کوئی منصف نہیں۔'' سونیا نے سعد کی بات کو غور سے سنا تھا۔ دل کو ٹٹولتے ہوئے اسے ڈر لگا تھا۔

''مجھے تو اتنا پتا ہے کہ میں نے بے حد برا کیا۔ بہت برا۔ مجھ سے برا شاید اس دنیا میں کوئی بھی نہیں۔ ماریہ کو تو واصف سے کوئی دلی وابستگی بھی نہیں لیکن پھر بھی وہ واصف کی بات سمجھ گئی اور میں...... مجھے شمع سے اس قدر محبت تھی کہ میری ماں نے مجھے بتایا تھا کہ میں سوتے ہوئے بھی اس کا نام لیا کرتا تھا اور میں نہ سمجھ پایا بلکہ میں نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ مجھ سے زیادہ خود غرض اور برا شخص کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔'' سعد رونا چاہتا تھا لیکن آنکھیں ہی خشک تھیں۔ شاید انہوں نے شمع کے سامنے ہی برسنا تھا۔

سونیا نے نظر بھر کر سعد کو دیکھا تھا۔ کانوں میں ''سوری مما میں آپ کی طرح ظالم نہیں بن سکتی۔'' گونج رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے سعد بیٹھا پچھتا رہا تھا۔ ستائیس سال کی رفاقت جیسے لمحوں میں مٹی کا ڈھیر بن گئی۔

پچاس سال سے اوپر کا فلمی اداکاروں سے بھی زیادہ ہینڈسم اور سمارٹ، فیکٹریاں چلانے والا، عیش و عشرت میں، سہولیات اور فراوانی میں زندگی گزارنے والا سعد پچھتا رہا تھا۔ وہ اسی وقت اڑ کر ملتان کی اس گند سے بھری تاریک گلی کے اس گھر میں جانا چاہتا تھا جس کے کمروں کے دروازے گہرے سبز رنگ کے تھے، جس گھر میں شمع رہتی تھی۔

ساری دنیا نے کہا، مثالیں دیں۔ تب خود ٹھیک لگا۔ اپنی بیٹی نے مثال کھڑی کر دی تو جیسے ان کے خود غرضی کے مجسموں کو زمین میں دفن کرنے کی کوشش کی ہو۔ کبھی کبھار ایک لمحہ ہی، ایک واقعہ ہی انسان کو بہت کچھ سمجھا دیتا ہے۔ وہ باتیں جن سے انسان نظریں چراتا ہے،

جنہیں انسان خود نہیں سمجھنا چاہتا۔کبھی کبھار ایک چھوٹی سی بات ستائیس سالوں کو گھٹا دیتی ہے اور انسان کو اپنا آپ بھی بونا لگنے لگ جاتا ہے۔

خودغرضی واقعی بہت بُری چیز ہے۔ بہت بری۔سونیا بے وقوفوں کی طرح سعد کو دیکھے جارہی تھی۔ جو سر جھکائے بیٹھا اس وقت دنیا کا شرمندہ ترین انسان لگ رہا تھا۔

❁❁❁

فیصل کا سیل فون سائلنٹ پر تھا، وہ ابھی ابھی فارغ ہوا تھا۔کوئل کا آج آف ڈے تھا، سو وہ اکیلا ہاسپٹل سے نکلا۔سیل فون نکال کر دیکھا تو اس پر چھبیس مس کالز تھیں۔ چھبیس کی چھبیس جی ایم کے نام سے تھیں۔

''خدارا خیریت ہی ہو۔'' فیصل نے کال بیک کی تھی۔

دوسری طرف فون پہلی بیل پر ہی اٹھا لیا گیا۔

''السلام علیکم! جی ایم کیسے ہو؟''

''وعلیکم السلام، جی ایم نہیں غلام محی الدین۔'' ہنستی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

''اوہ اوہ سوری اصل میں ابھی تک فون بک میں تمہارا نام جی ایم سیو ہے تو بس......''

''ہاں، ہاں میں سمجھتا ہوں، فون بک میں تو نام چینج کرنے میں صدیاں لگتی ہیں، اور تمہارے پاس تو زندگی بھی ایک صدی سے کم ہے۔'' غلام محی الدین نے لطیف سا طنز کیا تھا۔

''خیریت تھی، اتنی بار کال کی؟''

''ہاں، ہاں خیریت ہے، تم فارغ ہو؟''

''ابھی فارغ ہوا ہوں، تھکا ہوا ہوں۔''

''تھکن کو مارو گولی تم ادھر آجاؤ، میں ملتان ہوں۔'' غلام محی الدین نے جیسے دھماکہ کیا تھا۔

فیصل پُرجوش ہوگیا۔لمحوں میں تھکن اتری تھی، وہ غلام محی الدین کے بتائے ہوٹل پر جتنا ممکن ہوسکا تھا جلدی پہنچا تھا، اپنی بائیک پر۔ یہ سیکنڈ ہینڈ بائیک لیے ہوئے ابھی دو مہینے پورے نہیں ہوئے تھے۔ فرسٹ ایئر کے بعد دوبارہ فیصل کی غلام محی الدین سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔فیصل نے ایک دو بار ملتان آنے کے لیے اصرار کیا تھا لیکن غلام محی الدین نے انکار کر دیا تھا۔فیصل کو یاد تھا کہ غلام محی الدین وعدہ کر کے گیا تھا کہ وہ سعد اکبر کو لے کر آئے گا اسی لیے وہ دوبارہ نہیں آیا۔شروع میں فیصل نے انتظار کیا تھا۔ باپ کے آنے کا لیکن خود سے غلام محی الدین سے نہ پوچھا کچھ باتیں پوچھی نہیں جاتی خود بخود پتہ چل جاتی

ہیں۔پوچھنے سے پوچھنے والے اور بتانے والے دونوں کو شرمندگی ہوتی ہے۔

اور آج بائیک پر جاتے ہوئے فیصل کے دل میں بار ہا بار خیال آیا تھا کہ شاید باپ ساتھ ہو اس لیے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوئی تھی۔

باپ ساتھ تھا۔شعور میں فیصل نے پہلی بار باپ کو دیکھا تھا۔کھل کر باپ سے گلے لگا تھا۔آنکھوں میں آئے آنسو دونوں نے صاف کیے تھے۔باپ کو دیکھ کر فیصل یہ بھی بھول گیا کہ اس نے کئی سو دفعہ اپنے آپ سے عہد کیا ہوا ہے کہ اگر اب کبھی زندگی میں باپ سے ٹکراؤ ہو بھی سہی تو وہ نہیں پہچانے گا۔

''آنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں کر دی آپ نے۔'' ستائیس سال اس فقرے میں پورے تو نہیں آسکتے تھے لیکن فیصل نے اس کے علاوہ کوئی اور شکوہ نہیں کیا۔

سعد کے پاس اس شکوے کا بھی جواب نہیں تھا۔فیصل انہیں اسی وقت گھر لے جانا چاہتا تھا لیکن غلام محی الدین نے انکار کر دیا۔ باپ سے علیحدہ لے جا کر بولا۔

''دیکھو فیصل میرے خیال میں ڈیڈ کو شمع آنٹی کے ساتھ اکیلے رہنے کا موقع دینا چاہیے۔اکیلے میں شکوے ہو گئے تو صلح بھی ہو جائے گی۔ستائیس سال کی بات ہے۔ آخر اس لیے میں چاہ رہا ہوں کہ تم اور کوئل بھابی یہیں آجاؤ۔ میں نے تم لوگوں کے لیے بھی روم بک کروایا ہوا ہے۔ ڈیڈ اور شمع آنٹی گھر میں اکیلے ہوں گے تو ٹھیک رہے گا تمہارا کیا خیال ہے؟''

''یہ تم آنٹی کیا بلا رہے ہو، امی کہہ کر بلاؤ۔'' فیصل بولا تو غلام محی الدین خجل ہو گیا۔

''ٹھیک ہے، میں کوئل کو لے آؤں گا، ابو کو تم خود گھر تک چھوڑ آنا۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' غلام محی الدین مسکرایا تھا۔

❁❁❁

سونیا ہاتھ میں گولڈ چین لیے بیٹھی تھی جس میں سانپ کی طرح بل کھاتے ایس کا لاکٹ تھا ایسا ہی ایک لاکٹ اس کے گلے میں تھا۔ سانپ کی طرح بل کھائے ایس والا لاکٹ اس کی سانسوں کے ردھم کے ساتھ ہلکورے لے رہا تھا۔

سونیا نے ارجنٹ آرڈر دے کر یہ لاکٹ بنوایا تھا جو لاکٹ اس نے پہنا ہوا تھا اور جو اس کے ہاتھ میں تھا دونوں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں تھا۔ایک فرق جو تھا وہ یہ کہ سونیا کے گلے میں موجود لاکٹ ستائیس سال پرانا تھا اور پرانا لگ رہا تھا۔ جب کہ ہاتھ میں موجود لاکٹ بالکل نیا تھا ویسے بھی اب شمع کا نئی چیزوں پر حق بنتا تھا۔

اسے ادراک ہو گیا تھا کہ زندگی کے ہر موڑ پر اس نے خود غرضی دکھائی۔ وہ سب جانتی

تھی پھر بھی پیسوں کو درمیان میں لا کر شمع اور سعد کو دور کیا سب جاننے کے باوجود اس نے ترجیح دی۔ وہ شمع کی حالت سمجھتی تھی۔ دراصل ہم سے ہر کوئی دوسرے کی کیفیت کو خوب جانتا ہے لیکن کبھی کبھار ہم آنکھیں بند کر کے خود کو انجان بنا دیتے ہیں اور کبھی ''میں'' کو درمیان میں لا کر دوسرے کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچتے، کچھ بھی نہیں۔

کسی بھی قسم کا رابطہ نہ کیا جا سکے اس لیے سونیا نے ملتان والا سعد کا آبائی گھر بکوا دیا، عبدالرحمٰن کی وفات کے بعد جب زبیدہ نے فون کیا تھا تو فون ریسیو کرنے والی خود سونیا تھی۔ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ خود کو ملازمہ ظاہر کیا اور غلط بیانی کی تھی کہ وہ لوگ مستقل امریکہ شفٹ ہو گئے ہیں۔ اس وقت بھی سونیا سب جانتی تھی لیکن اس نے خود کو انجان بنا دیا۔ اگر وہ زبیدہ کی بات سعد سے کروا دیتی تو یقیناً سعد شمع کو لے آتا۔ اگر شمع نہ مانتی تو وہ خود چلا جاتا ہر طرف سے سونیا کی ''میں'' ختم ہوئی تھی۔

وہ ''میں'' کو درمیان میں لے آئی اور سعد کو صرف اپنے قریب اور اپنے پاس رہنے دیا۔

سونیا اپنے پر خود غرضی بھرے فعل پر شرمندہ تھی لیکن اس میں ان افعال کو پوائنٹ آؤٹ کرنے کی ہمت بالکل بھی نہیں تھی۔ سانپ کی طرح بل کھاتا ایس اس نے خود شمع کو پہنانے کا ارادہ کیا تھا اور اس وقت اس نے شمع سے معافی بھی مانگی تھی اسے یقین تھا کہ شمع اسے معاف کر دے گی۔

ماریہ کی طرف سے بھی اب وہ پریشان نہیں تھی۔ ماریہ اور واصف میں طلاق ہو چکی تھی۔ شعیب کا بیٹا صائم اب بھی ماریہ کے لیے متمنی تھا۔ سونیا کو اب سعد کے بہن بھائی بھی لالچی محسوس نہیں ہوتے تھے۔ ان میں بھی وہی بات تھی سب جاننے کے باوجود بھی انجان بننا اور ''میں'' کو درمیان میں لانا لیکن اتنا تو اسے بھی پتا تھا کہ صائم ماریہ کو پسند کرتا ہے اور اب وہ ماریہ کے اچھے مستقبل کے لیے دعا گو تھی۔ سٹریٹجی کی بجائے دعا پر بھروسہ کرنا بھی اس نے اب سیکھا تھا۔ سونیا کے نزدیک اب اگر اس کی زندگی میں جو سب سے مشکل لمحہ آنا تھا وہ شمع سے اس کے سامنے کا لمحہ تھا اور اسے امید تھی کہ وہ اس مشکل لمحے سے بھی گزر جائے گی اور شمع اسے معاف کر دے گی لیکن شاید وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ مشکل لمحہ اب اس کی زندگی میں آنا ہی نہیں تھا۔

❁❁❁

شمع نے گلابی رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ وہی سوٹ جو اس نے فیصل کے ولیمے کے مختصر فنکشن میں بھی پہنا تھا۔ کوئل نے پر زور اصرار نما فرمائش کی تھی سو ہنستے ہوئے شمع نے وہ گلابی

سوٹ پہن لیا۔ ہلکے گلابی رنگ کے سوٹ کے اوپر تیز گلابی رنگ کی دھاریاں تھیں۔ سوٹ پر بنے ہوئے چھوٹے بڑے پھول بھی گلابی رنگ کے تھے۔ پہنتے ہوئے شمع کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ سعد کو گلابی رنگ بہت پسند تھا لیکن اس نے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

''ماشاءاللہ'' کوئل نے بے ساختہ کہا، پھر شمع کے بالوں میں خود کنگھی کی، آنکھوں میں کاجل بھی لگایا۔

''کوئل آج میری شادی ہو رہی کیا؟'' شمع نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ فیصل کی شادی کے بعد شمع اکثر و بیشتر ہنستی رہتی تھی۔

کوئل نے کوئی جواب نہ دیا، بس مسکرا دی۔ کھانے میں کوئل نے مرغ بھونا۔

''رات کو کھا لیجئے گا، فیصل نان بھی لایا ہے، ہاٹ پاٹ میں رکھے ہیں۔'' کوئل نے بتایا تھا۔

''تم کہیں جا رہی ہو کیا؟'' شمع نے حیرت سے پوچھا تھا۔ کوئل کی ہدایات سن کر شمع کو لگا تھا۔

''نہیں...... ہاں ہاں ابھی احسان بھائی کا فون آیا تھا ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں میں ہو آؤں؟''

''لو بھئی یہ پوچھنے والی بات ہے، اب تو سواری بھی اپنی ہے، فیصل جاؤ کوئل کو میکے کا چکر لگوا آؤ۔ اداس ہو رہی ہے کوئل۔''

''جی اچھا امی۔''

''کوئل بیٹا اگر تمہارا دل چاہے تو رات رہ لینا میکے، اللہ تمہارے والد محترم کو صحت عطا فرمائے۔ میری طرف سے بھی پوچھنا اور اگر واپس آنا ہو تو جلدی آ جانا، بادل بنے ہوئے ہیں خدا جانے کب بارش ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے امی۔'' کوئل نے کہا تھا۔ فیصل نے بائیک باہر نکالی تھی۔

''امی باہر کا تالا لگائے جا رہا ہوں، چابی بھی لیتا جا رہا ہوں، آپ نے کہیں جانا تو نہیں؟ یا کسی نے آنا تو نہیں؟'' فیصل نے پوچھا تھا۔

''نہیں، نا کسی نے آنا ہے اور نہ میں نے کسی کو ملنے جانا ہے۔ تم تالا لگا کر چابی لے جاؤ۔ ویسے ایک چابی میرے پاس ہے۔''

''مجھے دلہن بنا کر خود جا رہی ہو۔'' کوئل نے سلام کیا تو شمع نے کہا۔

''تبدیل مت کیجئے گا کپڑے، میں آ کر دیکھوں گی۔'' کوئل مسکرائی تھی۔

''ویسے آپ کے ابو نے ٹھیک نہیں کیا۔ ستائیس سال بہت عرصہ ہوتا ہے فیصل تم خود بھی

تو اٹھائیس سال کے ہو۔'' کوئل نے بائیک پر پیچھے بیٹھتے ہوئے کہا، بائیک کی سپیڈ کم تھی۔

''وہ تو ٹھیک ہے کوئل، انہوں نے بہت بُرا کیا لیکن اب وہ واپس آ گئے ہیں۔'' فیصل کا جواب سن کر مزید اس بارے میں کچھ نہ کہا۔

''کیا لازمی ہے کہ ہم ہوٹل میں رات گزاریں۔ ادھر ابو کا گھر بھی ہمارا گھر ہے، وہاں گزار لیتے ہیں۔'' کوئل نے تجویز دی تھی۔

''ہوٹل میں غلام محی الدین ہے۔ میرا چھوٹا بھائی، میں اس سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں بلکہ ایسے کرتا ہوں تم یہاں اپنے امی ابو کے گھر رہ جاؤ۔ وہاں تنگ نہ آ جاؤ کیا پتا غلام محی الدین تمہارا لحاظ کر کے مجھ سے اپنے اگلے پچھلے قصے نہ شیئر کر سکے۔ تمہیں اندازہ تو ہو گا کہ لڑکوں کے کس قدر الم ناک قصے ہوتے ہیں۔'' فیصل نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ کوئل نے مسکراتے ہوئے اثبات میں جواب دیا تھا۔

''تم نے کھانا تو تیار کر کے رکھا تھا نا۔'' کوئل کو میکے چھوڑتے ہوئے فیصل نے پوچھا تھا۔

''ہاں، ہاں اس کے علاوہ ہال کمرے میں شیشے کے دو گلاس بھی رکھے تھے۔ میں نے اور فریج میں پیپسی بھی پڑی ہے۔ ان شاء اللہ کسی چیز کی کمی نہیں ہو گی۔''

کوئل کو میکے چھوڑ کر فیصل جلدی جلدی ہوٹل پہنچا تھا۔ جہاں سعد اور غلام محی الدین ٹھہرے ہوئے تھے۔ سعد نے آف وائٹ کلر کی پینٹ، رائل بلیو کلر کی شرٹ کے ساتھ پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ڈریس کا انتخاب غلام محی الدین نے کیا تھا۔ ہوٹل کی انتظامیہ کی طرف سے کار میسر تھی لیکن پھر بھی سعد نے کہا کہ بائیک پر جائیں گے۔

فیصل نے غلام محی الدین کو بائیک کی چابی پکڑائی اور راستہ سمجھا دیا اور سعد غلام محی الدین کے ساتھ شمع کو ملنے چلا گیا۔ غلام محی الدین نے واپس آ جانا تھا سعد کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ ستائیس سال بعد اس نے شمع کو ملنا تھا۔

''کیسی ہو گی شمع؟ بوڑھی ہو گئی ہو گی؟'' دھڑکتے دل کے ساتھ سعد نے سوچا تھا۔

''شمع۔'' نام دھرایا تو من میں کھلبلی سی ہوئی تھی۔

''شمع سے کس طرح معافی مانگوں گا۔'' اس سوچ کا لائحہ عمل اس کے پاس نہیں تھا۔ ابھی وہ کچھ فاصلے پر تھے جب بوندا باندھی شروع ہوئی تھی تنگ گلی کے اس گھر تک پہنچنے تک موسلا دھار بارش شروع ہو چکی تھی۔

سعد نے محسوس کیا تھا کہ بہت کچھ تبدیل ہو گیا تھا اب کھلی نالیاں نہیں تھیں، گھروں کے باہر گلی ویسی ہی تنگ و تاریک تھی لیکن اب پکی اینٹوں کے ساتھ اس کی تعمیر کی گئی تھی۔ اکثر و

بیشتر گھر دو منزلہ بن چکے تھے۔ نہ بدلا تو یہ گھر جس کے سامنے وہ اس وقت کھڑے تھے۔ گہرے سبز رنگ کے لوہے کے مین گیٹ والے گھر کے سامنے۔

غلام محی الدین نے تالا کھولا تھا سوچا کہ کچھ دیر کے لیے ساتھ چلا جاؤں۔ شرابور ہوتے ہوئے وہ صحن پار کر کے برآمدے میں آئے۔ چھاجوں مینہ برس رہا تھا اور شمع برآمدے میں چارپائی پر بیٹھی بارش کی گرتی بوندوں کو دیکھ رہی تھی۔ حقیقت تو یہی تھی کہ وہ سعد کو ہی سوچ رہی تھی۔ ستائیس سال اور سعد، یہی دو اس کی سوچوں کا محور بنے ہوئے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

''فیصل آ گیا۔'' شمع نے سوچا تھا۔

''پتا نہیں کوئل ساتھ ہے یا نہیں۔ بارش بھی تو شدید قسم کی ہو رہی ہے۔'' شمع نے سوچا۔

گرمیوں کے دن تھے عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا جب شمع نے بارش میں شرابور ہوتے ہوئے سعد کو آتے دیکھا تھا۔ اسے لگا تھا کہ شاید دیکھنے میں غلطی ہو رہی ہے۔ دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔ آنے والا سعد ہی تھا۔ چند لمحوں میں وہ برآمدے میں تھا اور سعد کے پیچھے سعد سے ملتا جلتا چہرہ تھا۔ شمع کو اچھی طرح یاد تھا کہ کچھ سال پہلے فیصل نے جب اس لڑکے کو اپنا دوست کہہ کر اس سے ملوایا تھا تب بھی وہ چونکی تھی۔ مشابہت کی بنا پر لیکن فیصل نے اس کا من گھڑت حسبِ نسب بتایا تھا۔

شمع کھڑی ہو گئی۔

''السلام علیکم'' غلام محی الدین نے سلام کیا تھا۔

شمع نے جیسے سنا ہی نہیں۔ غلام محی الدین نے چند لمحے جواب کا انتظار کیا۔ نہ ملا تو اس کو اپنا منظر سے ہٹ جانا مناسب لگا۔ سو وہ چلا گیا اس کے جانے پر نہ سعد متوجہ ہوا وہ نہ ہی شمع۔ سعد بھیگا ہوا تھا۔ چہرے پر پانی پھسل رہا تھا۔ شمع سعد کو دیکھنے لگی۔ ستائیس سال بعد وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ بھیگتے ہوئے سعد نے ایک قدم بڑھایا تھا۔ شمع نے خود پر طاری جمود کی کیفیت کو توڑا تھا۔

''جی فرمایئے، کیوں آئے ہیں آپ؟'' آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ویسی ہی کپکپاہٹ جیسی پورے جسم پر طاری تھی۔

''بیٹھنے کا نہیں کہو گی۔'' سعد نے چہرے پر سے پانی پونچھا تھا۔

''کس قدر بوڑھی ہو گئی ہے شمع۔'' سعد کے ذہن میں خیال آیا تھا۔

''نہیں۔'' شمع کا لہجہ دوٹوک تھا۔

''آپ جا سکتے ہیں۔'' شمع نے رخ موڑا تھا۔ دو آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر بہے تھے۔

''شمع مجھے معاف کر دو۔'' سعد کو کچھ اور نہ سوجھا تو معافی مانگ لی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح بات آگے بڑھائے۔

شمع نے سامنے دیکھا، برآمدے کی دیوار پر سالہا سال سے لگے چوکور فریم والے شیشے میں اپنا عکس نظر آیا۔

جھریوں بھرا چہرہ تھا۔

ہونٹوں کے کونوں پر لکیریں، آنکھوں کے کناروں پر ڈھلکتی جلد۔ گال بھی لٹک چکے تھے اور بال...... تھے تو سفید لیکن انہیں مہندی سے رنگا ہوا تھا۔

''شمع معاف کر دو مجھے۔'' سعد نے ایک بار پھر کہا۔

''معاف کر دو۔'' شمع کو مفہوم سمجھنے میں تھوڑا وقت لگا۔ اپنے عکس پر جمی ہوئی نظروں کا زاویہ اس نے تبدیل کیا اور تھوڑی گردن موڑ کر بولی تھی۔

''معاف کیا۔'' بالکل بے تاثر لہجہ تھا۔

یہ کہہ کر شمع رکی نہیں چھوٹے چھوٹے قدم بھرتی، ہال کمرے میں چلی گئی اور بارش کے پانی میں شرابور سعد وہیں کھڑا رہا۔ کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ نرم و نازک گدوں پر بیٹھنے والے کو چارپائی کا بان کافی کھردرا محسوس ہوا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

بجلی بڑے زوروں کی کڑکی اور بارش کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ عصر مغرب میں ڈھل رہی تھی۔ تھوڑی دیر چارپائی پر خالی ذہن بیٹھنے کے بعد سعد بھی اندر ہال کمرے میں چلا گیا۔

کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔

سعد کو شمع سامنے چارپائی پر سپاٹ تاثرات لیے بیٹھی نظر آئی۔ اس نے سوئچ بورڈ کی تلاش میں نگاہ دوڑائی اور کمرے میں موجود ٹیوب لائٹ جلالی۔

سُست قدموں سے چلتا ہوا وہ شمع کے قریب آیا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ہر ہر انداز میں شرمندگی تھی۔

''چائے پینے کا موسم ہے، شمع چائے نہیں پلاؤ گی۔'' سعد کو امید تھی کہ شمع انکار کر دے گی لیکن جو کچھ ہوا اگر سعد کو ایسا ہونے کا تھوڑا سا بھی شک ہوتا تو وہ کبھی چائے کا نام نہ لیتا۔

خالی نظروں سے دیوار کو دیکھتی شمع نے نظریں سعد پر ٹکائی تھیں۔ اس کی نظروں میں کچھ ایسا تھا کہ سعد خود بخود نظریں چرا گیا۔

''میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں تم چائے نہیں پیتے، چائے کو چھوڑے ہوئے تمہیں سال

ہا سال ہو چکے ہیں، تم کافی پسند کرتے ہو اور کافی پیتے ہو۔'' شمع نے پوچھا نہیں تھا بلکہ بتایا تھا اور وہ صحیح بتا رہی تھی۔

''میں چائے بھی پی لیتا ہوں۔'' وہ ایک بار پھر نظریں چرانے پر مجبور ہو گیا۔

''میرے گھر میں کافی نہیں ہوتی۔'' شمع کا لہجہ الفاظ سے زیادہ کٹھور تھا۔ سعد بس سر جھکا کر رہ گیا۔ پھر کافی دیر خاموشی چھائی رہی۔

''شمع معاف کر دو مجھے۔'' سعد نے ایک بار پھر معافی مانگی تھی۔

''آپ کو سنائی کم دیتا ہے، میں آپ کو معاف کر چکی ہوں۔''

''تو پھر مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں؟''

اب کے بار شمع کچھ نہ بولی۔

''معاف کرو نا۔''

''معاف کر چکی ہوں۔ قیامت والے دن آپ سے کوئی حساب نہیں لوں گی۔ خدا سے کوئی شکایت نہیں کروں گی۔ کچھ بھی نہیں۔'' شمع کا لہجہ تیکھا تھا۔

سعد ایک بار پھر کچھ نہ بول سکا۔

''تم نے خود ہی مجھ سے قسم اٹھوائی تھی کہ میں اس وقت تک نہ آؤں جب تک تم مجھے نہیں بلاؤ گی۔''

شمع استہزائیہ انداز میں ہنس پڑی۔ ''میں نے تو اب بھی نہیں بلایا۔''

''لیکن......'' سعد کو بولنے کے لیے الفاظ ڈھونڈنے پڑ رہے تھے۔

''مجھ سے غلطی ہو گئی شمع۔''

''اب تو ہو چکی ہے۔'' شمع نے بے تاثر لہجے میں کہا تھا۔

''بلکہ کہاں...... آپ سے غلطی کہاں ہوئی، قسم تو میں نے دلوائی تھی نا آپ کی کوئی غلطی نہیں۔''

سعد کا سر جھک گیا۔ کچھ لمحے خاموشی میں گزرے تھے۔

''شمع میں نے سونیا سے شادی صرف تمہاری خواہشات کو پورا کرنے کے لیے کی تھی۔'' سعد رک رک کر بولا تھا۔

''میں نے آپ سے کوئی تفصیل پوچھی ہے، آپ میرے گھر سے جا سکتے ہیں۔'' شمع نے لفظ ''میرے'' پر زور دیا تھا۔

''لیکن شمع میری بات تو سنو......''

''جا سکتے ہیں۔'' شمع نے بات کاٹی۔

''شمع۔'' سعد کی آنکھیں دھندلائی تھیں۔ آنکھوں میں خود بخود آنسو آ گئے تھے۔

شمع نے ایک نظر سعد پر ڈالی تھی اور ایک نظر کمرے سے باہر صحن میں۔ جہاں اندھیرا پھیل رہا تھا لیکن بارش نہیں رکی تھی۔ مسلسل برسے جا رہی تھی۔

''سعد تمہارا تجزیہ کمزور ہے شاید۔ میں مان لیتی ہوں کہ تم نے شادی میرے لیے کی تھی کہ مجھے پیسے ملیں گے لیکن سعد جب پیسہ خود تمہارے پاس آیا تو تم نے پیسے کو مجھ پر ترجیح دی......''

''تم بھی غلط نہیں تھے سعد۔ ہر انسان کو اپنے آپ سے محبت ہوتی ہے۔ تمہیں مجھ سے بھی محبت تھی اور اپنے آپ سے بھی۔ تم نے میرے لیے پیسے حاصل کرنے چاہے۔ حاصل کر لیے تو میں نے لینے سے انکار کر دیا تو تم نے اپنے پاس رہنے دیے اور بات یہاں تک آ گئی کہ تم نے پیسے اور عیش و عشرت کو پاس رکھ لیا اور مجھے چھوڑ دیا لیکن سعد تمہیں میرا تھوڑا سا بھی خیال نہیں آیا تھا۔'' سعد کے رونے میں شدت آ گئی۔ وہ بلک بلک کر رونے لگ گیا۔

''جہاں تک قسم کی بات ہے تو سعد تم اتنے نیک، پاکباز، پرہیزگار اور متقی نہیں تھے کہ ایک قسم نہیں توڑ سکتے تھے۔ ایسی چیزوں کو چھوڑ دینے کی اجازت ہے جو وبال جان بن جائیں۔ میں نے قسم دلوائی بھی اسی لیے تھی کہ اب اگر تم میرے پاس آؤ تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آؤ لیکن دل نے تمہیں مجبور کیا ہی نہیں اور ستائیس سال گزر گئے۔''

شمع سعد کو دیکھے جا رہی تھی اور سعد شدت سے روئے جا رہا تھا۔

''روتے رہو سعد، تم روتے ہوئے تو مجھے اچھے ستائیس سال پہلے بھی نہیں لگتے تھے اور نہ اب لگ رہے ہو اور میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے اچھے نہ لگو۔ ہاں میرا دل چاہتا ہے کہ تم مجھے اچھے نہ لگو۔'' سعد کے آنسو اور تیز سے بہنے لگے۔ اب تو وہ ہچکیاں لے کر رو رہا تھا۔

''ابو چل بسے، میرا سہارا ختم ہو گیا۔ امی چلی گئیں، پوری دنیا میں میرا فیصل کے علاوہ کوئی نہ رہا، کوئی بھی نہیں۔ میں آدھی آدھی رات تک کروٹ بدلتی رہتی تھی۔ تمہارا انتظار کرتی رہتی تھی لیکن تم نہ آئے۔ خط بھیجا تھا کہ شاید یاد آ جاؤں لیکن تمہارا تو پتا بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ تمہیں کبھی فیصل کا خیال بھی نہیں آیا؟'' شمع پوچھ رہی تھی۔

''آتا تھا''

''جھوٹ مت بولو، جو لڑکا تمہارے ساتھ آیا تھا وہ تمہارا بیٹا تھا نا؟''

سعد نے سر ہلا دیا۔

''اور کتنے بچے ہیں؟'' شمع کا چہرہ کرخت سے کرخت تر ہوتا جا رہا تھا۔

''ایک بیٹی ہے۔'' سعد نے بتایا تھا۔

''آہ، مجھے بیٹی کی کتنی تمنا تھی۔'' شمع نے سوچا تھا۔

''سعد تمہیں تو کبھی فیصل کی یاد نہیں آئی۔ بچے تو تمہارے پاس تھے۔ تم میرے پاس آ سکتے تھے، فیصل سے ملنے کے بہانے لیکن تم نہیں آئے، تمہیں خیال ہی نہ آیا۔''

''مجھے معاف کر دو غلطی ہوئی مجھ سے۔'' سعد نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ لیے۔

سعد کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر شمع کو ایسے لگا تھا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔ آگے بڑھ کر اس نے سعد کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو علیحدہ کیا۔

''میں نے کہا ہے نا کہ میں نے آپ کو دل و جان سے معاف کر دیا ہے۔ قیامت کے دن میں خدا سے کوئی شکوہ نہیں کروں گی۔'' شمع نے پھر سے وہی بات کی تھی جو وہ پہلے بھی دہرا چکی تھی۔ سعد نے شکستہ نظروں سے شمع کو دیکھا تھا۔

چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔

پھر سعد آگے بڑھا تھا۔ شمع کو بانہوں میں لینے کے لیے۔ مگر شمع بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔

''نہیں سعد، اب نہیں ستائیس سال یاد نہیں آیا تو اب بھی ضرورت نہیں۔''

شمع نے سعد کا ہاتھ جھٹکا۔ دوبارہ سعد میں ہمت نہیں ہوئی۔ شکست خوردہ انداز میں وہ ایک بار پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میں انسان تھی سعد، میرے کچھ فطری تقاضے تھے لیکن تم نے میرے بارے میں کچھ بھی نہ سوچا۔ اپنے آپ سے محبت اتنی بڑھی کہ عیش و عشرت نے مڑ کر دیکھنے بھی نہیں دیا کہ ایک شمع بھی ہے۔'' شمع بھی اب رونے لگی تھی۔ بات ہی رونے والی تھی۔

''سونیا کہاں ہے؟ زندہ ہے نا؟؟'' شمع نے پوچھا تھا۔

سعد نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''شکر ہے زندہ ہے، اگر اس کے مرنے کے بعد آتے تو شاید......'' شمع نے بات آدھی چھوڑ دی تھی ساتھ ساتھ رو بھی رہی تھی۔

''شمع میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' سعد کی دونوں آنکھوں میں ایک بار پھر ایک ساتھ آنسو آئے تھے۔

''میں مانتی ہوں۔'' شمع نے اپنے آنسو پونچھے تھے۔

''میں مانتی ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے لیکن سعد یہ محبت تمہاری اپنی ذات کے سامنے پیسوں اور عیش و عشرت کے سامنے ہیچ گئی۔ کہیں کونے کھدرے میں جا چھپی۔ تبھی

تمہیں ستائیس سال میرا خیال بھی نہیں آیا۔ ستائیس سال بہت عرصہ ہوتا ہے۔ مجھے اب دکھائی بھی کم دیتا ہے۔ جلدی تھک جاتی ہوں۔ ستائیس سال گزر گئے ہیں۔'' شمع پھر سے رونے لگ گئی تھی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ روتے رہے تھے۔

''فیصل میرا بیٹا ہے، میں نے اسے ڈاکٹر بنایا ہے، مجھے اس پر فخر ہے، سلائی اور کڑھائی کر کر کے میں نے اسے پڑھایا ہے، تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ تمہیں پتا چل جائے کہ میں تہی داماں نہیں ہوں۔''

''شمع، میرا تمہارا مقابلہ نہیں...... مجھے معاف کر دو۔''

''مقابلہ......مقابلہ کرنے کی تم صلاحیت ہی نہیں، اور معاف میں کر چکی ہوں۔''

''تو پھر مجھے قبول بھی کر لو۔''

''نہیں۔'' شمع نے فوراً سے بیشتر کہا تھا۔

''آخرت میں تو میں تم سے کوئی حساب کتاب نہیں لوں گی لیکن اس دنیا میں اب تم ہمیشہ سونیا کے ساتھ رہنا۔'' شمع نے آنسو پونچھے تھے۔ وہ اب سعد کے سامنے نہیں رونا چاہتی تھی۔

''کھانا کھاؤ گے؟ میری بہو مرغا بھون کر گئی ہے۔ سارے لوگوں نے مل کر منصوبہ بنایا ہے، دیکھو مجھے تمہاری پسند کے رنگ کا سوٹ پہنایا ہے۔ گھر اکیلا کر دیا ہمارے لیے......وہ یہ سب کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اکیلے ستائیس سال جو نہیں گزارے۔''

''کھانا کھانا ہو تو کچن میں سے کھا لینا اور کمرے سے چلے جاؤ۔ بلکہ گھر سے بھی نکل جاؤ۔'' شمع کے لہجے میں کوئی لچک نہیں تھی۔

سعد کو سمجھ نہیں آیا کہ کیا کرے۔ ''تم گھر سے جاتے ہو یا میں جاؤں۔'' دوٹوک لہجہ تھا۔

سعد نے دروازے سے باہر دیکھا۔ باہر بارش پورے زور وشور سے ہو رہی تھی۔ پتا نہیں بادلوں کے پاس اتنا پانی کہاں سے آیا تھا۔ اندھیرا ابھی پوری طرح پھیل چکا تھا۔

''شمع میں نے کھانا کھانا ہے۔'' سعد نے التجا کی تھی۔

''کچن میں سے لے کر کھا لو۔''

''تم لے آؤ۔''

''نہیں میں نہیں لا سکتی۔''

''آخری بات، شمع بس میری آخری بات مان لو، آئندہ کبھی کچھ نہیں کہوں گا۔'' سعد منت کر رہا تھا۔

شمع سعد کو دیکھ کر رہ گئی۔

''آخری مرتبہ کوئی بات مان لو۔'' سعد نے ایک بار پھر التجا کی۔ شمع کچھ دیر بیٹھی رہی، پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ٹھیک ہے، آئندہ کبھی مجھے ملنے بھی مت آنا۔''

شمع نے ابھی دو چار قدم ہی بڑھائے تھے کہ لائٹ چلی گئی۔ ہر طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔ بارش کے پانی گرنے کی آواز اور بھی تیز ہو گئی۔

سعد نے اپنی پینٹ کی جیب سے فون نکالا تھا۔ سیل فون کی روشنی نے گھپ اندھیرے کو تھوڑا سا چیرا تھا۔

''ایمرجنسی لائٹ خراب ہے، میں موم بتی لے آئی ہوں۔''

''یہ فون لیتی جاؤ۔ اندھیرے میں کیسے جاؤ گی۔'' سعد نے کہا تھا۔ شمع رک گئی تھی۔

''سیٹھ صاحب عنایت کا شکریہ۔ میں اس اندھیرے کی عادی ہوں۔'' شمع نے تیکھے انداز میں کہا تھا اور ٹٹولتی ہوئی اندازے کے ساتھ باہر چلی گئی۔ سعد ہاتھ میں لیے فون کو دیکھتا رہ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو بے حد بے بس محسوس کیا تھا۔ شمع نے آنے میں تھوڑی دیر لگا دی پھر ایک ہاتھ میں شمع لیے اور دوسرے ہاتھ میں ہاٹ پاٹ لیے اندر آئی۔

اندر آ کر ہاٹ پاٹ اس نے چارپائی پر رکھا۔ تھوڑے فاصلے پر پڑے سٹول کو، جس پر کوئل ٹرے میں شیشے کے تین گلاس رکھ کر گئی تھی، کھینچ کر اس پر شمع رکھ دی۔ جلتی ہوئی شمع کمرے کا اندھیرا کم کر رہی تھی۔

شمع پانی کی ایک بوتل بھی لے آئی۔ پانی کی بوتل کو بھی اس نے شیشے کے گلاسوں کے قریب سٹول پر رکھا تھا۔

''ادھر چارپائی پر جا بیٹھو اور کھانا کھا لو۔'' شمع نے کہا تھا سعد سست روی سے اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور شمع اس کی جگہ کرسی پر آن بیٹھی۔

''تم بھی ساتھ کھاؤ۔'' سعد کا لہجہ دھیما تھا۔

''نہیں۔''

''پلیز۔''

''نہیں میرے حلق سے کچھ نہیں اترنا، میں جانتی ہوں اچھی طرح۔'' شمع نے تڑخ کر کہا تھا۔ سعد پھر سے اصرار نہیں کر سکا۔

''چلو ادھر چارپائی پر سامنے تو آ بیٹھو۔''

شمع نے گہری نظروں سے سعد کو دیکھا اور چپ چاپ اٹھ کر سعد کے سامنے چارپائی پر

ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔

ہاٹ پاٹ کا ڈھکن اتارا۔شمع ابھی سالن گرم کر کے آئی تھی۔ پلیٹ میں موجود سالن سے بھاپ اڑ رہا تھا۔

کھایا تو سعد سے بھی نہیں جاتا تھا لیکن وہ شمع کے ساتھ بیٹھنا چاہتا تھا۔اسے منانا چاہتا تھا۔

''کینڈل لائٹ ڈنر۔'' سعد نے مسکرا کر کہا تھا۔شمع نے کوئی جواب نہ دیا۔

''بہت اچھا کھانا ہے۔'' سعد نے منہ میں رکھا نوالہ نگلا اور مسکرانے لگا۔

''کھانے کی میز پر لگے پانچ چھ کھانوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔'' شمع کچھ تو جواب ایسے دیتی اور کچھ انداز ایسا ہوتا کہ سعد کے پاس بولنے کے لیے کچھ بھی نہیں بچتا تھا۔

''ایسا نہیں ہے، یہ کھانا واقعی بہت اچھا ہے، بہو کے ہاتھوں میں تو بہت ذائقہ ہے۔'' سعد نے ہمت کر کے کہا تھا۔

شمع جواباً کچھ نہ بولی۔اس کا جواب دینے کو دل نہیں کیا۔

''قبول کرلو، مجھے۔'' سعد نے دوسرا نوالہ منہ میں رکھا تھا۔

''جلدی جلدی کھانا کھا کر چلے جاؤ۔میری مغرب کی نماز بھی قضا ہوگئی ہے۔''

سعد نے دوسرا نوالا بھی چبائے بغیر نگل لیا۔

سٹول پر پڑی شمع پگھلتی جارہی تھی۔سعد سے نگلنا بھی مشکل تھا۔کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا حالانکہ منزل سامنے تھی۔

''شمع.....''

''میں نے مزید کچھ نہیں سننا، کھانا کھا کر چلے جاؤ، میں تمہیں معاف کر دیا ہے۔بس زیادہ کی امید مت رکھو۔تم میرے حال سے واقف تھے۔واقف حال ہونے کے باوجود تم نے ستائیس سال آنکھیں بند رکھیں۔صرف اپنے بارے میں سوچا۔اب مجھے بھی اپنے بارے میں سوچنے دو۔کھانا کھالیا؟''

''نہیں کھایا جارہا۔'' تھوڑے توقف سے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے، برتن اٹھالوں؟''

''اٹھالو۔''

شمع نے برتن اٹھائے اور کچن میں رکھ آئی۔اندھیرے کے باوجود اسے اپنے گھر کے ایک ایک حصے کا خوب پتا تھا۔

''سعد ابھی تک تم بیٹھے ہو!''

''میں نے اپنی شمع کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا۔'' سعد مچلا۔شمع کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔

''اپنی شمع۔'' شمع نے قہقہہ لگایا اور بجلی بڑے زور کی کڑکی تھی۔

شمع قریب آکر بولی۔''پانی پیو گے؟''

سعد نے نفی میں سر ہلا دیا۔

شمع نے شیشے کے ایک گلاس میں پانی بھرا اور غٹ غٹ پینے لگی۔گلاس خالی کر لینے کے بعد شمع نے ایک نظر سعد پر ڈالی تھی۔سعد اسے ہی دیکھ رہا تھا۔شمع نے گلاس زمین پر دے مارا۔چھناکے کی آواز آئی تھی۔اس سے پہلے سعد کچھ سوچتا۔شمع نے جھک کر ٹوٹے ہوئے گلاس کے کانچ کا ایک بڑا سا ٹکڑا اٹھایا اور اس کے گرد مٹھی بھینچ لی۔لمحوں میں بند مٹھی سے خون نکلنے لگ گیا تھا۔

''شمع۔'' سعد چلاتے ہوئے اٹھا اور آگے بڑھا۔

''اپنی جگہ سے مت ہٹو، ورنہ میں گرفت اور بھی مضبوط کرلوں گی، ہلنا نہیں۔'' شمع نے ایک قدم پیچھے کو اٹھایا تھا۔

''شمع...... پاگل ہو، یہ کیا کر رہی ہو۔'' سعد بوکھلا گیا۔اس نے اپنی پینٹ کی جیب سے رومال نکالا۔

''کسی چیز کی ضرورت نہیں، رومال کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور جلدی باہر نکل جاؤ۔'' شمع کا لہجہ حد سے زیادہ کرخت تھا۔

''شمع لیکن...... یہ تم......''

''کچھ نہیں سننا، جاتے ہو یا...... آہ......'' منہ سے کراہ نکلی۔

''جاتا ہوں...... جاتا ہوں۔'' سعد کی آنکھوں سے آنسو نکلے تھے۔وہ جلدی جلدی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''اسے تو پھینکو۔'' دروازے پر پہنچ کر سعد نے کہا۔

''تم جاؤ۔'' شمع چیخی۔

سعد روتا ہوا باہر آیا۔اس کا دل دیوار سے ٹکریں مارنے کو چاہا۔روتے ہوئے دیوار سے لگا اور بیٹھتا چلا گیا تھا۔جہاں وہ بیٹھا تھا اس کے اوپر ہال کمرے کی جیل جیسی سلاخوں والی کھڑکی تھی۔جس کے سامنے بیٹھ کر شمع کبھی قیدی لگا کرتی تھی۔شمع نے شیشے کا ٹکڑا گرا دیا۔ہاتھ خون سے تر تھا۔فرش پر بھی بہت سا خون گرا ہوا تھا۔باہر بارش اسی روانی سے جارہی

تھی۔ شمع کو پتا تھا کہ سعد باہر، برآمدے میں بیٹھا ہے۔ اس سے زیادہ وہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور تھکے تھکے قدموں سے چارپائی تک آئی۔ ہاتھ کو دیکھا۔

اس میں سے خون رِسنا کم ہو چکا۔ پھر وہ رونے لگ گئی۔ شدت کے ساتھ۔ کافی دیر روتی رہی، روتے ہوئے اس کی نظر سامنے سٹول پر پڑی جس پر رکھی موم کی شمع جل رہی تھی۔ روتے ہی شمع نے موم کی شمع کو ہاتھ مارا۔ ادھر موم کی شمع گر کر بجھی اور کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔

❁❁❁

پتا نہیں رات کے کس پہر سعد کی آنکھ لگی۔ وہ کھڑکی کے نیچے بیٹھا روتے روتے سو گیا تھا۔ اب آنکھ کھلی تو صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ہال کمرے کا گہرے سبز رنگ کا دروازہ بند تھا۔ وہ دروازہ کھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا کافی دیر تک گہرے سبز رنگ کے دروازے کے سامنے کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر اندر داخل ہوا۔

سعد دھڑکتے دل کے ساتھ شمع کے قریب گیا۔ اسے احساس نہیں ہوا کہ موم کی شمع اس کے پاؤں کے نیچے آ کر بُری طرح مسلی گئی تھی۔

چارپائی کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا شمع کی آنکھیں کھلی تھیں اور پتلیاں ساکت تھیں۔

''شمع۔'' اس نے پہلے شمع کو ہاتھ لگایا پھر جھنجھوڑا مگر کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے دل کی دھڑکن محسوس کرنا چاہی تو دل بھی خاموش ہو چکا تھا۔

''شمع۔'' سعد کی چیخ دور دور تک پھیل گئی۔ وہ دھاڑیں مار کر روئے جا رہا تھا۔ روتے ہوئے اس کی نظر شمع کے دائیں ہاتھ پر پڑی۔ دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی میں برسوں پرانی مور پنکھ کے ڈیزائن سے مشابہ انگوٹھی موجود تھی۔

آنکھیں کھلی ہوں، جھنجھوڑنے پر کوئی حرکت نہ ہو، دل کی دھڑکنیں بھی بند ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ بندہ مر چکا ہے..... ''اور شمع مر چکی تھی۔''

❁...... ختم شد...... ❁